کائناتِ دل

منور لکھنوی

گو نہیں والد مگر ہے ماں کا سایہ برقرار — اے منوّرؔ یہ بھی میری خوبیِ تقدیر ہے

بشیشور پرشاد منوّرؔ لکھنوی

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

اوم

کائناتِ دل

یعنی

منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی خلف ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد افق آنجہانی

کے

منظومات

مطبوعہ کارونیشن پرنٹنگ پریس دہلی

پبلشر رادھکا پرشاد سکسینہ ململی خانہ دہلی ۱۹۳۹ء

پہلی بار

علاوہ محصول ڈاک

تعلّقات

دامانِ تمنّاست چو نیساں خوش آب

از بامِ اُفق نزول کردم چو سحاب

روشن صدراست سیرِ انوارِ نظر

خورشیدِ منوّرم دمید از مہتاب

میری ماں

آپ کے احسانوں کا بوجھ میرے سر سے کبھی نہیں اُتر سکتا۔ آپ کا رِن چُکانا میرے بس کی بات نہیں۔ آپ نے مجھے جنم دیا۔ پالا پوسا لکھایا پڑھایا اور پروان چڑھایا۔ بیکنٹھ ماں کے پاؤں کے تلے ہوتا ہے آپ کے قدموں کی برکت سے مجھے بیکنٹھ کا سُکھ جیتے جی حاصل ہے۔

کائناتِ دل آپ کی خدمت میں پیش ہے، آپ اسے اپنا لیجئے۔ اس سے پہلے آپ کی دُعا سے **بھگوت گیتا** کا منظوم ترجمہ ملک میں مقبول ہو چکا ہے ہر ایک بڑے چھوٹے نے اسے ہر پہلو سے سراہا ہے میرا دل بڑھایا ہے، اُمید ہے کہ آپ کی دُعا سے "کائناتِ دل" بھی ہر پہلو سے کامیاب ثابت ہوگی۔

"بھگوت گیتا" کو اپنے بڑے باپ کے بڑے نام پر معنون کرنے کے بعد "کائناتِ دل" کو آپ کے سوا اور کسے بھینٹ کر سکتا ہوں۔

آپ کا خدمت گذار

بشیشور پرشاد مُنوّر

قطعۂ تاریخ

نوازش ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائلؔ دہلوی مدظلہ

فکرِ پُر لطفِ مُنّور دیکھ کر دل شاد ہے
کیوں نہ سائلؔ اس کو تم حُسنِ صفاتِ دل کہو

دل کی خوبی کا علاقہ فکر کی خوبی سے ہے
فکر کو پھر بے تکلّف وارداتِ دل کہو

فکر کو دست و گریباں دل سے کہتا ہے جہاں
فکر کی جا فکر کو پھر تم نکاتِ دل کہو

فکر کا گو رابطہ شعر و سخن سے ہے تو پھر
ہر سخن ہر شعر کو واجب زکوٰۃِ دل کہو

اس شغف کے نام کو پوچھو تو میری رائے ہے
یہ مناسب ہے کہ عینِ التفاتِ دل کہو

اس پہ جو مرتے ہیں دل سے کہتے ہیں وہ دلنواز
میں یہ کہتا ہوں اُسے وجہ حیاتِ دل کہو

پوجتے ہیں جس سخن کو عاشقانِ حُسنِ فکر
کیوں نہ پھر ایسے سخن کو سومناتِ دل کہو

جو نہ اصنافِ سخن میں ٹھوکریں کھائے کہیں
اُس کے سیلِ طبع کو موجِ فراتِ دل کہو

پوچھے گر سمبت بکرمی اس اشاعت کا کوئی
کو کبِ علم ارمغانِ کائناتِ دل کہو

۱۹ سمبت ۹۶

مرے کلام سے خونِ جگر ٹپکتا ہی　　قبول عام کی پھر بھی سند نہیں ملتی

منوّر لکھنوی

کائناتِ دل کے لئے کرم فرمایانِ منوّر کی دُعائیں

تاباں چو مہر باد بہ عرشِ سخنوری
ایں کائناتِ دل کہ ز فکرِ منوّر است
عطیۂ رائے سدھ ناتھ بلی فراقی دریابادی

سب کریں اس سے کچھ ایسا التفات
کائناتِ دل ہو دل کی کائنات
عطیۂ ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی

دُعا بھی آرزو بھی ہے یہی پئے حیاتِ دل
کہ کائناتِ دل بنے کتاب کائناتِ دل
عطیۂ حضرت اقبال ورما سحر ہنگامی

گلہائے مضامیں کی فراوانی ہے
گلدستہ کی جو نظم ہے لاثانی ہے

ساحر اعجاز ہے مُنوّر کا کلام
یہ حُسن کی کائنات لافانی ہے
عطیۂ فخر روزگار پنڈت امرناتھ صاحب ساحر دہلوی

تاریخ

افتخارِ نظر و نورِ مجلّائے افق
ضوفشاں است منوّر بجہاں مثلِ شفق

نظمِ او عقدِ ثریات بناتِ النعش است
رشکِ والمہر مراز از ورق بعد ورق
۱۹۳۹ء عطیۂ پنڈت تربھون ناتھ صاحب زار دہلوی

دولتِ سوز و ساز ہے حاصلِ وارداتِ دل
میری نظر سے پوچھئے قیمتِ کائناتِ دل
عطیۂ علامہ ندرت میرٹھی

کائناتِ دل ہو بیرنگِ جمال
ہے مُنوّر اس سے دنیائے خیال
عطیۂ منشی چندربھان کیفی دہلوی

رہے شمیمِ گُلِ کائناتِ دل تا حشر
کہ تازہ پھول ہے یہ گلشنِ منوّر کا
عطیۂ حضرت جذب عالم پوری

کائناتِ دل

(منور نواز حضرت شام موہن لال صاحب جگر بریلوی بی اے کی نظر میں)

شاعری ہے عطیۂ فطرت — اور شاعر ہے ایک پیغمبر
روح کو جس سے ہو نشاط نصیب — جس سے پائے سکوں دلِ مضطر
جس سے حاصل کرے شعور دماغ — حکمت و نور جس سے پائے نظر
جس سے تہذیب کا ہو روشن نام — جس سے ہو کچھ بلند شانِ بشر
جو ہو جذبات کا مرقع ایک — اور حقائق کا ایک ہو دفتر
لاکھ ناپید ہے کلام ایسا — پھر بھی موجود ہیں سخن گستر
سامنے کائناتِ دل ہے آج — یا کھلا ہے ادب کا اک دفتر
کھنچ کے آئی ہے اسمیں روحِ سخن — آئینہ شاعری کے ہیں جوہر
ہے عجب کیف روح کو حاصل — دل ہے مسرور، کامیاب نظر
ہے دعا یہ خدائے برتر سے — ہے وہی مالک قضا و قدر

ہر جگہ کائناتِ دل ہو عزیز
اس کا چرچا ہوا کرے گھر گھر

(نادر الشعراء منشی چندی پرشاد صاحب شیدا دہلوی کا ارشاد)

وہ رنگیں سخنور عزیزم منور — ہر اک نظم جس کی ہے اعلیٰ و برتر
دکھائے ہیں جلوے نئے شاعری میں — ہے صد بیت دلکش ہر اک مصرعِ تر
مضامیں نئے اور بندش نئی ہے — نئے جن میں الفاظ شستہ شُستہ و بہتر
خیالات پاکیزہ رفعت نشاں ہیں — زمیں شعر کی جن سے پہونچی فلک پر
لطافت کے ہر سمت جاری ہیں چشمے — فصاحت کا گویا بھرا ہے سمندر
کہیں رازِ دنیا کہیں رمزِ عرفاں — بجا ہے جو باغِ ارم ہو نچھاور
جو مذہب کی کلکِ سخنور چلی ہے — ہر اک سمت نقشہ کھنچا نور پیکر
ہیں اخلاق و تہذیب کی جن میں شانیں — دکھایا ہے مشرق کو مغرب سے بڑھ کر
وہ نظمیں لی شائعت پذیر اب ہوئی ہیں — دعا ہے کہ مقبولِ دنیا ہوں یکسر
اٹھایا کرے فیض ان سے زمانہ — جہاں کو دکھائیں نیا اپنا جوہر

دعا ہے تہِ دل سے اپنی یہ شیدا
ہمیشہ رہیں شاد و خرم منور

حرفِ محکم

از

علامہ عصر پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی بی اے دہلوی

جو لوگ اس زمانہ میں اُردو کی تصنیف و تالیف سے عملی دلچسپی رکھتے ہیں، خاصکر نظم سے- وہ بہت گھاٹے میں رہتے ہیں۔ وجہ یہ کہ آجکل ہمارے ہاں مشرقی مذاق اور مغربی مذاق دونوں حاوی ہیں- یا زیادہ صحت کے ساتھ یہ کہئے کہ لوگوں کا ایسا گمان ہے۔ یہ تو یہ، مشرقی مذاق والے تو بات بات پر مخالفت قیاس لغوی، تعقید اور تنافر لئے بیٹھے ہیں- ان کے ہتھیار ہیں ثقات کا تذکرہ اور فصاحت کی کسوٹی۔ مغربی مذاق والے ورڈز ورتھ اور کالرج، ٹنی سن اور شیلے کی شاعری کی ترازو لئے کھڑے ہیں، اور طمنچہ دکھا کر کہتے ہیں کہ یہ ہے ادب کا کسٹم آفس- اس کی فہرست کے خلاف جو مال ہے اور جو جنس اس ترازو میں پوری نہ اُترے وہ سمندر بُرد کر دی جائے گی۔

اب فرمائیے کوئی کرے تو کیا کرے، نہ ہندوستانی فرنگی بن سکتا ہے، نہ اُردو انگریزی- مگر خوش نصیب خدا کے بندے ایسے بھی ہیں جو اس ہفت خواں سے بچ نکلتے ہیں- عزیز منشی بشیشور پرشاد مُنوّر لکھنوی کا نام اس سلسلہ میں امتیاز رکھتا ہے جن کا مجموعۂ کلام کائنات دل اس وقت میرے سامنے ہے۔

آجکل مغربی ادب کی دو اصطلاحیں کے ترجمے نقّادوں کے ورد زباں ہیں یعنی داخلی اور خارجی، یہ دونوں رنگ "کائنات دل" میں ایک سہانے انداز سے ممزوج اور شیر و شکر پائے جاتے ہیں جسے داخلی خارجیت کہئے مطلب یہ کہ سامنے کے موضوعوں پر طبیعت کی آمد اور حسن تخیل کا وہ رنگ دیتے ہیں جسے مشاہدہ آرا کہنا بجا ہے، مثال کے لئے ایک کھدّر کو لیجئے جس نے تقریباً ہر شخص کو لپیٹا ہوا ہے- اسی خارجی موضوع پر لکھتے ہوئے کہتے ہیں ؎

تلوار یہی اپنی یہی اپنی سپر ہے ہتھیار رہو یہ پاس تو کس بات کا ڈر ہے

تخیل کو واقعیت سے دست و گریباں کر کے کتنا سہانا داخلی خارجیت کا رنگ نکھارا ہے۔
منوّر صاحب کی غزل دیکھو یا نظم ان کی طبیعت کی اُفتاد ایسی واقع ہوئی ہے کہ مقامی یا کسی نوع کے تعصب جنبہ داری سے مُبرا ہے۔ ان کی پیدائش، نشو و نما اور تعلیم لکھنؤ میں ہوئی، مگر وہ اس ہمہ گیر رنگ کے شیدا ہیں جو دہلی اور لکھنؤ کے امتیاز سے منکر ہے اور جس کا ابتدائی ظہور معیار[1] کے افق میں ہوا ذیل کے اقتباس سے اس کی وضاحت ہوتی ہے ؎

لوازمِ انسانی

نہیں کچھ ہم کو شکایت جو محبت نہ کرے مگر انسان کسی سے بھی عداوت نہ کرے
اس کی محرومیٔ قسمت کا ٹھکانا کیا ہے عیب پر اپنے جو اظہارِ ندامت نہ کرے

ایک نظم کا عنوان ہے نزولِ حیا۔ کیسی بامعنی اور پیاری نظم ہے۔ کتنا ستھرا اور شاعرانہ تخیل ہے، اور پھر اتنا سبق آموز کہ اسے اخلاق اور جنسی تمدن کے دفتر میں ممتاز جگہ دینی چاہیئے۔ دیکھئے ؎

آب و گل سے جب نمایاں ہو گئے آثارِ حسن دستِ قدرت نے دیا ترتیب جب گلزارِ حسن
رہ گیا کچھ نامکمل ساز و سامانِ کشش دلربا رنگینیوں سے تھا نہ دامانِ کشش
اور سب اجزائے گوناگوں بہم ملتے رہے اس چمن میں پھول گو بہ مدتوں کھلتے رہے
"تاہم ان پھولوں میں شانِ دلربائی ہی نہ تھی کافرانداز ی میں شانِ پارسائی ہی نہ تھی
پھول یہ اک جوہرِ نایاب سے محروم تھے گوہرِ غلطاں تھے لیکن آب سے محروم تھے
چونک اُٹھی قدرت یکایک یہ نظارہ دیکھ کر اک نظر ڈالی پھر اس نے حسن کی تصویر پر
جامۂ نسوانیت سے دے کے اس قالب کو زیب ایک جوہر اس میں ڈالا آبدار و دلفریب
جنبشیں پلکوں کی تہذیبِ حیا سے رک گئیں حسن جاذب بن گیا جس وقت آنکھیں جھک گئیں

[1] "معیار" اردو زبان کا ایک مستند ادبی رسالہ تھا جو کسی زمانہ میں لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر نتھے آغا صاحب آبر تھے (منوّر)

منوّر اس وقت عمر کے فروغی حصّے میں ہیں۔ جب اس پر نظر کی جاتی ہو کہ وہ کس بڑے باپ کے بیٹے ہیں، اور ان کے رشحات طبع کا خیال کیا جاتا ہے تو زبردست اطمینان ہوتا ہے کہ اُردو کا مستقبل اُمید بخش ہے۔ منوّر صاحب کی ذات والاصفات اطمینان دلاتی ہو کہ ادب اور شاعری ان کی خدمات سے ابھی اور مستفیض ہوگی۔ یہ بڑی خوش نصیبی ہے کہ انہوں نے اس گھر میں آنکھ کھولی جہاں میرؔ اور مرزاؔ، نسیمؔ اور میر حسنؔ، آتشؔ اور انیسؔ کا نام عزت اور محبت سے لیا جاتا تھا۔ واللہ سخت قلق ہوتا ہے جب یہ خیال آتا ہے کہ آج خدا بخشے میرے دوست اُفقؔ صاحب زندہ ہوتے تو اپنے ہونہار نونہال کو پروان چڑھتا دیکھ کر کتنے بشاش ہوتے۔

منوّرؔ صاحب کا یہ مجموعہ آجکل کے طرز سخن کے بہترین نمونوں میں سے ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ بتاتا ہے کہ مستقبل کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ کہتے ہیں ؎

دفتر منشائے باری ہے کتاب انقلاب　　بند کر سکتا ہے کوئی خاک باب انقلاب

تم بھی ہو جاؤ ہم آہنگ رباب انقلاب
دو خموشی سے جھکا کر سر جواب انقلاب

اس پہ قابو تم کسی عنوان پا سکتے نہیں　　خود فنا ہو جاؤ گے اس کو مٹا سکتے نہیں

جب مبصّر ان کی یہ رُباعی پڑھیگا ؎

یکساں ہر اک کی چال کیسے ہو جائے　　تیرا جو ہے سب کا حال کیسے ہو جائے
ہے تیری پسند کچھ تو اس کی کچھ اور　　دنیا تری ہم خیال کیسے ہو جائے

تو طرز و اسلوب سے متعلق اس کی زبان پر مہر لگ جائے گی۔ ایک بات کے بیان یا خیال کے ادا کرنے میں اپنا اپنا رنگ جُدا ہوتا ہے۔ منوّر صاحب کا رنگ نہایت دلکش ہے۔ ان کے کلام میں تخیل بلند، اسلوب کی چستی بیان کی تازگی اور فکر کی اصابت کی بیشمار نظیریں پائی جاتی ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور نئی ترکیبوں کے استعمال کا ڈھنگ بھی سُہانا ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔ لفظوں کے گورکھ دھندے سے کام نہیں لیتے، نہ بلند آہنگی سے لوگوں کو مرعوب کرنا جانتے ہیں، ان کا مسلک بیان کی شگفتگی اور کلام کی

فصاحت ہے۔ جمہور کے برخلاف ان کا ذوقِ سلیم نُدرت آفرینی کے لئے اخلاق کے سنگستان میں ٹھوکریں نہیں کھاتا۔ مذاق کی سلامتی اسی کا نام ہے۔ وہ سیدھے سادے لفظوں میں بڑی اور کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں ان کے کلام میں اثر ہے کیونکہ وہ دل کی بات مُنہ سے نکالتے ہیں

میری عمر چونکہ اُردو میں کٹی، اس وجہ سے خود مجھے بھی کبھی کبھی یہ شُبہ ہوتا ہے کہ میں کہیں اُردو کے حق میں متعصب تو نہیں ہو گیا ہوں۔ میرا یہ پختہ یقین ہے کہ اُردو لکھنے پڑھنے سے ایک غیر مسلم شخص اپنی روایات اور ملی کلچر سے ہرگز بیگانہ نہیں ہوتا، اور یہ کہ اُردو ہمارے باہمی ارتباط اور امتزاج تمدن کا نہایت اہم ذریعہ ہے۔ ہاں تو وہ شُبہ اگر کبھی ہوتا بھی تھا تو اب جاتا رہا۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ اُردو کا ایک اچھا ہندو شاعر جسے خاندانی شاعر کہنا چاہیئے اپنی تصنیف سے پہلی چیز جو پبلک کے سامنے پیش کرتا ہے وہ "بھگوت گیتا" کا منظوم ترجمہ اُردو ہے۔ مُلک نسیمِ عرفاں کی خوبیوں کا اعتراف کر چکا ہے اسے اس موقع پر رہنے دو اور اس مجموعہ زیر نظر پر غور کرو تو معلوم ہو گا کہ جہاں مُصنف نے "گیتا کی روح" "سری رامچندر" "کرشن مہاراج" اور دوسرے ہندوانی موضوع پر دادِ سخن دی پیغمبرِ عربی بھی اس کو نہیں بھولے۔ ایک نظم کا عنوان ہے "ایک نیا پیغام" سُنئے ؎

بانیٔ اسلام اے خورشید تابانِ عرب ۔۔۔ اے محمدؐ مصطفےٰ جانِ عرب شانِ عرب
ظلِ اقدس میں پھلا پھولا گلستانِ عرب ۔۔۔ جگمگایا نور وحدت سے بیابانِ عرب

آپ کے پیغام کی بنیاد تھی الہام پر
اک نئی دُنیا بسا ڈالی خدا کے نام پر

اس نظم کو اس طرح ختم کیا ہے ؎

کیوں ہیں تاویلیں یہ اُلٹی آپ کے احکام کی ۔۔۔ صبح نورانی میں کیوں شامل ہے ظُلمت شام کی
پھر ہو عظمت آشکارا آپ کے پیغام کی ۔۔۔ لیجئے آ کر خبر پھر عالمِ اسلام کی

نام پر مذہب کے ظلم و جور کی بدعت نہ ہو
راہ سے بے راہ یعنی آپ کی اُمت نہ ہو

یہ وہ بات ہے جو سیدھے سوچ بچار کے سامان بھی کہتے ہیں۔

"کائناتِ دل" اسم بامسمّیٰ ہے جس طرح ان کا کلام اور زبان تنگدلی اور صُوبیت کے نظرسوز رنگ سے پاک ہے۔ اسی طرح ان کا تخیّل اور پرداز سخن تصنّع اور تکلف سے بے لوث ہے۔ بیباختگی ان کے کلام کا جوہر ہے۔ مشق سخن پختہ ہے اور انہوں نے زمانے کو آنکھیں کھول کر دیکھا ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ "کائنات دل" مقبول ہوگی اور پبلک اس کی قدر کر کے اپنی سلیم المذاقی کا ثبوت دے گی۔

دُعا[1]

امیر الشعراء پنڈت دتستہ پرشاد فدا بی۔ اے لاہور

تمہاری کائنات دل میں وہ افقی شعائیں ہیں
منوّر فکر کی اقلیم کی جن سے فضائیں ہیں
نئے جذبوں کی ہوا ان سے جہاں بھر میں ضیاباری
فداؔ ہی کی نہیں۔ یہ ایک عالم کی دعائیں ہیں

تاریخ

(از جناب کالی چرن اثر دہلوی)

کی ہے پیدا معنویت دلرُبا ہر لفظ میں
بندشیں حرفوں کی ہے رشکِ جواہر لفظ میں
یہ بلندیٔ تخیّل اور اس کے ساتھ ساتھ
مجھ کو ملتا ہے زباں کا بھی مزا ہر لفظ میں
ہیں اُمیدیں اس سے وابستہ ادب کی لے اثرؔ
کائناتِ دل ہے یہ جلوہ نما ہر لفظ میں

سمبت ۱۹۹۶

نوٹ [1] یہ دعا دیر سے موصول ہونے کے باعث دوسری دعاؤں کے ساتھ شامل نہیں کی جا سکی۔ (مصنّف)

ہمارا بہترین قومی شاعر

(از قلم حقیقت نگار ڈاکٹر موہن سنگھ صاحب دیوانہ ایم اے پی ایچ ڈی پنجاب یونیورسٹی)

"کائنات دل" کے پہلے ۱۶۰ صفحے دیکھے، اتنے صفحے دیکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ "عرض صادق" (صفحہ) ہی کے دیکھنے سے معلوم ہو گیا کہ اس جوانمرد کا دامان دل شاہد معنی کے بوقلموں جلووں سے بھرا پڑا ہے۔ نہ صرف منوّر صاحب کی قادر الکلامی کا میں قائل ہو گیا بلکہ ان کے مکمّل اور منوّر اور مؤثر ہندوپن پر ایمان لایا۔ ہندو تہذیب کی عظمت کے اس عظیم علم بردار کی داد یہ کہہ کر دی کہ آج دنیا میں اور کس مذہب کا پیرو اس عالمگیر محبّت میں ڈوب کر دعا کر سکتا ہے، اور کس ہندو شاعر نے بجز آپ کے اس نرالے انداز میں ویدک رشیوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہو! الفاظ کے انتخاب اور بندش میں منوّر اپنی آپ نظیر ہیں۔

"کائناتِ دل" میں اس حسّاس شاعر نے کائنات پیدا کو اپنی جاذبِ اثر نگاہ اور اپنے نقش پذیر دل کی بدولت کائناتِ دل بنا لیا ہے۔ کہاں کہاں سے کیف جذبہ حاصل کیا ہے اور کس کس حسینِ صوری کو شاہد معنی میں بدل ڈالا ہے۔ ہندو تہذیب کے زمینی اور آسمانی ہیرو موجود ہیں۔ راسخ الاعتقاد ہندو کی روزانہ زندگی کی شاہراہیں سامنے ہیں۔ وطن مالوف کے پہاڑ، دریا، چرند پرند، موسم، پھل پھول، درخت، اپنی نیرنگیاں عظمتیں اور بہاریں دکھا رہے ہیں۔ میرے اور تمہارے مزدور اور سرمایہ دار حاکم اور محکوم کے حالیہ انقلابات حال و آیندہ سے متعلق جذبات کے پرچم لہرا رہے ہیں۔

مگر مذہب کی نمایندگی، تہذیب کی آئینہ داری، قومیت کی ترجمانی، فطرت کی عکّاسی اور حُسن کی نقّاشی کس انفرادی پیرایہ میں کی ہے اور فن شعر کے کس قدر نئے اختراعات دکھائے ہیں۔

شاعر کا دل، حِنا، پروانہ، ابرو باراں، طلوعِ سحر، بسنت، رُکمنی، سورج مکھی کا پھول، طاؤس، ہولی برسات، کاسنی کا پھول، میں کیا ہوں، ٹیسو، بے ثباتی دنیا، گنگا، جمنا ایسے موضوع ہیں جن پر ہزاروں

مدعیانِ سخن خامہ فرسائی کر چکے ہیں مگر مندرجۂ ذیل اشعار کا جواب کہاں ہے؟ ؎

اگر رکھتا دل شاعر کی دُنیا میں قدم اپنا
سکندر کو نہوتا رنج ہرگز خونِ ارماں کا

یہ دل اک مسکنِ آزادی و عیش دوامی ہے
یہی ہے عشق کا منبع یہی مصدر ہی عرفاں کا

دل شاعر کا ہے اک قطرۂ خوں شعر پُر معنیٰ
یہ اک دلچسپ مجموعہ ہے اجزائے پریشاں کا

کبھی اس میں نظر آتی ہے رنگینی گلستاں کی
کبھی گوشہ یہ بن جاتا ہے اک صحرا کے داماں کا

اسی دل کی بدولت مذہبوں میں جان باقی ہو
اسی کے تارِ رگ سے منسلک اجزائے ایماں ہیں

غرض اس دل کی ہستی بھی عجب پُر لطف ہستی ہو
تموّج خاصیت اس کی ہو فطرت اس کی مستی ہو

(شاعر کا دل)

رہا نہ راز جو تھا رازِ سبز باغ حنا
مشامِ جاں میں ہوا منتقل دماغ حنا

نظر نوازِ مہ و خور ہے رنگِ داغ حنا
بساطِ حسن میں لَو دے اُٹھا چراغ حنا

ریاضِ دوست کھلا دعوتِ نظر کے لئے
پیامِ عیش ملا فرحتِ جگر کے لئے

چڑھا ہے رنگِ عملِ اشتیاقِ تزئین پر
مہک رہا ہے گلستاں کفِ نگاریں پر

وفا کا رنگ نقوشِ جفا میں بھرتی ہے
یہ روح اپنی حسینوں کو نذر کرتی ہے

(حنا)

کیوں جوشِ عاشقی میں ہر شئے سے بے خبر ہو
محفل نہیں یہ کوئی اک عام رہگزر ہے

ہے اس کی روشنی کا کچھ اور ہی قرینہ
ہستی ہے اس کی دائم محتاجِ آبگینہ

(پروانہ)

قافلہ کا قافلہ گو اب نظر سے دور ہے
گردِ راہِ ماہ و اختر سے فضا معمور ہے

آگ سی جس نے لگا دی چادرِ دریا میں ہے
بھیروی ترشول دستِ نازکِ اوشا میں ہے

یہ سماں وہ ہے کہ قائم لطفِ دنیا جس پہ ہے
یہ سماں وہ ہے کہ بنیادِ تمنا جس پہ ہے

یہ سماں وہ ہے کہ مفتوں چشمِ بینا جس پہ ہے
یہ سماں وہ ہے کہ خود خالق بھی شیدا جس پہ ہے

(طلوعِ سحر)

ہے اختیار و جبر کی اُلجھن میں جذبِ شوق
منصور یا کشاکشِ دار و رسن میں ہے

دل لے چلا ہے مرکزِ ارماں کو اپنے ساتھ
یہ نسبتِ لطیف کہاں جان و تن میں ہے

جُھرمٹ سہیلیوں کا جِپ ورد اس جلوہ گر
اِک جانِ انجمن ہے جو اس انجمن میں ہے

نیچی نظر میں کون چھپائے ہے کرشن کو
کس کا حجابِ ناز یہ پردا ہے کرشن کا

(رکمنی)

بیٹھا ہے اک رئیسِ جواں بخت شان سے
خورشید تک رہا ہے اسے آسمان سے

ہر برگِ زرد اک ہے کرن آفتاب کی
لیکن نہیں ہے اس میں جلن آفتاب کی

(سورج مکھی)

مست مثلِ رندِ صہبا نوش یوں جنگل میں ہے
جانِ عالم جلوہ گر گویا رہس منڈل میں ہے

(طاؤس)

شبنمی چادر بدن پر اور بھیگا سا لباس
مَل گئی گویا جبینِ ناز پر چھپکے سے دھول

کیوں نہ خارستاں میں کانٹوں کو بھی سوجھے چھیڑ چھاڑ
بوسہ کش کیوں دستِ رنگیں سے نہ ہوں ٹیسو کے پھول

(ہولی)

ہے ضد فصلِ نمو گرچہ شعلہ بارئِ برق
مگر نہ روئے زمیں سے وجودِ کاہ اُٹھا

اُجالی رات کے منظر کو برشگال میں دیکھ
نظر تو جانبِ سیلابِ نورِ ماہ اُٹھا

ثواب کا تجھے مدت سے لطف حاصل ہے
کچھ اب خدا کے لئے لذتِ گناہ اُٹھا

(برسات)

بدل کے بھیس فلک بوستاں میں آیا ہے — سمٹ کے پھول کے قالب میں جلوہ پیرا ہے
کرے نہ ہم پہ عیاں نیلم اپنے جوہر کو — کہ پھول چھوڑ کے لیتا ہے کون پتھر کو

(کاسنی کا پھول)

وہ مومن ہوں جو مرتا ہے نگاہِ کفر ساماں پر — وہ منکر ہوں جو عاشق ہی جمالِ روئے قرآں پر

(میں کیا ہوں)

اس قدر تیرا چہرہ لال ہے کیوں — اس قدر تجھ کو اشتعال ہے کیوں

(ٹیسو کا پھول)

تری ہم شوق اک زیرِ زمیں بھی جلوہ فرما ہے — تری ہم نام اے گنگا فرازِ آسماں بھی ہے
نگاہِ دور رس سے دیکھنے والے یہ کہتے ہیں — ترا جلوہ جہاں میں آشکارا بھی نہاں بھی ہے

(گنگا)

جوگن کرشن کنہیا کی ہے — شوخ سہیلی رادھا کی ہے
گوالن الّھڑ متھرا کی ہے — پاک بہن تو گنگا کی ہے
میری پیاری جمنا تو ہے

(جمنا)

پھر ان مضامین کی تازگی اور شعر پروری وجذب انگیزی پر کس کی نظر پڑی اور کس نے اُنہیں منتخب کیا۔ مستقبل، انسانی قالب، شرد پورنما، پہلاد، عمر کی تعظیم، نزولِ حیا، کسبِ کمال اور طولِ عمر، ضمیر کی آواز، نغمۂ زندگی نیل کنٹھ"۔

بات در اصل یہ ہے کہ منوّر کو روش ارتقا پسند ہے اور اُس کے وجود کا معیار بلند ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پُرانے مضمون میں وہ نیا لطف ڈھونڈھ نکالتا ہے اور نئے مضمون کی تلاش میں دن رات ایک کر ڈالتا ہی یا نئے استعارے اور نئی تشبیہوں سے گیسوئے مضمون سنوارتا ہے یا موزونی الفاظ اور ہم آہنگی اصوات سے

سادگی کو نظر کشی کی حد تک نکھارتا ہے۔ استعارے اور تشبیہ کی جدت و کثرت دیکھنا ہو تو "ابرو باراں" اور "طاؤس" پڑھیے۔ اور نظر کش سادگی کو جس کی بنا موسیقیت اور لطافتِ خیال پر ہے، پرکھنا ہو تو رباعیات ملاحظہ فرمائیے۔

اقبال مسلمانوں کے بہترین قومی شاعر تھے۔ منوّر ہندوؤں کے بہترین قومی شاعر ہیں۔ دونو بلاغت پر لٹو، دونو فارسیت سے مغلوب، دونو دل کی گہرائیاں ناپنے والے دونو ترجمانِ حقیقت۔

ہندو تہذیب کے امتیازی خصوصیات جس لطیف دلکش اور اعلیٰ پیرائے میں منوّر نے نظم کیے ہیں اُسے دیکھ کر یہ اُمید قوی ہوتی ہے کہ ہنود جس انقلاب سے اس وقت گذر رہے ہیں اُس پر فتحمند ہو کے رہیں گے اور وہ صداقتیں جو ہندو تہذیب کا طرۂ امتیاز رہی ہیں۔ اور جن کی طرف منوّر بار بار اشارہ کرتے ہیں۔ انسان کو انسان کی خونخواری سے بچا کر رہیں گی۔ وہ صداقتیں کیا ہیں۔ سُنئے فقیر ہیچمداں کی رائے میں یہ اشعار کائناتِ دل کی جان اور ہمارے مطالعہ کا حاصل ہیں۔

حرم کو جاؤ تو رستے سے دیر کے جاؤ ۔۔۔ دُعائیں لے کے بتوں کی خدا کے گھر میں چلو (صلائے عام)

جو ہے بخشندۂ کل اک ہے یہ سوغات اُس کی ۔۔۔ نظر آئے گی تجھے اس میں کرامات اُس کی (انسانی قالب)

جتنی تری روح پاک و اطہر ہوگی ۔۔۔ جتنی تجھے روشنی میسّر ہوگی
اُتنا ہی لطیف تیرا قالب ہوگا ۔۔۔ اُتنی ہی خوشی تجھے منوّر ہوگی (رباعی)

گذر خودی سے کہ ہو کیف بیخودی حاصل ۔۔۔ خدا بھی تو کبھی اے بندۂ خدا ہو جا
رسائی ہے جو تری صرف نارسائی تک ۔۔۔ تو نارسائی کے اقرار سے رسا ہو جا
رہے مدام نظر تیری اپنے مرکز پر ۔۔۔ محیط دائرہ طاعت و رضا ہو جا
نہاں نشاط دوامی کا راز اسی میں ہے ۔۔۔ جو دل کے ساز سے پیدا ہو وہ صدا ہو جا (ترغیب ارتقا)

ستم و جور کو بنیاد حکومت نہ بنائے ۔۔۔ کون کہتا ہے کہ انسان حکومت نہ کرے (لوازم انسانی)

دریا در کوزہ

یعنی

"کائناتِ دل" کے متعلق مشہور محبِّ وطن مسٹر آصف علی بیرسٹر ایٹ لاء ایم ایل اے سنٹرل کا

ارشاد

منوّر صاحب کی فرمائش پوری کر رہا ہوں میں نے عُذر کیا، انہوں نے نہ مانا اسی کا نام مجبوری ہے جسے میں خوشی سے قبول کرتا ہوں۔

اس زمانہ میں جب ہندی اور اُردو ایک دوسرے سے مُنہ موڑے بیٹھی ہیں، کسی ہندو صاحب کا یہ جرأت کرنا کہ اُردو میں نہ صرف شعر کہنا بلکہ اپنے نظم کے مجموعہ کو ایک مستقل صورت میں پیش کرنا میری رائے میں ایک ایسی کیفیت رکھتا ہے کہ اُردو کے ہمدردوں کو اسے بجائے خود ایک شعر سمجھنا چاہیئے، اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ منوّر صاحب اُردو اور شعر و سخن کے عاشق ہیں۔

منوّر صاحب کے کلام میں یہ خوبی ہے کہ سیدھا سادہ ہے، جو ہر شخص کی سمجھ میں آسانی سے آجائے پیچ و خم اور ایسی ترکیبوں سے صاف ہے، جن سے پڑھنے اور سُننے والے کو چکّر آجائے۔ مضامین کا میدان بڑا کھلا ہے جس میں ارتقائے کائنات بھی ہے، کاسنی کا پھول بھی ہے اور گلہری بھی۔ حبّ وطن بھی ہے، دھرم اور عبادت بھی ہے اور موت اور زیست کا نوحہ بھی۔ قدیم روش بھی ہے اور جدید رفتار بھی۔ قصّہ مختصر منوّر صاحب کے کلام میں کل وہ باتیں موجود ہیں جو ہر راہ گیر زندگی کو روز آئے پیش آتی ہیں۔ مگر انہوں نے انہیں باتوں کو نظم میں قید کر دیا ہے۔ اب اس سے زیادہ میں اور کیا لکھوں۔

مُقدمہ

از منشی گوپی ناتھ امن لکھنوی اسسٹنٹ ایڈیٹر روزنامہ "تیج" دہلی

(۱) شاعری کے موضوع پر اتنا کچھ لکھا جاچکا ہے کہ اس میں اضافہ کرنا تو درکنار اس تمام کا مطالعہ کرنا بھی غیر ممکن ہے۔ عام حیثیت سے شاعری پر اظہار خیال کرنا میرے لئے چھوٹے منہ بڑی بات ہے۔ ہاں اُردو اور ہندی کی شاعری کے بارے میں کچھ کہہ سکتا ہوں یہاں اُردو شاعری سے بحث ہے۔

(۲) اُردو شاعری بادشاہوں کے دربار میں پیدا ہوئی، اس لئے اُس کا رنگ روپ اسی فضا کے مطابق تھا۔ قصیدوں میں تو حقیقت کا نام ہی نہ تھا، غزلیں کچھ حقیقت رکھتی تھیں سو وہ بھی انہیں شاعروں کی غزلیں جو شاہی دربار سے یا اُس کے اثر سے بے نیاز تھے۔ اسی لئے دردؔ، میرؔ اور آتشؔ کا کلام خاص اثر رکھتا ہے۔ مگر غزل گوئی کو بدقسمتی سے وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ ہر کس و ناکس شاعر بن بیٹھا۔ قدیم دور میں نظم گو شاعر صرف میاں نظیرؔ نظر آتے ہیں، اُنہوں نے چاہے اچھی بات کہی یا بُری مگر دل سے کہی۔ مرثیہ گو شاعروں کو ٹکسال باہر سمجھا گیا۔ مگر سچ پوچھئے تو انہوں نے اُردو پر بڑا احسان کیا، ورنہ اُردو میں مسلسل نظمیں تھیں ہی کہاں۔ آخر انیسؔ اور دبیرؔ نے ایسا رنگ جمایا کہ غزل گو بھی اُن کا سکّہ مان گئے۔

(۳) اُردو شاعری کا جدید دور اُنیسویں صدی کے پچھلے نصف حصہ سے شروع ہوا اور اسکی داغ بیل مولانا محمد حسین آزادؔ، ماسٹر پیارے لال آشوبؔ اور خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے ڈالی۔ آشوبؔ کو چنداں مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ آزادؔ کی عمر کے آخری بیس سال دیوانگی کے عالم میں گذرے۔ البتہ حالیؔ کو خدمتِ ادب کا زیادہ موقعہ ملا اور اُنھیں کو موجودہ نظم گوئی کا سب سے مشہور علم بردار سمجھنا چاہیئے۔

حالیؔ نے پرانے انداز شاعری بالخصوص غزل گوئی کے خلاف جہاد اور کامیاب جہاد کیا، جس کا اثر صرف یہی نہیں ہوا کہ اُردو میں نظمیں کہنے کا رواج بڑھنے لگا بلکہ غزل گوئی کا اسلوب بھی بہت کچھ بدل گیا۔ اس

آخرالذکر تبدیلی کے لئے ہمیں مرزا غالب کا بھی احسان ماننا پڑیگا۔ حالی نے اس بات پر بہت زور دیا کہ شاعری میں الفاظ پر معنی کو فوقیت ہونی چاہیئے۔ بندشوں پر مفہوم کو ترجیح دینا لازم ہے۔ پُرانے اسکول کے شاعروں نے اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا اور بہت دنوں تک حالی کا کلام ٹکسال باہر سمجھا گیا، لیکن بالآخر رائے عامہ غالب آئی۔ نئے دور کے تہذیب و تمدّن میں لوگوں نے دقیانوسی رنگ کی چیزوں کو خیر باد کہنا شروع کیا۔ اُردو شاعری بھی اس اثر سے نہ بچ سکی۔ حالی کی جیت ہوگئی۔ پُرانے رنگ کے کہنے والوں میں جو زمانہ شناس تھے انہوں نے بھی اپنا رنگ بدلا، جن میں رنگ بدلنے کی صلاحیت نہ تھی اُن کا ذکر نہیں، لیکن جن میں یہ قابلیت موجود تھی انہیں نئے رنگ کے نئے شاعروں پر ایک خاص فوقیت حاصل تھی۔ مشّاق غزل گو ہونے کی وجہ سے اُنہیں زبان پر قدرت تو تھی ہی اب جو انہوں نے جذبات نگاری اور واقعہ بندی کی طرف توجہ کی تو اندازِ بیان نے شانِ موضوع کو دوبالا کر دیا۔ اس ذیل میں لکھنؤ کے دو اُستادوں منشی نوبت رائے صاحب نظرؔ اور ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد صاحب اُفقؔ کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔ نظرؔ مرحوم منوّرؔ صاحب کے استاد اور اُفقؔ مرحوم ان کے والد ماجد تھے۔

منوّر کا نظریہ شاعری

(۴) اس مختصر سی تمہید سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ شاعری کے جس ماحول میں جناب منوّرؔ نے پرورش پائی اس میں زبان کے جوہر بھی تھے اور جذبات کا خزانہ بھی۔ اگرچہ حضرت نظرؔ اور حضرت اُفقؔ دونوں مسلّم الثبوت اُستاد تھے اور دونوں ہی غزل اور نظم کہنے پر قادر تھے، لیکن حضرت نظرؔ کو غزل گوئی میں اور حضرت اُفقؔ کو نظم گوئی میں زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اگرچہ منوّرؔ کے جوان ہونے سے قبل ہی والد کا سایہ ان کے سر سے اُٹھ گیا، لیکن چونکہ ان کی طبیعت کو شاعری سے خداداد لگاؤ تھا، اس لئے اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں ہی ان کی شاعری کا آغاز ہو چکا تھا، اور انہوں نے اپنا ابتدائی کلام اپنے والد بزرگوار ہی کو دکھایا۔ والد کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد حضرت نظرؔ سے اصلاح لینی شروع کی۔ طبیعت خداداد پائی تھی، مسلّم الثبوت اُستاد کی شاگردی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ منوّرؔ کی شاعری کو چار چاند لگ گئے اور آج ان کا کلام اُستادانہ حیثیت رکھتا ہی

(۵) قافیہ پیمائی ہی شاعری نہیں ہے۔ خود جناب منوّرؔ حضرت ساحرؔ کے دیوان کا دیباچہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں "یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ دورِ جدید کے تمام شعرائے دلّی محض زبان ہی کی خوبیاں پیدا کرنے میں دل و دماغ کو صرف نہیں کرتے بلکہ اپنے کلام میں وہ واقعات نگاری اور حیات انسانی کی فلسفیانہ عقدہ کشائی سے بھی کام لیتے ہیں جو میرے خیال کے مطابق شاعری کا اصل مدّعا و مقصد ہے" ان الفاظ سے شاعری کے متعلق جناب منوّرؔ کا نظریہ معلوم ہوجاتا ہے، وہ لفظی صنعتوں پر معنوی خوبیوں کو افضل قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ الفاظ کی بندش کے اعتبار سے یا صنائع بدائع کے لحاظ سے ان کے کلام میں کوئی کمی ہے۔ افقؔ اور نظرؔ جیسے باکمالوں سے فیض اٹھانے والے میں یہ کمی کب رہ سکتی تھی۔ اُستاد شاگرد کی طبیعت میں جدّت پیدا نہیں کرسکتا۔ الفاظ کی نسبت سلیقہ بتا سکتا ہے۔ فنّی اعتبار سے غلطیاں دور کرسکتا ہے۔ منوّرؔ صاحب کی طبیعت میں جدّت خداداد تھی۔ نظرؔ کی شاگردی نے ان کو اُستاد بنادیا، اور آج ان کے بعض تلامذہ* بھی اس پایہ کا کلام کہتے ہیں کہ اساتذہ بھی اس پر داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ منوّرؔ صاحب کے کلام میں صوری و معنوی دونوں قسم کی خوبیاں موجود ہیں۔ پُرانے رنگ کے کہنے والے ان کے الفاظ کی بندش اور ترکیبوں کی چُستی پر داد دیتے ہیں۔ نئے رنگ کے شیدائی ان کی جذبات نگاری پر وجد کرتے ہیں۔

میں اس موقعہ پر جناب منوّرؔ کا نظریہ شاعری واضح کرنے کے لئے پھر انہیں کی عبارت سے ذیل کا اقتباس درج کرتا ہوں۔

لسان الغیب مرزا غالبؔ کے بعد دلّی کے شعرائے باکمال میں جس قدر مقبولیت کلام کا شرف فصیح الملک جہاں اُستاد مرزا داغؔ کو نصیب ہوا وہ شاید اب تک کسی کے حصّہ میں نہیں آیا۔ خود ان کے ارشد تلامذہ میں سے کوئی بھی ان کی عظمت و شہرت میں اضافہ نہیں کرسکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ زبان کا لطف پیدا کرنے میں ان کے اکثر تلامذہ نے کوشش فرمائی ہے۔ لیکن جو بات داغؔ مرحوم کو حاصل تھی اس کا عشر عشیر بھی ان کے کلام میں نہیں پایا جاتا ہے۔ یہ حضرات زبان کے گورکھ دھندے میں کچھ اس طرح اُلجھے کہ ان میں سے اکثر کو سلامتی مذاق سے کوئی واسطہ نہ رہا اور وہ عشق و محبت کی مجازی منزلوں کو بھی سلیقہ کے ساتھ طے کرنے میں ناکام رہے۔

* جناب آسیؔ لفظ تلامذہ کے بجائے "احباب" کا لفظ استعمال فرماتے تو زیادہ مناسب تھا۔ منوّرؔ

انہوں نے نہ ہمیں کچھ پیغام دیا نہ ایسی خاص روش پر لگایا، جس پر چل کر ہم انسانی زندگی کے اصلی مدعا و مقصد کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے"

منوّر صاحب کا ایک شعر ہے ؎

شعر وہ کیا جو دل میں گھر نہ کرے ۔۔۔ کیا سخن وہ جو کچھ اثر نہ کرے

(ٹیسو کا پھول)

یہ اثر یہ پیغام یہ سلامتی مذاق منوّر کے کلام میں موجود ہے۔

غزل گوئی

(۶) چونکہ چند وجوہ سے منوّر صاحب نے پہلے مجموعہ نظم شائع کرنا مناسب سمجھا، اس لئے اس جگہ ان کی غزل گوئی کی خوبیاں بیان کرنا چنداں مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ منوّر کا رنگ تغزل انتہائی ستھرا ہے اور بندشوں کی چستی کے ساتھ وہ سوز وگداز اور وہ درد پایا جاتا ہے جو حقیقی معنوں میں غزل گوئی کی جان ہے۔ منوّر صاحب کا یہ مطلع ؎

دل کا ایک ایک داغ بجھتا ہے ۔۔۔ زندگی کا چراغ بجھتا ہے

میرے نزدیک اردو زبان کے بہترین مطلعوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ اکثر مشاعروں میں مجھے اور منوّر صاحب کو ساتھ ساتھ غزلیں پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایک مرتبہ غازی آباد کے ایک مشاعرہ میں میری غزل کا یہ مطلع ؎

کیوں امن عبث مائل فریاد ہوا ہے ۔۔۔ رو کر بھی کوئی قید سے آزاد ہوا ہے

مشکل زمین میں ایک صاف مطلع تھا، اس لئے بہت پسند کیا گیا۔ منوّر صاحب بھی اس مشاعرہ میں موجود تھے، جب آپ نے یہ مطلع پڑھا ؎

مرنے پہ جو مائل دل ناشاد ہوا ہے ۔۔۔ مر کر بھی کوئی قید سے آزاد ہوا ہے

حاضرین تڑپ اُٹھے، ان کے مطلع کے مصرعہ ثانی میں میرے مصرعہ سے صرف ایک لفظ بدلا ہوا ہے لیکن اس نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اگر زندگی رہی تو منوّر صاحب کے مجموعہ غزلیات شائع ہونے پر کچھ مفصل عرض کروں گا، یہاں صرف انکی نظموں سے بحث ہے۔

منوّر صاحب کی نظمیں

(۷) اس مجموعہ میں ہر قسم کی نظمیں ہیں۔ حسن و عشق، توحید و معرفت یاس و حسرت، خوشی و مسرت، تلقین صبر

پیغام عمل، مناظر قدرت، اسرار فطرت، ماضی کی یاد، مستقبل کا ذکر یہ سب کچھ موجود ہے۔

(۸) کہا جا سکتا ہے کہ منورؔ کے کلام میں متضاد جذبات پائے جاتے ہیں مگر یہ نہ تو تعجب کی بات ہے نہ اعتراض کی۔ انسانی زندگی میں جو نشیب و فراز پیش آتے ہیں وہ دل و دماغ کی کیفیت کو وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے ہیں۔ یہی انسان ایک وقت کسی واقعہ پر خوش ہو کر ہنستا ہے، دوسرے موقعہ پر کسی واقعہ سے متاثر ہو کر رونے لگتا ہے اور منورؔ صاحب نے تو ایک حسّاس دل پایا ہے، اس لئے ان کے کلام میں مختلف واقعات کے زیر اثر مختلف قسم کے جذبات کی موجودگی عین فطرت کے مطابق ہے۔ لیکن ان کے کلام میں اخلاقی رنگ غالب ہے۔ مثال کے طور پر انکی نظم "اُپلے والی" دیکھئے، ۱۹۳۵ء میں جے پور میں ایک عالی شان مشاعرہ ہوا تھا، میں بھی اُس میں گیا تھا، منورؔ صاحب بھی تشریف لے گئے تھے، راستہ میں اُنہوں نے ایک حسینہ کو دیکھا، یہ نظم اُسی کے متعلق ہے، حُسن اور اُس کی اداؤں کا دلفریب منظر کھینچا ہے، مگر عام شاعروں کی طرح بوالہوسی نہیں پائی جاتی، بلکہ بیان حُسن کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ ؎

تھی آن کی گنجارن یہ بات کی دُھنی تھی | عفت میں نگشتی تھی عصمت میں پدمنی تھی
دامانِ بوالہوس کو پیروں سے رَوندتی تھی | خرمن پہ معصیت کے بجلی سی کوندتی تھی
بھولے سے بھی جو آ کر اُس کو وہ چھیڑ دیتی | پیراہن صبا کے بخئیے اُدھیڑ دیتی
روکے تھی زور بحر عصیاں کے جزر و مد کا | ہوتا تھا سرد شعلہ اس سے نگاہِ بد کا
پاکیزگی کا جوہر کرتا تھا ضو فشانی | تھی جس کے گھر کی رانی اُس کے گھر کی رانی

یہ ہے منورؔ کی خصوصیت، کاش اس دور کے دیگر شاعروں میں بھی یہ بات پائی جاتی۔

منورؔ کی بعض نظمیں غزل کی صورت میں ہیں مثلاً نکات ارفع، عمر کی تعظیم، ترغیب ارتقا، تائید وقت کے عنوان سے نظم کہ

مہم جو سامنے آئے وہ سَر کئے جاؤ | نظر ہو جانبِ منزل سفر کئے جاؤ

ہائے کیا شعر کہا ہے ؎

اُتر چکا ہے نظر سے جو زندگی کا نظام | طریقِ نو سے اُسے منتشر کئے جاؤ

ہندوستان کو اور اُردو زبان کو اس شاعری کی ضرورت ہے۔

(۹) عرضِ صادق میں جو اعلیٰ جذبات نظم کئے ہیں وہ اُردو شاعری میں کم نظر آتے ہیں۔ "کشمکش" کے عنوان سے

جو نظم ہے اس کا رنگ مجھے انتہائی پسند ہے' خود بھی اسی رنگ میں لکھنے کی کوشش کرتا ہوں اس نظم کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

مرنا نہیں مُقدّر ارباب جاں سپار — جینا جو ہے تو حوصلۂ رستخیز کر
گرمی اُبھار بزم کے ساماں سے رزم کی — ہاں نوشِ جاں پیالۂ صہبائے تیز کر

"صلائے عام" کا یہ شعر ؎

اگر ہر ایک کو ہر طرح شاد رکھنا ہے — رہو نظر میں نظر میں بسو نظر میں چلو

ظاہر کرتا ہے کہ شاعر کو غزل کے رنگ میں پختگی حاصل ہے۔

(۹) کالستھ انسٹی ٹیوٹ' غازی الدین حیدر کی نہر' اور نوابستہ اسکول مقامی رنگ کی نظمیں ہیں۔ "وصالِ حق" منشی سورج نرائن صاحب مہر کا نوحہ ہے اسے عام نوحوں سے الگ درج کیا گیا ہے اور جو نکات اس میں بیان ہوئے ہیں اُن کی رُو سے یہ الگ ہی درج ہونے کا مستحق تھا۔ برہنی" (ہجراں نصیب) کے عنوان سے جو نظم ہے اُس کی یہ خصوصیت ہے کہ فارسی عطف و اضافت کہیں نہیں۔ مگر بندش میں ذرا بھی فرق نہیں آیا بلکہ لطف دوبالا ہو گیا ہے۔ منوّر ایک مذہبی آدمی ہیں' اس لئے اُن کی مذہبی نظمیں خاص کیفیت رکھتی ہیں۔ اُردو میں ہندوؤں کے مذہبی بزرگوں کے متعلق بہت سی نظمیں ملیں گی جو نہ صرف ہندوؤں نے بلکہ مسلمانوں نے بھی کہی ہیں' بالخصوص بھگوان کرشن کے متعلق بیشمار نظمیں پائی جاتی ہیں۔ منوّر صاحب نے کرشن مہاراج کے متعلق جو نظمیں لکھی ہیں وہ صفِ اول میں جگہ پانے کی مستحق ہیں' یہی نہیں بلکہ ان کے صفائے قلب کا یہ عالم ہے کہ دوسرے مذاہب کے بزرگوں کا بھی احترام بدرجہ اتم کرتے ہیں' آپ نے شیرِ خداؓ کے عنوان سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں ایک نظم لکھی ہے' جس کے ہر لفظ سے عقیدت ٹپکتی ہے' فرماتے ہیں ؎

ایسا مطیع اہلِ کلام اور کون تھا — ایسا شہِ عربؐ کا غلام اور کون تھا
فرشِ زمیں پہ عرش مقام اور کون تھا — تسبیح مصطفےٰؐ کا امام اور کون تھا
پیدا دلاوری سے تھی صدق و صفا کی شان
شیرِ خدا کی شان تھی شیرِ خدا کی شان

اسی طرح آریہ سماج، جین سماج، سکھ دہرم، بودھ دہرم ہر ایک کے بانی کی شان میں نظمیں کہی ہیں اور خوب کہی ہیں، جہاں مذہبی مسائل کو فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا ہے قلم توڑ دیئے ہیں۔ "شان نزول" کی جو نظم صفحہ ۱۵۳ پر درج ہے اس کی ایک مثال ہے ؎

مرغِ آزاد کی نگاہیں — خود حلقۂ دام ہو رہی ہیں
ٹپکیں نہ قدم سے لغزشیں کیوں — مجبور خرام ہو رہی ہیں

کیا کہنا ہے۔

(۱۰) ہندوستان مردانِ خدا کی سرزمین رہی ہے یہاں کے اونچے فلسفے اور موجودہ حالت کو دیکھ کر بعض دلوں میں مایوسی، بعض میں حیرت اور بعض میں غصّہ پیدا ہوتا ہے۔ مُنوّر صاحب نے طنزِ لطیف کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے، اُس میں اپنے خیالات کا اظہار عجیب پیرایہ میں کیا ہے، وہ اس نظم کو اس طرح شروع کرتے ہیں کہ نہ ہندوستان کا ماضی شاندار رہا ہے نہ یہ کبھی رشک جنّت رہی ہے نہ اُپنشد یہاں کی تصنیف ہیں نہ یہاں کناد کپل جیسے رشی پیدا ہوئے نہ یہاں رام لکشمن کا ظہور رہوا۔ ہنومان بھیم کرن اُرجن جیسے دلاور ہوئے نہ بھگوان کرشن کا جنم ہوا، لیکن آخر میں گریز کر کے فرماتے ہیں کہ اگر یہ بیانات کتھائیں و رافسانے نہیں ہیں تو اے کرشن ان کی صداقت ہمارے مستقبل کو سنبھال کر ثابت کر عجیب انداز کی نظم ہے، پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

(۱۱) مُنوّر صاحب نے قومی نظمیں بھی لکھی ہیں اور خوب لکھی ہیں۔ ان نظموں پر جہاں مُنوّر صاحب کے مضامین اور حسنِ بندش کا مدّاح ہوں، وہیں اُنکی دلیری کی داد دیئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ مجھے قومی نظموں کے متعلق مُنوّر صاحب کے اس نظریہ سے بالکل اتفاق ہے ؎

میں چاہتا ہوں دادِ سخن وہ ملے مجھے — دی جائے جو مُحبِّ وطن کی زبان سے

اکثر محبّانِ وطن مُنوّر صاحب کے قومی کلام کی داد دیتے ہیں، مگر بوجوہ ظاہر وہ زیادہ صفائی سے اس کا اظہار نہیں کر سکتے۔ میں اس بارے میں کچھ زیادہ کہنے سے احتراز کروں گا۔ اُردو کے نادان دوستوں کو

مُنوّرؔ صاحب کا یہ شعر یاد رکھنا چاہیئے ؎

کام سے اپنے جو دنیا میں اسے کام رہے　　مٹ سکے گا نہ کبھی نام و نشانِ اُردو

(۱۲) مُنوّرؔ صاحب کے اس مجموعہ میں ترجمے بھی ہیں، یہ ترجمے اتنی صفائی سے کئے گئے ہیں کہ ترجمے معلوم نہیں ہوتے مثلاً تلسی داس کا ایک دوہا لیجئے ؎ رام نام من دیپ دھر جیہ دیہری دوار: تلسی بھیتر باہرو جو چاہیس اُجیار: اس کا ترجمہ کیا خوب ہے ؎

رتبہ دنیا میں اس سے اعلیٰ ہوگا　　عقبیٰ میں بھی بول اس سے بالا ہوگا

دہلیز پہ لب کی شمعِ نامِ حق رکھ　　اندر باہر تمام اُجالا ہوگا

(۱۳) مجموعہ کے صفحہ ۱۴۶ پر "دو بھائی" کے عنوان سے ایک نظم میرے اور برادرِ عزیز ادیب کے متعلق ہے صفحہ ۶۷ پر جو نظم درج ہے اس میں بھی مُنوّرؔ صاحب نے میرا ذکر فرمایا ہے، اس کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ایک واقعہ کا ذکر ضروری ہے۔ مُنوّرؔ صاحب میرے اُن احباب میں سے ہیں، جن کو میری ذات سے نقصان* پہنچا ہے ۱۹۳۵ء میں جے پور کے مشاعرے میں وہ اپنا قلمی مجموعہ کلام میرے سپرد کر کے البرٹ ہال کے باہر چلے گئے، میں شعراء کے کلام سننے میں محو تھا، اُن کا مجموعہ کلام صدر صاحب کے تخت کے نیچے اپنے قریب رکھ لیا، تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آئے اور دیکھا تو وہ مجموعہ وہاں موجود نہ تھا آس پاس دریافت کیا مگر پتہ نہ چلا ایسی چیزوں کا پتہ کہاں چلتا ہے، مجھے انتہائی ندامت ہوئی، اور اب بھی جب خیال آتا ہے تو جی چھپتا سنے لگتا ہے۔ معلوم نہیں اُن میں سے کتنی نظمیں رسالوں اور اخباروں میں چھپ چکی تھیں اور کتنی غیر شائع شدہ تھیں۔

---

* جناب اَمَن صاحب کی ذات سے تو میرے خیال کے مطابق کسی ذی روح کو بھی نقصان نہیں پہنچ سکتا، پھر مجھے نقصان کیسے پہنچ سکتا ہے۔ مسوّدہ کا غائب ہو جانا ایک امر اتفاقی تھا۔ معدودے چند نظموں کے علاوہ باقی تمام نظموں کی نقول مجھے مل گئی تھیں براہ کرم اَمَن صاحب اس واقعہ کو دل سے فراموش کر دیں۔

مُنوّرؔ

کائناتِ دل کا تجزیہ

(از مسٹر گیان پرکاش آخر۔ بریلوی)

عین اُس وقت جب "کائنات دل" کی کاپیاں پریس میں جا چکی تھیں میرا منوّر صاحب سے یہ درخواست کرنا کہ "کائنات دل" پر اپنے کچھ خیالات ظاہر کرنے کی اجازت مجھے بھی دی جائے اور اس درخواست کا منظور ہو جانا شاید منشائے قدرت ہے۔

"کائنات دل" میں جناب منوّر کی صرف نظمیں شامل ہیں، مجھے معلوم ہے کہ آپ پہلے غزلیات کا مجموعہ شائع فرمانا چاہتے تھے اس کی وجہ صاف ہے۔ لکھنؤ سے جب تک آپ کا تبادلہ پہلے لاہور اور بعد کو دہلی نہیں ہوا تھا، آپ کی توجہ نظم گوئی کی طرف تھی، اگرچہ غزل کا بھی شوق تھا، لیکن دہلی آنے کے بعد آپ کی طبیعت نظم کے بمقابلہ غزل کی طرف زیادہ راغب ہو گئی اسی لئے آپ نے غزلیات کے مجموعہ کی اشاعت کو ترجیح دینی چاہی، مگر جناب بشیش چندر صاحب طالب دہلوی کے بار بار اصرار پر بالآخر آپ نے پہلے نظموں کی اشاعت ہی منظور فرمائی۔

اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ اُردو شاعری کی خصوصیت غزل میں نظر آتی ہے، اور لکھنؤ کے شعراء عام طور پر اور بیرونجات کے بعض شعراء خاص طور پر غزل گوئی ہی پر اُردو شاعری کو ختم سمجھتے ہیں، تاہم دور جدید کی ضروریات نے لکھنؤ کی سرزمین سے بھی ایسے ایسے شعراء پیدا کئے ہیں جنہوں نے حالی اور آزاد کی روش پر چل کر اُردو شاعری کی خدمت انجام دی ہے۔ چنانچہ منشی رام سہائے تمنّا، جناب منوّر کے والد بزرگوار حضرت اُفق، آپ کے اُستادِ گرامی منشی نوبت رائے صاحب نظر، پنڈت برج نرائن چکبست مرحوم، امام سخن حضرت صفی لکھنوی اور لسان الہند حضرت عزیز مغفور، نیز اکثر دیگر شعرا نے میدان نظم میں اپنے اپنے کمالات ظاہر کئے ہیں۔ حضراتِ نظر، صفی، عزیز اور چکبست نے غزل کے چمنستاں میں بھی گلکاریاں کی ہیں، اور

کسی حد تک حضرات تمنّا اور اُفق نے بھی غزل گوئی کی ہے مگر ان دونوں کا رنگ سخن اوّل الذکر طبقہ سے کسی قدر جداگانہ ہے۔

جناب مُنوّر نے اسی جدید ماحول کے اثرات قبول کئے، اگرچہ ابتدا آپ کی شاعری کی بھی غزل گوئی سے ہی ہوئی ہے۔ لکھنؤ میں آپ نے جس قدر نظمیں فرمائیں ان میں زیادہ تر نظمیں قومی یا مذہبی تھیں، اور ان سب میں نظم کی خصوصیات پائے جاتے تھے، لیکن دہلی کی فضا میں آکر یہ خصوصیات ایک اور لطیف انداز اختیار کر لیتے ہیں جو غزل کے انداز سے قریب قریب ملتا جلتا ہے۔ آپ دہلی میں کہی ہوئی نظموں کا مقابلہ اگر ان نظموں سے کریں گے جو زمانۂ قیام لکھنؤ میں کہی گئی تھیں تو یہ فرق آپ کو نمایاں طور پر نظر آئیگا۔

چونکہ جناب مُنوّر صاحب سے میرا نزدیکی تعلق ہے، میں نے خود ان کے بتاتے ہوئے واقعات و حالات سے نیز خود اپنے تنقیدی مشاہدہ و مطالعہ سے چند نتائج اخذ کئے ہیں جنھیں پیش کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

جناب مُنوّر کی نظموں کو تنقیدی نظر سے دیکھنے پر پتہ چلتا ہے۔

(۱) آپ کلام کو حتی الامکان زیادہ سے زیادہ فصیح بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ ہونا بھی چاہیئے جدید قسم کی بندشیں آپ کے کلام میں شاذ و نادر ملیں گی۔

(۲) تمام نظموں میں کلچر (تربیت نفس) کی یکسانیت ہے، خواہ قومی نظم ہے، خواہ منظریہ خواہ واقعاتی سب کی تہ میں ایک روح کارفرما نظر آتی ہے اور جو حضرات شاعر سے کسی پیغام کے متوقع ہوں اُنہیں اسی کلچرل یکسانیت پر بس کرنا پڑے گا، حالانکہ "کائنات دل" کسی خاص پیغام کی حامل نہیں ہے۔

(۳) دوسری زبانوں کے خیالات کی ترجمانی اُردو زبان کی مخصوص حدود میں کی گئی ہو۔

ترجمہ کا شوق مُنوّر صاحب کو بچپن سے ہے۔ آپ کے بیان کے مطابق آپ نے تیرہ۱۳ سال کی عمر میں انگریزی کی ایک کتاب "Snow Drop" کا ترجمہ کیا تھا، دوسری زبان کے جواہر پاروں کو منتقل کرنا آپ کا طرۂ امتیاز ہے۔ مسٹر سی، آر، داس کی مشہور تصنیف "ساگر سنگیت" کا ترجمہ "بحر ترنّم"، تلسی داس جی کی

"بے پنر کا" کا ترجمہ "شعلۂ فریاد"، "رسبھاشک سمباد" کا ترجمہ "دین و دنیا کا مقابلہ" اور شری مد بھگوت گیتا کا مقبول عام اور معرکہ آرا ترجمہ "نسیم عرفاں" آپ کی ترجمہ نوازی کا زندہ ثبوت ہیں۔ انگریزی اور ہندی زبانوں سے آپ نے جتنی نظموں کا ترجمہ کیا ہے وہ سب قریب قریب اس مجموعہ میں شامل ہیں، اور اسمیں شک نہیں ترجمہ بعض جگہ ترجمہ نہیں بلکہ اصل معلوم ہوتا ہے۔ بحر اور الفاظ کے صحیح انتخاب نے کلام میں روانی پیدا کردی ہے۔ آج کل آپ کالیداس کے مشہور ڈرامہ "کمار سنبھو" کا ترجمہ منظوم فرما رہے ہیں۔

میری خواہش ہے کہ جناب منورؔ جلد از جلد اپنی غزلیات کا مجموعہ بھی ترتیب دیکر شائع فرمائیں۔ میں قادر کل سے مُستدعی ہوں کہ منورؔ صاحب کو دُنیائے شاعری میں مزید اظہار کمال کی قدرت عطا فرمائے اور انہیں اپنا مقصود زندگی حاصل ہو۔

صرف چند سطور

اس مجموعہ کے ابتدائی صفحات بہت کافی ہوگئے ہیں، اب مجھے کچھ عرض کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ پھر بھی میں اُن تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جنہوں نے مجموعہ کی ترتیب و طباعت کے متعلق مشوروں کی شکل میں مدد دی ہے، یا اس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مسٹر ستیش چندر طالب، عزیز اثر دہلوی، مسٹر نربدیشور پرشاد میرے مشیر کار رہے ہیں۔ مسٹر شو نراین بھٹناگر ایڈیٹر "وطن" کی رہنمائی کے بغیر میرا کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔ منشی دیانرائن نگم ایڈیٹر "زمانہ" اور مسٹر دھرمپال صاحب وفا ایڈیٹر "تیج" ویکلی بھی اشتراک عمل کے لئے میرا ندرانۂ سپاس قبول فرمائیں۔ کارونیشن پریس کے لائق منتظم حضرات اور مقبول حسین صاحب خوشنویس نے تمام کام نہایت دلچسپی سے سر انجام دیا ہے۔ ان کا شکریہ ادا نہ کرنا غلطی ہوگی کتاب کی اغلاط افسوسناک ہیں

مُبلّی خانہ دہلی

۱۹ اگست ۱۹۳۹ء

بشیشور پرشاد منورؔ

فہرست مضامین

صحت نامہ

کائنات دل کی کتابت میں جو غلطیاں درست ہونے سے رہ گئی ہیں اُن کے لئے یہ صحت نامہ حاضر ہے۔ غلطیوں کی نادرستی کے لئے کس کس کو مورد الزام ٹھہرایا جائے۔ بہتر یہی ہے کہ میں ہی اس کی تمام ذمہ داری خود پر لے لوں۔ بقول قہر درویش بجانِ درویش۔

مُنوّر

صفحہ	شعر نمبر	مصرعہ	غلط	صحیح
۲	۵	ثانی	کوہ و غم	کوہِ غم
۵	۳	"	بھی ہے	بھی
۷	۷	"	دعوی	دعوے
۱۰	۱	"	داغِ حنا	داغِ حنا
۱۱	۱۲	"	بہ	یہ
۱۴	۴	"	قمِ بازنی	قُم بازنی
۱۴	"	اوّل	صباصت	صباحت
۲۵	۹	"	شور برق انداز	شورِ برق انداز
۲۱	۱	"	یادآیا میکہ	یادآیا میکہ
۲۱	۷	"	یادآیا ئمیکہ	یادآیا میکہ
۲۴	۱۲	ثانی	چشم زِدن	بچشم زدن
۳۳	۲	اوّل	رنگین	رنگیں
۳۵	۶	"	آئینۂ دل کا	آئینہ دل کا
۳۵	۸	"	ٹوٹی	ٹوٹیں
۳۷	۳	اوّل	مجلس	محبس
۳۹	۲	ثانی	میرے	مرے
۴۵	۱۲	"	جزو لا نانی	جزولافانی

صفحہ	شعر نمبر	مصرعہ	غلط	صحیح
۴۶	۹	اوّل	عنواں سے	عنوان
۴۹	۶	"	سرفراز	سرافراز
۵۱	۸	"	بے لاگی	بے ماگی
۵۴	۴	"	عیشِ گاہ	عیش گاہِ
۶۰	۲	ثانی	سرِراہ وفا	سرراہِ وفا
۶۴	۲	اوّل	بادل	دل
۶۴	۵	"	انجن	انجمن
۶۶	۱۰	"	پڑے ہوئے	پڑے ہوئے ہیں
۷۳	۱۰	"	آ	مہر
۷۷	۱۲	ثانی	ہے	ہی
۸۰	۱۰	"	مواّجِ	موآج
۸۲	۵	اوّل	دعوای	دعوے
۸۴	۱۲	"	گمان	گماں
۸۷	۱	ثانی	رُدح	روئے
۸۹	۱۳	"	کولی	کوئی
۹۲	۳	"	بدلاہورا	بدلاہوا

صفحہ	شعر نمبر	مصرعہ	غلط	صحیح
۹۲	۳	ثانی	طرر	طرز
۹۳	۲	؍؍	بیشر	بیشتر
۹۳	۱۳	اوّل	آزار	آزارِ
۹۵	نثر	سطر ۳	حسرتِ آیات	حسرت آیات
؍؍	پانچواں بند	آخری مصرع	کشتی	کشتیِ قسمت
۹۶	شعر ۱	مصرعہ ثانی	قمقری	قمری
؍؍	۹	؍؍	پروانہ	پروانے
؍؍	۱۱	اوّل	سوزان	سوزاں
۹۸	۶	ثانی	بھرا ہوا	بھرا ہو
؍؍	۱۰	اوّل	نظّارہ	نظارہ
۱۰۳	۱۷	؍؍	صفتِ	صفت
۱۰۷	۸	ثانی	عارضی	عارض
۱۰۹	۶	اوّل	تری	تیری
۱۰۹	۹	؍؍	پڑتی	پڑتیں
۱۱۲	۱	؍؍	کوئی نہ کوئی	نہ کوئی
۱۱۲	۶	؍؍	رادھا	آدھا
۱۱۶	۸	؍؍	سرزمیں	سرزمینِ
؍؍	؍؍	ثانی	چسن	چمن
۱۱۷	۴	اوّل	قد	قدر
۱۱۹	۶	ثانی	سوزا	سوز
؍؍	۷	اوّل	ہوتا	ہوتا
۱۲۳			رباعی	قطعہ
۱۲۶	۵	اوّل	والی	ولی
۱۲۶	۹	؍؍	پس و پیش	پیش و پس

صفحہ	شعر نمبر	مصرعہ	غلط	صحیح
۱۲۷	۲	ثانی	نہیں ہے	نہیں ہیں
۱۲۷	۵	؍؍	پیشِ جگر	پیش جگر
۱۲۷	۷	اوّل	برھاپا	بڑھاپا
۱۲۸	۶	ثانی	امڑا آیا	امڈ آیا
۱۳۰	۷	اوّل	ہیں عیاں	ہے عیاں
۱۳۱	۵	؍؍	ندّی	ندی
۱۳۲	۱۰	؍؍	شعل	شغلِ
۱۴۰	۵	ثانی	ہم نام	ہمنام
؍؍	۱۲	؍؍	مواج	موّاج
۱۴۱	۹	اوّل	یا اندھیرا	یا ہو سویرا
۱۴۵	نثر	پہلی سطر	دیکھ کر کہی	کہی
۱۴۶	شعر ۴	مصرعہ اوّل	پڑ ہوا	پڑا ہوا
۱۴۶	آخری لائن		سلہ	سلسلہ
۱۴۷	عنوان		شب آخر	آخرِ شب
۱۴۷	۷	مصرعہ ثانی	جہاں	جہان
۱۴۹	۲	اوّل	بجتے	چنچتے
۱۴۹	۴	؍؍	پنے	اپنے
۱۵۰	۵	؍؍	نہ آسکے	آنہ سکے
۱۵۱	۲	ثانی	ہند ہیں	ہند میں
۱۵۱	آخری شعر	؍؍	حمیر	خمیر
۱۵۷	۶	؍؍	کام کی	کام کے
۱۵۸	۶	اوّل	پردودر	پردہ درِ
۱۶۱	۴	؍؍	مقدسِ ہند	مقدس ہند
۱۶۲	۵	ثانی	کہ آئینہ	کہ اک آئینہ
۱۶۳	۷	اوّل	قرآن	قرآں

صفحہ	شعر	مصرعہ	غلط	صحیح
۱۶۶	۸	ثانی	کالعد	کالبد
۱۶۷	۱	اوّل	سزاوا	سزاوار
۱۷۳	۲	″	رُدُر	رُدْر
۱۷۷	۲	ثانی	زباں	زبان
۱۷۸	۲	″	بہر	بحر
۱۸۰	۹	″	الحق	انا الحق
″	۱۲	اول	الہند	انہد
″	۱۳	ثانی	ہے جائز	ہے وہ جائز
۱۸۱	۷	″	وجودِ	وجود
۱۸۴	۱۰	اول	عالم پر	عالم پہ
″	۱۲	″	قوم پر	قوم پہ
۱۸۷	۵	ثانی	جلوہ گا	جلوہ گاہ
۱۹۰	۴	″	مزاجِ	مزاج
۱۹۳	عنوان نظم		دنیوی فقیر	دنیوئے فقیر
۱۹۵	۲	اوّل	رادنیاز	راہِ نیاز
۱۹۶	۱۰	″	دھجباں	دھجیاں
۲۰۱	۱۰	ثانی	گردرہِ	گرد رہ
۲۰۲	۹	اوّل	آکاش	آکاش شہ
۲۰۲	۲	″	اوشا	اوشا
۲۰۳	۲	″	منظ	منظر
۲۰۴	۱۱	″	بادۂ نوش عمل	بادہ نوشِ عمل
۲۰۵	۴	″	ترزبان	ترزباں
۲۰۷	۶	″	دردوکم	دردوغم
۲۲۰	۱	ثانی	آسمان	آسماں

صفحہ	شعر	مصرعہ	غلط	صحیح
۲۲۲	۱	اوّل	دل تگ	دل تنگ
۲۲۴	۶	ثانی	حقیقت	حقیقت میں
۲۲۸	۳	اوّل	سے	ہے
۲۳۲	۹	″	جنوں	جنونِ
″	۱۲	″	جنوں	جنونِ
۲۳۶	۵	″	تجھے	مجھے
۲۳۷	۸	″	نقرۂ زر	نقرہ و زر
۲۴۰	۶	″	آگ گو اس سے سلگتی رہی رہی	مشتعل گو آگ سی اس کی رہی
۲۴۲	۹	″	آکر	آکے
۲۴۴	۴	″	پہ	پر
″	۶	″	گرزتی	گزرتی
″	۷	ثانی	خمیارہ	خمیارہ
۲۴۶	۳	″	ذراو نزی	ذرا نزہی
۲۴۶	۵	اوّل	علیحدہ ہوئے	الگ الگ رہے
″	″	ثانی	اُس	اُن
۲۴۷	۱	ثانی	گنہگار	گناہ گار
۲۴۷	۹	اوّل	نگاہوں	آہوں
″	۱۱	ثانی	لکھی	لکھی
۲۵۳	۴	اوّل	زمانِ آخرت میں	زمانِ آخرت
۲۵۶	۶	″	چڑیاں	چڑیاں ملیں
۲۵۷	۶	″	شہریار	شہر و دیار
۲۶۰	۱	″	مُہرِ خامشی	مُہر خموشی
″	۱۲	ثانی	اشکِ	اشک
۲۶۱	۲	اول	رُوے	روے
″	۹	ثانی	زندکی	زندگی

صفحہ	شعر	مصرع	غلط	صحیح
۲۶۸	۱	اوّل	آئے جاتے	آتے جاتے
؍؍	۱۰	ثانی	میری	مری
۲۶۹	۸	؍؍	گھر بھر کر	گھر بھر کی
؍؍	۱۱	اوّل	تیوری پر	تیوری پہ
؍؍	۱۲	؍؍	بھُولی بھُولی	بھولی بھولی
۲۷۶	۳	؍؍	اکلیس	اکلیل
۲۸۰	۳	؍؍	میری	مری
؍؍	۴	ثانی	سونپ دیں	سونپ دوں
۲۸۲	۷	اوّل	مجھ	تجھ
۲۸۳	۲	ثانی	جہاں نایاب	جہانِ نایاب
۲۸۴	۴	اوّل	طالب	طلب
۲۸۷	۸	ثانی	رہنا	رہتا
۲۸۸	۴	اوّل	تن ویدیاں	رتن ویدیاں
۲۸۹	۱	؍؍	آمدار	آبدار
۲۹۰	۱۳	ثانی	بساہو جو دلفریب	بناہو جو دلفریب
۲۹۱	۷	؍؍	ملاہوا ہو	ہو ملا ہوا
۲۹۱	۱۱	اوّل	بُر بہار	پُر بہار
۲۹۲	۷	اوّل	فزونی جمال	افزونی جمال
۲۹۳	۱۳	ثانی	حود پرست	خود پرست
۲۹۳	۱۴	اوّل	جن کے	جس کے
۲۹۴	۱۲	ثانی	انسان	انساں
۲۹۴	۱۵	؍؍	قدر گہر خاک ہو	قدر گہر ہو خاک
۲۹۹	نثر کی پہلی لائن		ملک شعار	ملک الشعرا
۲۹۹	شعر ۶	مصرع ثانی	رام شنکر	رام شنکر

صفحہ	شعر	مصرع	غلط	صحیح
۳۰۰	۲	ثانی	نیم جان	نیم جاں
۳۰۱	۱	اوّل	مخز	فخر
۳۰۱	۲	ثانی	مزج	مزاج
۳۰۱	۱۱	اوّل	قدرداں	قدر دانِ
۳۰۲	۵	ثانی	واکا	واکیا
۳۰۴	۸	؍؍	سوے	ہوے
۳۰۶	۷	؍؍	زباں پر	ہر زباں پر
۳۱۰	۴	؍؍	انساں کا منھ	انساں کے منھ
۳۱۱	۱۰	اوّل	مال کا	مال
۳۱۱	۱۱	؍؍	زیں	زمیں
۳۱۱	۱۵	؍؍	جس کو اسی نے	جس نے اُسی کو
۳۱۲	۱	اوّل	خفقان	خفقاں
۳۱۲	۳	ثانی	عنوان	عنواں
۳۱۳	۴	؍؍	وقف	وقف
۳۱۳	۴	اوّل	برق	برق
؍؍	؍؍	ثانی	غوث	غوث
۳۱۳	۴	ثانی	مدن	بدن
۳۱۳	۶	اوّل	بجود	بجود
؍؍	؍؍	؍؍	سائل	سائل
۳۱۴	۶	ثانی	روشن	روش
۳۱۶	۷	؍؍	غرا	عزا

تمام شد

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

عرضِ صادق

بخشندۂ کُل کے حضور میں

نہ کام آئے کسی کے اگر حیات مری
اگر ہو ننگِ خلائق جہاں میں ذات مری

اگر مجھے روشِ ارتقا پسند نہ ہو
مرے وجود کا معیار اگر بلند نہ ہو

مرا اصول جو دُنیا میں شاندار نہ ہو
مرا سلوک جو دنیا کو سازگار نہ ہو

زبان و دل میں نہ یارب مطابقت ہو اگر
نہ قول و فعل میں باہم موافقت ہو اگر

کبھی جو کام میں جذبِ وفا سے لے نہ سکوں
جو اپنی جان مفادِ دگر پہ دے نہ سکوں

اگر نہ ہو دل وحدت شناس سینے میں
جو نورِ حق کا نہ ہو انعکاس سینے میں

جو میری عمر گذرتی ہو خود پرستی میں
گِرا رہا ہوں اگر روح کو میں پستی میں

متاعِ جلد ہو برباد میری ہستی کی
گھٹا دے شوق سے میعاد میری ہستی کی

جو ماہ و سال بچیں گھٹ کے اس طرح فاضل
جو اس حساب سے باقی ہو کچھ تجھے حاصل

وہ اُس وجود کی میعاد میں بڑھا دینا
وہ اس حیات کی توسیع میں لگا دینا

جو سوئے ملکِ عدم مائلِ عزیمت ہو
مگر زمانہ کو جس کی بڑی ضرورت ہو

ہزار کام بگڑتے ہوں جس کے مرنے سے
ہوں لاکھ حشر بپا جس کے کوچ کرنے سے

علو مقصد ہستی ہو مدعا جس کا
ہو درد اہل جہاں سے دل آشنا جس کا

بہائے جوہر ایثار سے جو واقف ہو
کشادِ روح کے معیار سے جو واقف ہو

ہو قول جس کا مقدس عمل ہو جس کا پاک
ہو ناتمامی مقصد سے جس کا سینہ چاک

اجل پہ جس کی اجل دل ہی دل میں پچھتائے
سر اپنا ہر کہ ومہ کوہ وغم سے ٹکرائے

بقا سے جس کی ہو وابستہ سینکڑوں کا وجود
فنا سے جس کی ہوں آثار زندگی نابود

دہلی سنہ ۱۹۲۹ء مطبوعہ زمانہ

میری بہشت

کیوں گلشن وجود لطافت اثر نہ ہو
ڈوبی ہوئی جمال میں اپنی سرشت ہے

سیراب روح سے ہے خیابانِ زندگی
رشتہ مگر یہ رشتۂ دہقان و کشت ہے

دیتا ہے مجھ کو درسِ فنا یہ مطالعہ
میری نظر ہے اور مری سرنوشت ہے

محوِ طواف جلوہ گہ جاں ازل سے ہوں
کعبہ یہی مرا یہی میری کنشت ہے

کرتا ہوں روز و شب میں اسی گل زمیں کی سیر
دُنیا مرے خیال کی مجھ کو بہشت ہے

لکھنؤ ۱۹۳۸ء

مُحبّت کا مذہب

ہے اک پاک عالم محبّت کی دنیا ہے یہ ایک عیش و مسرّت کی دنیا
یہ کثرت کی دنیا یہ وحدت کی دنیا حقیقت میں ہو اک حقیقت کی دنیا

طریق پرستش یہ اعلیٰ ہے سب سے
محبّت کا مذہب نرالا ہے سب سے

نہ جدّت ہے اہلِ شریعت کی اس میں نہ دقّت ہے راہِ طریقت کی اس میں
نہ حاجت کسی کی اطاعت کی اس میں ضرورت نہ شغل و ریاضت کی اس میں

طریق پرستش یہ اعلیٰ ہے سب سے
محبّت کا مذہب نرالا ہے سب سے

یہی ایک مسلک ہے جو قدرتی ہے اسی ایک مشرب میں اصلی خوشی ہے
یہی دین اک قابل پیروی ہے جو سمجھو تو یہ بات ایمان کی ہے

طریق پرستش یہ اعلیٰ ہے سب سے
محبت کا مذہب نرالا ہے سب سے

یہی دین ہے وہ یہی ہے وہ ایماں نہیں جس کی ایجاد میں دخل انساں
نہ تفریق و تمیز کا اس میں امکاں نہ افراط و تفریط سے یہ پشیماں

طریق پرستش یہ اعلیٰ ہے سب سے
محبت کا مذہب نرالا ہے سب سے

کوئی اس پہ کیا خاک اُنگلی اُٹھائے بھلا کیا کوئی عیب اس میں بتائے

کبھی اس پہ ممکن نہیں حرف آئے نہیں اس کو معلوم اپنے پرائے

طریقِ پرستش یہ اعلیٰ ہے سب سے
محبّت کا مذہب نرالا ہے سب سے

نہ کچھ ابتری ہو نہ کچھ برہمی ہو بسر امن سے چین سے زندگی ہو
طبیعت کو حاصل حقیقی خوشی ہو ہمیشہ اسی کی اگر پیروی ہو

طریقِ پرستش یہ اعلیٰ ہے سب سے
محبّت کا مذہب نرالا ہے سب سے

اب آؤ یہ دنیا کے جھگڑے چکا دیں یہ تفریق و تمیز دل سے مٹا دیں
محبت کے مذہب کا سکّہ چلا دیں سرورِ حقیقی کی لذّت چکھا دیں

طریقِ پرستش یہ اعلیٰ ہے سب سے
محبّت کا مذہب نرالا ہے سب سے

نہ کوئی یہودی نہ کوئی نصارا ہو بس ایک مذہب ہمارا تمہارا
محبّت کی تنویر ہو عالم آرا دکھائے یہ وحدت کا ہم کو نظارا

طریقِ پرستش یہ اعلیٰ ہے سب سے
محبت کا مذہب نرالا ہے سب سے

نہ مسجد میں جائیں نہ مندر میں جائیں قدم اب نہ گرجا کی جانب اُٹھائیں
محبّت کو معبود اپنا بنائیں مسرّت کے عالم میں یہ راگ گائیں

طریقِ پرستش یہ اعلیٰ ہے سب سے
محبّت کا مذہب نرالا ہے سب سے

سنہ ۱۹۲۹ء مطبوعہ تیج دہلی

شاعر کا دل

نہ کیوں شاعر کا دل ہم مرتبہ ہو ماہِ تاباں کا
کہ اس میں موجزن ہی اک سمندر آبِ حیواں کا

اگر رکھتا دلِ شاعر کی دنیا میں قدم اپنا
سکندر کو نہ ہوتا رنج ہرگز خونِ ارماں کا

یہ دل اک مسکن آزادی و عیشِ دوامی ہے
یہی ہے عشق کا منبع یہی ہی مصدر ہے عرفاں کا

عروسِ فکر سے اٹھکھیلیوں میں محو رہتا ہے
پھرا کرتا ہے منظر اس کی آنکھوں میں شبستاں کا

اسی سے عشق کے جذبات میں ہیں گرمیاں پیدا
بڑا ہے مرتبہ اس کی بدولت حسنِ جاناں کا

دل شاعر کا ہے اک قطرۂ خوں شعر پُر معنیٰ
یہ اک دلچسپ مجموعہ ہے اجزائے پریشاں کا

کبھی اُڑتا ہے یہ ہمراہ پروانے کے محفل میں
کبھی جل بُھن کے بن جاتا ہی جزو اک شمعِ سوزاں کا

کبھی اس میں نظر آتی ہے رنگینی گلستاں کی
کبھی گوشہ یہ بن جاتا ہے اک صحرا کے داماں کا

غرض اس دل کی ہستی بھی عجب پر لطف ہستی ہی
تموّج خاصیت اس کی ہے فطرت اس کی مستی ہی

یہ وہ دل ہے کہ ٹکڑے آسماں پر جس کے تاباں ہیں
زمیں پر اس کے ذرّات تجلّی خیز رقصاں ہیں

یہ وہ دل ہے جسے اہلِ نظر سے داد ملتی ہے
فرشتے عرش اعظم پر اسی دل کے ثنا خواں ہیں

یہ وہ دل ہے مسیحا کے بھی دل میں درد ہی جس کا
یہ وہ دل ہے تصدّق جس کے استغنا پہ سلطاں ہیں

اسی دل کی بدولت مذہبوں میں جان باقی ہے
اسی کے "تارِ رگ" سے منسلک اجزائے ایماں ہیں

یہی وہ دل ہے بزمِ مطربانہ جس سے پیدا ہے
اسی دل کے ترانے ساز کے پردوں میں پنہاں ہیں

اسی دل سے ہوا ہے ہیبت افزا جنگ کا نعرہ
اسی کے دبدبے سے رستم و سہراب لرزاں ہیں

اثر میں ڈوب کر اشعار نکلے ہیں جو اس دل سے
سناں ہیں تیغ تابشناک ہیں تیر و پیکاں ہیں

جنہیں کہتے ہو تم شاعر پیمبر ہیں وہ قدرت کے
انھیں فوق البشر سمجھو جو قسمت سے سخنداں ہیں

حقیقت آشکارا ان پہ ہے امروز و فردا کی
تجلی ان کے سینے میں نہاں ہے طور سینا کی

منورؔ مجھ کو اپنے دل پہ دائم ناز رہتا ہے
کہ یہ ساز نفس پر زمزمہ پرداز رہتا ہے

گزرتے ہیں مرے ایام اک مستی کے عالم میں
مرا دل چپکے چپکے مائل اعجاز رہتا ہے

سفر میں اپنے دل کو میں عدم سے ساتھ لایا ہوں
یہی ہر وقت میرا ہمدم و ہمراز رہتا ہے

کبھی غفلت نہیں ہوتی سماع کوس رخصت میں
ہمیشہ کوچ کو یہ گوش بر آواز رہتا ہے

نہیں لگتی ہوا اس کو زمانے کی
ریا سے دور تر آزاد حرص و آز رہتا ہے

فرشتے بھی جہاں اُڑنے کو جنت میں ترستے ہیں
وہاں بے بازو و پر مائل پرواز رہتا ہے

یہ بت خانہ بھی ہے کعبہ بھی اس کو لوگ کہتے ہیں
در اس کا مومن و کافر پہ یکساں باز رہتا ہے

نہیں حالانکہ میں شاعر مگر یہ دل بنا دے گا
مجھے یہ شعر کا اک عاشق کامل بنا دے گا

مطبوعہ شیو شنبھو لاہور

کشمکش

ممکن نہیں وجودِ بشر کشمکش بغیر
ہو عازمِ فرار نہ قصدِ گریز کر

مرنا نہیں مقدّرِ اربابِ جاں سپار
جینا جو ہے تو حوصلۂ رستخیز کر

گرمی اُبھار بزم کے ساماں سے رزم کی
ہاں نوشِ جاں پیالۂ صہبائے تیز کر

ہر بوند اس لہو کی بنے برق شعلہ پاش
افزوں وقارِ دیدۂ خوننابہ بیز کر

آمادۂ مصاف ہو شورِ بزن کے ساتھ
سر دے کے احترامِ صدائے بریز کر

اب کچھ تجھے تلافیٔ غفلت بھی چاہیئے
باقی ہے جتنی عمر نثارِ ستیز کر

تیرے لئے حیات کا دامن نہ تنگ ہو
دعویٰ زندگی ہے تو مصروفِ جنگ ہو

لکھنؤ ۱۹۳۸ء مطبوعہ زمانہ کان پور

مُسکراہٹ

تمام نور علیٰ نور بن رہی ہے یہ
ردائے صبح سے کیا چیز چھن رہی ہے یہ

لبِ افق پہ سنہری لکیر کیسی ہے؟
لکیر میں بھی یہ پرواز تیر کیسی ہے؟

کلی کلی یہ سراپا نگار کس سے ہے؟
کھنچی چمن میں شبیہ بہار کس سے ہے؟

یہ موج کس کی ہے دریاؤں کے کناروں میں؟
مہک رہی ہے یہ کیا چیز سبزہ زاروں میں؟

یہ بجلیوں کی تڑپ میں ظہور کس کا ہے؟
یہ بادلوں کی سیاہی میں نور کس کا ہے؟

رواں ہیں نور کی لہریں جبیں پہ یہ کس سے؟
چھٹک رہے ہیں ستارے زمیں پہ یہ کس سے؟

یہ کس سے نقشِ محبت کو رنگ ملتا ہے؟
دلِ حیات کا گہوارہ کس سے ہلتا ہے؟

جھکاؤ شمع کی لَو میں ادھر اُدھر کیوں ہے؟
لبِ ہلال کی سُرخی یہ چرخ پر کیوں ہے؟

یہ کیوں شگافِ دہانِ صدف پہ رونق ہے؟
یہ کیوں چمن میں گلِ زر بکف پہ رونق ہے؟

یہ کیا ہے ساز سے نغمہ جو بن کے پیدا ہے؟
یہ کیا ہے جو لبِ تصویر سے ہویدا ہے؟

یہ کس کا عکس ہے تلوار کے خم و چم میں
ادا یہ کون سی قاتل ہے زلفِ برہم میں؟

یہ تازگی ہے لبِ شیر خوار میں کس سے؟
پڑی ہے جان یہ حُسن نگار میں کس سے؟

شفق میں برقِ طپاں کی شرارتیں کیوں ہیں؟
رگوں میں غنچہ و گل کی حرارتیں کیوں ہیں؟

یہ راز کیا ہے ستاروں کی جگمگاہٹ کا
عیاں ہر ایک سے پہلو ہے مُسکراہٹ کا

مطبوعہ تیج دہلی ۱۹۳۸

صلائے عام

سبق نشیب و فراز جہاں یہ دیتا ہے
کہ آنکھ کھول کے دنیا کی رہگذر میں چلو

اگر ہر ایک کو ہر طرح شاد رکھنا ہے
رہو نظر میں نظر میں بسو نظر میں چلو

پڑے جو سر پہ مصیبت کرو خوشی سے قبول
برنگ مرد جری راہ پُر خطر میں چلو

نہ جائے ہاتھ سے جوہر خود اعتمادی کا
چلو کبھی نہ مگر غیر کے اثر میں چلو

حرم کو جاؤ تو رستے سے دیر کے جاؤ
دعائیں لے کے بتوں کی خدا کے گھر میں چلو

قدم قدم پہ تمہارے ہیں مُشکلیں حائل
سنبھل سنبھل کے منور بہت سفر میں چلو

حنا

رہا نہ راز جو تھا راز سبز باغِ حنا — مشامِ جاں میں ہوا منتقل داغِ حنا
نظر نوازِ مہ و خور ہے رنگ داغِ حنا — بساطِ حسن میں کوندے اُٹھا چراغِ حنا

ریاضِ دوست کھِلا دعوتِ نظر کے لیے
پیامِ عیش ملا فرحتِ جگر کے لیے

شرارِ آتشِ گُل دستِ نازنیں میں نہیں — شکارِ مُرغِ حنا پنجۂ حسیں میں نہیں
یہ رنگِ خونِ وفا دیدۂ یقیں میں نہیں — جگہ کہیں بھی اسے چشمِ عیب بیں میں نہیں

چڑھا ہے رنگِ عملِ اشتیاقِ تزئیں پر
مہک رہا ہے گلستاں کفِ نگاریں پر

نگاہِ ناز ہوئی منزلت فزائے حنا — شفق فلک پہ نہیں ہے یہ فرشِ پائے حنا
نشانِ سرخ میں ہے شوخیِ ادائے حنا — اِس آئینہ سے ہوئی آئینہ بہائے حنا

یہ ہے وہ نقش جو تصویرِ سوز و ساز نہیں
ہے جاں نواز اثر میں یہ جاں گداز نہیں

وفاشناس نہ ہو، قدرِ دوستی نہ کرے — ثنائے برگِ حنا خواہ آدمی، نہ کرے
بنا کے چُور اسے بے وقار بھی نہ کرے — یہ بے خطا ہے اسے مُتّہم کبھی نہ کرے

وفا کا رنگ نقوش جفا میں بھرتی ہے
یہ روح اپنی حسینوں کو نذر کرتی ہے

چراغ بن کے یہ روشن ہے دستِ رعنا میں — تجلّیٔ مہِ نو اس سے ہے کفِ پا میں
عجیب چیز حنا بھی ہے باغِ دنیا میں — طراوت اس سے ہے پیدا دلِ مسیحا میں

اِسی کا رنگ نمایاں جمال میں دیکھا
کسی حسیں کو جہاں برشگال میں دیکھا

دہلی

بجلی کی روشنی اور پروانہ

(ایک منظر دیکھ کر)

یہ عشق بے مزہ اے پروانہ کس لئے ہے
عقل و خرد سے اتنا بیگانہ کس لئے ہے

کیوں بے قرار ہو کر ناحق لپک رہا ہے
شیشے کے قمقمے پر کیوں سر پٹک رہا ہے

کیوں جوش عاشقی میں ہر شے سے بے خبر ہے
محفل نہیں یہ کوئی اک عام رہگزر ہے

ناکام ہی رہے گا یہ اشتیاق تیرا
غافل اُڑا رہی ہے دنیا مذاق تیرا

اس رہگزر میں تیرا ہمدم نہیں ہے کوئی
فریاد بے زباں سے محرم نہیں ہے کوئی

ممکن نہیں کہ نکلے ارمان تیرے جی کا
کیوں خون کر رہا ہے ناموس عاشقی کا

شیشے کے قمقمے کو تو دیکھتا نہیں کیا؟
ذوقِ نظارہ تجھ میں باقی ذرا نہیں کیا؟

اس قمقمے کے اندر شعلہ سا ہے جو رقصاں
اس میں نہیں ذرا بھی اوصاف شمع سوزاں

ہے اس کی روشنی کا کچھ اور ہی قرینہ
ہستی ہے اس کی دائم محتاج آبگینہ

اندر جو قمقمے کے پردہ نشیں نہ ہوتی
بجلی کی روشنی یہ ظاہر کہیں نہ ہوتی

سر پھوڑ کر یہ مانا پردے کو دور کر دے
شیشے کا قمقمہ یہ تو چُور چُور کر دے

بے پردگی کی حالت مانا کہ یہ ہوئی بھی
باقی نہیں رہے گی لیکن یہ روشنی بھی

پورا کبھی نہ ہوگا شوقِ وصال تیرا
تجھ کو ستا رہا ہے ناحق خیال تیرا

اندر بھی جا کے دامن ارماں کا چاک ہوگا
باہر سے بھی میسّر تجھ کو نہ خاک ہوگا

ہے کچھ خبر تجھے دل کس کے لئے ملا ہے؟
اُس کے لئے بلا ہے جس کے لئے ملا ہے؟

لاہور مطبوعہ سنہ ۱۹۲۷ء

تائیدِ وقت

ہم جو سامنے آئے وہ سر کئے جاؤ
نظر ہو جانب منزل سفر کئے جاؤ

خدا ضرور تمہیں داد حوصلہ دے گا
جو فرض ہے وہ ادا بے خطر کئے جاؤ

نکل رہے ہیں جو آنکھوں سے آگ کے شعلے
اُنہیں چراغ سر رہگزر کئے جاؤ

اُتر چکا ہے نظر سے جو زندگی کا نظام
طریقِ نو سے اُسے منتشر کئے جاؤ

جو کہنگی سے تمہارے ہی سر پہ گرتے ہیں
سپردِ خاک وہ دیوار و در کئے جاؤ

یہ انتشار کبھی باعثِ سکوں ہوگا
بساطِ دہر کو زیر و زبر کئے جاؤ

چمن میں ننگِ نشیمن جو خار و خس ہیں انہیں
سپرد شعلۂ برقِ نظر کئے جاؤ

تم اپنے فرض سے غافل رہے تو ٹھیک نہیں
جو بے خبر ہیں اُنہیں باخبر کئے جاؤ

سُنا سُنا کے منوّر کلام درد انگیز
نثار قوم پہ خونِ جگر کئے جاؤ

لکھنؤ ۱۹۳۸ مطبوعہ اودھ اخبار

مُستقبل

تجھ سے مرعوب ہیں کیوں لوگ بہت مُستقبل | جب یہ ظاہر ہے کہ اک وقت کا صیغہ تو ہے
حیرت انگیز عبث ہے یہ خموشی تیری | اہلِ دنیا کے لئے ایک معمّہ تو ہے
برتری اپنی بصد ناز جتانے کے لئے | اپنے حالات پہ ڈالے ہوئے پردہ تو ہے
تھک گئے کان ہمارے یہی سُنتے سُنتے | حل نہو پائے کسی سے جو وہ عقدہ تو ہے

کیوں مُسلّط ہے جن و انس پہ ہیبت تیری
آج ہم فاش ہی کردیں گے حقیقت تیری

کور باطن کے لئے مخزنِ اسرار ہے تو | صاف باطن کی نظر سے نہیں لیکن پنہاں
حال اک آن میں بن جائے گا مستقبل سے | اور ہو جائے گی ہم پر تری تعبیر عیاں
پھر تجھے حال سے ماضی کا ملے گا جامہ | اپنی توقیر و فضیلت پہ یہ کیوں ہے نازاں
عہد ہو جائے گا ہر دل سے فراموش ایسا | زیب دے گا ترا قصّہ سرِ طاقِ نسیاں

ہم سمجھتے ہی نہیں خاک حقیقت تیری
حال و ماضی سے زیادہ نہیں وقعت تیری

مطبوعہ تیج دہلی ۱۹۲۹ء

نوروز

مردم دیدۂ ارباب یقیں ہے نوروز	پیکر سال مسیحی کی جبیں ہے نوروز
خاتم حلقۂ دوراں کا نگیں ہے نوروز	بڑھ کے ہر روز سے عظمت میں کہیں ہے نوروز

بن مریم کی ہے بیدار نصیبی اس سے
ہیں عیاں جوہر تہذیب صلیبی اس سے

دم عیسیٰ سے ہے وابستہ بہار نوروز	قم باذنی کی صدا پر ہے مدار نوروز
ہے کرسمس کی فضا آئینہ دار نوروز	کرے کس منھ سے بیاں کوئی وقار نوروز

دن یہ دلکش صفت عید پس عید آیا
باندھنے کے لئے ٹوٹی ہوئی اُمید آیا

صبح میں اس کی صباحت نظر آتی ہے مجھے	اس عبارت میں فصاحت نظر آتی ہے مجھے
شام میں اس کی ملاحت نظر آتی ہے مجھے	اس کے نظارے میں راحت نظر آتی ہے مجھے

سرخی سر ورق باب طرب ہے نوروز
کرم خاص الٰہی کا سبب ہے نوروز

سحر اس کا ہے کہ اعجاز مسیحائی ہے	خلق آج اس کے مناظر کی تماشائی ہے
گلفشاں مجمع ارباب کلیسائی ہے	فوج میں اس کی سلامی کو صف آرائی ہے

اس کی عزت پہ سلاطین و گدا دونوں ہیں
اُٹھتے ہیں دست دعا بہر دعا دونوں ہیں

یہ جو آیا تو مسرت کا زمانہ آیا	ہاتھ اک جشن منانے کا بہانہ آیا
سال نواب کے باندازِ یگانہ آیا	خیر مقدم کو زباں پر یہ ترانہ آیا

شجر انیست کہ گلہائے طرب می بارد
دامنش گوہر شہوار فراغت دارد

دہلی مطبوعہ تیج دیگلی سنہ ۱۹۳۵ء

طلوعِ سحر

ایک دنیائے تجلّی ہے تہ بازوئے شب بن گیا کافور صورت نافہ آہوئے شب
نور کے دریا میں لہرانے لگے گیسوئے شب روز روشن بن گیا آئینۂ پہلوئے شب
قافلہ کا قافلہ گو اب نظر سے دور ہے
گردِ راہِ ماہ و اختر سے فضا معمور ہے
شاہدِ قدرت کی انگڑائی نے حیراں کردیا عالمِ رویا کا شیرازہ پریشاں کردیا
جلوہ گاہ شرق کو خورشید عنواں کردیا چشمۂ نور ازل کو دجلہ ساماں کردیا
ہر شعاع مہر مصروف قلم کاری ہوئی
پردہ ہائے چشم پر منقوش بیداری ہوئی
ابلق ایام کا کچھ پاؤں ایسا پڑگیا ماہِ تاباں کا فلک پر رنگ پھیکا پڑگیا
ماند تنویرِ سحر سے ہر ستارا پڑگیا شپّروں پر بازوئے عنقا کا سایا پڑگیا
خامشی ہے سحر فرما شور برقِ انداز پر
طائر خورشید تولے ہے پلے پرواز پر
نور جس کا جلوہ گُستر گلشن وصحرا میں ہے نغمہ پردازی کا جس کی غلغلہ دنیا میں ہے
آگ سی جس نے لگادی چادر دریا میں ہے بھیروی ترشول دست نازک اوشا[1] میں ہے
وسعت ارض وسما میں شان سے استادہ ہے
اس کی نورانی ادا کا اک جہاں دلدادہ ہے

[1] اوشا نور کے تڑکے کی جو دلکش اور خاموش فضا ہوتی ہے سنسکرت کے شعرا نے اسے اُوشا کے نام سے موسوم کیا ہے ۔

اک سکوتِ جاں فزا ہے مثلِ تصویر آشکار ہوگئی ذرّات پنہانی کی تنویر آشکار
شرق سے والشمس کا ہے حُسنِ تحریر آشکار چہرۂ گیتی پہ ہے رنگِ طباشیر آشکار
رونما طوفان شب بھر کی خموشی سے ہوا
سرد دریاؤں کا پانی گرمجوشی سے ہوا

کھل گئی ہے دو دلوں پر رسم و راہِ التفات خلق نے اندیشۂ رہزن سے پائی ہے نجات
سُرمہ آلودہ تھی رنگِ شب سے چشمِ کائنات لائی ہے شبنم طہارت کے لئے آبِ حیات
باغِ جنت کی ہوائیں سحر دم کرنے لگیں
اہلِ عالم کی رگوں میں بجلیاں بھرنے لگیں

یہ سماں وہ ہے کہ قائم لطفِ دنیا جس پہ ہے یہ سماں وہ ہے کہ بُنیادِ تمنّا جس پہ ہے
یہ سماں وہ ہے کہ مفتوں چشمِ بینا جس پہ ہے یہ سماں وہ ہے کہ خود خالق بھی شیدا جس پہ ہے
منتخب لمحاتِ یزدانی[۱] کا اک مصدر ہے یہ
جو رقم ہے خطِ نورانی میں وہ دفتر ہے یہ

اک نشاطِ روح پرور صبح کے منظر میں ہے اک نئی تحریک کا آغاز دنیا بھر میں ہے
کس قدر اظہارِ سرگرمی کا بحر و بر میں ہے سر بہم زندگانی ہو یہ سودا سر میں ہے
اس قدر بالیدگی اتنا نمو کا جوش ہے
سبزہ خوابیدہ جو تھا وہ بھی سراپا ہوش ہے

مرد و زن اِذن نسیمِ روح پرور سے اُٹھے کھولدیں آنکھیں ہوئے بیدار بستر سے اُٹھے
پاؤں سیرِ صبح گاہی کے لئے گھر سے اُٹھے ولولے دل میں طلوعِ مہرِ انور سے اُٹھے
روح کو تسکیں ہوئی حاصل مسرّت چھا گئی
کاروبارِ زندگی میں جانِ تازہ آگئی

[۱] لمحاتِ یزدانی مراد ہے برہمہ مہورت سے۔

مُطربہ سے

مُطربہ! روک ہاتھ ساز نہ چھیڑ
نغمہ ہائے جگر گداز نہ چھیڑ

میں ہوں شاعر مری حریف نہ بن
رہزنِ جذبۂ لطیف نہ بن

شام کے وقت کوئی راگ نہ گا
بھڑک اُٹھے گی دل کی آگ۔ نہ گا

تو ہو صحرا میں یا ہو گلشن میں
بجلیاں بھر نہ اس نشیمن میں

ایک پردا بھی تو جو چھیڑے گی
بخیہ ہائے جگر ادھیڑے گی

چھین لے گی مری متاعِ سکوں
آہ وہ منظرِ وداعِ سکوں

مرتعش ہر رگِ جنوں ہوگی
شاملِ سازِ ارغنوں ہوگی

ساز چھڑتے ہی دل بھر آئے گا
ذرّہ ذرّہ پسیج جائے گا

اشک خونیں بہیں گے آنکھوں سے
رخ پہ ڈھل کر رہیں گے آنکھوں سے

قند گھولے گی جب زبان تری
کھینچ لے گی جگر کو تان تری

ہے قیامت الاپنا تیرا
اُف وہ گردوں کو ناپنا تیرا

جدھر اپنے گلے کو موڑے گی
تو جہاں اپنی تان توڑے گی

نہ پنپ پاے گی کہیں میرا
خون ہو جاے گا وہیں میرا

دہلی - ۱۹۳۸ء

بسنت

(سنسکرت شاعری کا لطیف تخیل)

یہ کون ہاتھوں میں آج اپنے کماں گلوں کی لئے ہوئے ہے — یہ کس پہ تیر افگنی کا یارب کوئی ارادہ کئے ہوئے ہے
تبسم افشاں نظر جھکائے لبوں کو اپنے سے ہوئے ہے — ہیں مست و مخمور ایسی آنکھیں شراب گویا پئے ہوئے ہے
غضب کی طفلانہ شوخیاں ہیں لئے ہے ساتھ اپنے بانکپن کو — کیا ہے جائے لباس کس نے قبول عُریانی بدن کو
نہ تابشیں بخت مہر میں یہ ضیا میسر نہ یہ قمر کو — چڑھا کے زاغ کمانِ ابرو بزن کا ارشاد ہے نظر کو
جدا کیا ایک شعبدے میں یہ کس نے فریاد سے اثر کو — چھپائے کیا دل کا حال کوئی بچائے کیسے کوئی جگر کو
حجاب کی خیر اب نہیں ہے نقاب اُتری ہوئی ہے سر سے — چلے ہی آتے ہیں تیر و خنجر کبھی اِدھر سے کبھی اُدھر سے
حجاب بے بس، شباب عاجز، خراب حالت، کباب ہے دل — اسیر صد پیچ و تاب ہے دل، مرقع اضطراب ہے دل
سوال درپیش ہے کچھ ایسا کہ یک قلم لاجواب ہے دل — کسی کی مشق ستم گری کو نشانہ انتخاب ہے دل

یہ کون آخر پکارتا ہے یہ کون آخر اُبھارتا ہے
سدھے ہوئے ہاتھ ہیں یہ کس کے کہ تیر پر تیر مارتا ہے

دہلی - مطبوعہ کنول آگرہ

انسانی قالب

ہے بشر عقل تری لائقِ تبدیل، بدل
اپنے ماحول کی ترکیب کے اجزا کو سنبھال
چھوڑ فرسودہ عقائد، رخِ تخئیل بدل
اپنے حالات کی بگڑی ہوئی دنیا کو سنبھال

آشکارا ہی نہیں تجھ پہ حقیقت اپنی
آج تک تو نے جو سمجھا ہے غلط سمجھا ہے
دیکھ آئینۂ شفاف میں صورت اپنی
خود کو اک خاک کا پتلا ہی فقط سمجھا ہے

تری ہستی نہیں تحقیر کے قابل ہرگز
عارضی گرچہ زمانے میں ہے قالب تیرا
کہ نہیں کوئی بھی شے اس کے مقابل ہرگز
جوہرِ روح ہے پر عنصرِ غالب تیرا

نظر آتی ہی نہیں اس میں کثافت مجھ کو
میں نے سر تا بقدم اس کو منوّر پایا
مست رکھتی ہے مدام اس کی لطافت مجھ کو
مہ و خورشید سے بھی اس کو ہے برتر پایا

اس میں اک نور کی دنیا نظر آتی ہے مجھے
جو ہے بخشندۂ کل اک ہے یہ سوغات اُس کی
ہر رگ و پے متجلّی نظر آتی ہے مجھے
نظر آئے گی تجھے اس میں کرامات اُس کی

جزو اک عالمِ امکاں کا نمایاں ہے یہ
منزلت اس کی ہمیشہ تجھے لازم ہے عزیز
سلکِ تخلیق کا اِک گوہرِ غلطاں ہے یہ
ڈیڑھ دو گز کا یہ ڈھانچہ ہے بڑے کام کی چیز

یہی کعبہ یہی گرجا ہے یہی ہے مندر
غور سے دیکھ اگر وا ہے تری چشمِ یقیں
کسی معبد سے بھی رتبہ نہیں اس کا کمتر
مزرعۂ تخمِ عمل اس کے سوا اور نہیں

جہدِ ہستی کے لئے ہے یہی میدانِ مصاف
تجھے اس رازِ نہانی کی خبر خاک نہیں
جو نہیں یہ تو کہیں بھی نہیں امکانِ مصاف
جسمِ خاکی یہ فقط تیری ہی املاک نہیں

اقتدار اس پہ کچھ ارکانِ وطن کا بھی ہے
جس سے چڑھتے ہیں سرِ بام وہ زینہ ہے یہی
اختیار اس پہ کچھ ابنائے زمن کا بھی ہے
پار اُتر سکتے ہیں جس سے وہ سفینہ ہے یہی

گھر یہ اللہ کا ہے اس کی حفاظت کرنا
کُفر ہے قالبِ خاکی کی مذمّت کرنا

دہلی ۱۹۳۰

بادشاہ غازی الدین حیدر کی نہر

رہرو شوق کی منزل ہے کنار جو میں
جوش وحشت سے نہیں دل ہی مرا قابو میں
خلش خارِ تمنا ہے مرے پہلو میں
جان رکھی ہے کسی پھول کے رنگ و بو میں

دامن شہر میں صحرا کا سماں ملتا ہے
بیٹھ جاتا ہوں وہیں سبزہ جہاں ملتا ہے

بزم قدرت میں دل اک سامع افسانہ ہے
منظر صبح دل افروز کا دیوانہ ہے
امتیازات نمایاں سے یہ بیگانہ ہے
غیرت گلشن رضواں ہے جو ویرانہ ہے

کھیت خطمی کا جہاں پیش نظر ہوتا ہے
کیا بتاؤں تمہیں کیا دل پہ اثر ہوتا ہے

ہے گل سرخ کوئی اس میں تو کوئی گل زرد
چمن خلد بھی آج اس سے لطافت میں ہے گرد
ہے تماشائے نظر معجزۂ موجۂ سرد
شکل درماں کے نظارے سے ہو دل پیکر درد

کہیں گلزار کا منظر کہیں خارستاں کا
ہائے کیا رنگ ہے قدرت کے نگارستاں کا

آگئی دامن صحرا کی ہوا راس مجھے
کیا ہو مستی میں کسی بات کا احساس مجھے
ٹھیکرے اینٹوں کے نظر آتے ہیں الماس مجھے
غیرت تخت سلیماں ہو ہری گھاس مجھے

قائل دلکشی منظر خاموش ہوں میں
کہ یہاں شاہد قدرت سے ہم آغوش ہوں میں

غازی الدین کی بنوائی ہوئی نہر قدیم
تجھ کو میں دور سے کرتا ہوں ادب سے تسلیم

یاد آیا میکہ تھی تجھ میں بہارِ تسنیم　　تجھے برباد جو دیکھا تو مرا دل ہے دونیم
ریگ کو تہ میں تری محوِ روانی پایا
ایک بھی بوند مگر آہ نہ پانی پایا

ایک بھی آہ ادا تجھ میں دل افزا نہ رہی　　شان و شوکت وہ تری دہر میں اصلا نہ رہی
دشت و وادی میں رواں صورتِ دریا نہ رہی　　مائل قند چشیِ لبِ گنگا نہ رہی
منحرف تجھ سے زمانے کو سراسر دیکھا
آبِ رفتہ نے تجھے پھر نہ پلٹ کر دیکھا

یاد آیا میکہ گنگا نے کیا پاک تجھے　　دیکھتا آج ہوں زیر خس و خاشاک تجھے
رنج ہوتا ہے جو پاتا ہوں المناک تجھے　　راس آتی ہی نہیں گردشِ افلاک تجھے
وہ بھی دن تھے کہ فدائی تھا زمانہ تیرا
کس قدر جلد ہوا ختم فسانہ تیرا

۱۹۱۷ مطبوعہ رسالہ "دربار" لکھنؤ

رُباعی

جتنی تری روح پاک و اطہر ہوگی　　جتنی تجھے روشنی میسّر ہوگی
اتنا ہی لطیف تیرا قالب ہوگا　　اتنی ہی خوشی تجھے منوّر ہوگی

بادل

(ابتدائی زمانہ کی ایک نظم)

اے دل دیوانہ زیر دامن کہسار دیکھ
در فشانی کر رہا ہے ابر دریا بار دیکھ
کون تسخیر دو عالم کو ہوا تیار دیکھ
اک نگار ناز کی یہ شوخیِ رفتار دیکھ
یوں سمندر سے فلک پر جھوم کر بادل چلے
کامنی جس طرح کوئی بھر کے گنگا جل چلے

فصلِ باراں جوش پر ہے اور منظر خوشگوار
ایک معنی خیز مستی کر رہی ہے بے قرار
کیوں نہ میں لوٹوں گلستانِ تمنا کی بہار
تھا اسی موسم کا مدت سے چمن میں انتظار
ابر یہ قاصد ہے میرے شاہد نو خیز کا
میں ہوں مجنوں اس کی رفتارِ جنوں انگیز کا

ہوں میں اک نگہت کش باغ و بہار آرزو
کھل رہا ہے سامنے اک مرغزار آرزو
بزمِ الفت میں ہوں میں سرمایہ دار آرزو
آرزو مجھ پر فدا ہے میں نثار آرزو
ہو تسلی اک جھلک سے طالبِ دیدار کو
لطف تلچھٹ ہی سے حاصل ہو لبِ میخوار کو

لکھنؤ۔ مطبوعہ دربار

سیتا ہرن

صحرائے پُر بہار کا نقشہ نظر میں ہے | جنّت ہے جس سے گرد وہ دنیا نظر میں ہے
دامانِ کوہ و ساحلِ دریا نظر میں ہے | بن باسیوں کا مسکنِ زیبا نظر میں ہے
بارانِ فیض رام کی چشمِ کرم سے ہے
حاصل وقار دشت کو خاکِ قدم سے ہے

ترکِ وطن کا دشت نوردوں کو غم نہیں | کچھ چرخ دوں سے شکوۂ جور و ستم نہیں
محرومیِ سریرِ شہی کا الم نہیں | صحرا کسی طرح یہ انہیں گھر سے کم نہیں
سیتا کو پران ناتھ کی سیوا سے کام ہے
لچھمن کو جبہ سائی سے مطلب مدام ہے

ہر وقت وردِ نامِ برادر زباں پہ ہے | خم مثلِ ماہ فرقِ ادب آستاں پہ ہے
قبضہ گرو کے فیض سے تیر و کماں پہ ہے | اک تھرتھری سی چھائی ہوئی آسماں پہ ہے
گذرے اِدھر سے تاب ہوائے اجل نہیں
موجیں یم فنا کی ہیں ماتھے پہ بل نہیں

بن باسیوں کے حُسن کا شہرہ ہے دُور دور | چھایا ہے ذرّہ ذرّہ پہ اک عالمِ سرُور
کرتا ہے کسب مہرِ مُنوّر جبیں سے نُور | ہے اک حیاتِ نو کا ہر اک چیز سے ظہور
پیدا وہ بجلیاں ہیں رُخِ تابناک سے
گرمی سوا ہے شوق کی دیدارِ پاک سے

اک روز سیرِ دشت بہاریں سے شاد کام | سیتا کے ساتھ جلوہ فگن تھے جنابِ رام

اتنے ہی میں کہیں سے اک آہوئے تیز گام خوش رنگ مشک ریز سیہ چشم زرد فام
آ کر دواں دواں کہیں سَن سے نکل گیا
جادو بلا کا جس میں تھا وہ چال چل گیا

سیتا رم غزال سے مسرور ہوگئیں سرمایۂ جمال سے مسرور ہوگئیں
اس سحر خیز چال سے مسرور ہوگئیں صہبائے کیفِ حال سے مسرور ہوگئیں
دل میں جگہ تھی بچّۂ آہُو کے واسطے
مُضطر تھیں ایک فتنۂ دلجو کے واسطے

بولیں یہ ہاتھ جوڑ کے بھگوان رام سے لا دیجئے پکڑ کے ہرن آپ یہ مجُھے
دلچسپیوں کا دشت میں ساماں بہم رہے واری چرن کمل پہ ہوں میں پران ناتھ کے
بس اس کی چال ڈھال سے مسحُور ہوگئی
عرضِ طلب کو اس لئے مجبور ہوگئی

سیتا کی التجا میں تھی کچھ مصلحت نہاں تھا رام کے سوا نہ کوئی اس کا راز داں
صحرا کی مشکلات کا پہلے کیا بیاں پھر جستجوئے صید دواں میں ہوئے رواں
بھائی سے کر گئے یہ تقاضا چلے نہ جائیں
سیتا کو چھوڑ کر کہیں تنہا چلے نہ جائیں

رام اس طرف شکار کے پیچھے رواں ہوئے سرعت وہ تھی کہ چشم زدن میں نہاں ہوئے
ناوک جو تھے کماں میں برق طپاں ہوئے چٹکی سے جس طرف گئے آتش فشاں ہوئے
تھا راکشس بنائے جو صورت غزال کی
نیرنگ اک دکھا کے نیا اور چال کی

سیتا ادھر تھیں بحر تصوّر میں غوطہ زن پیشِ نظر تھے پران پتی کے کمل چرن

آئی کہیں سے اتنے میں اک صوت پُر محن — دوڑو، پڑا ہے وقت چلو بھائی لکشمن
حالت ہے غیر دردِ دروں سے طپاں ہوں میں
دو چار ہی گھڑی کا فقط میہماں ہوں میں
سیتا کے ہوش اُڑ گئے آتش بجاں ہوئیں — سُن کر صدا یہ درد دروں سے طپاں ہوئیں
شیون سمجھ کے رام کا محوِ فغاں ہوئیں — دیور سے اپنے قلب کی یوں ترجماں ہوئیں
شاید پڑی ہے کوئی کڑی پران ناتھ پر
آئی ہے آفت آج بڑی پران ناتھ پر
سوامی پکارتے ہیں لکھن جلد جاؤ تم — جس حال میں ہوں ناتھ یہاں اُن کو لاؤ تم
تکلیف میرے واسطے اتنی اُٹھاؤ تم — بپتا پڑی ہے اب مری بگڑی بناؤ تم
بھائی کا دُکھ بٹاؤ مصیبت کا وقت ہے
اس وقت کام آؤ مصیبت کا وقت ہے
حیرت میں لکشمن تھے کہ یہ ماجرا ہے کیا — کہنے لگے نہیں یہ سری رام کی صدا
ارشاد آپ کا جو میں ٹالوں تو ہے خطا — مانا چرن کمل سے میں کس طرح ہوں جُدا
رگھو بیر کی صدا کا ہے دھوکا جناب کو
چھوڑوں میں کیسے دشت میں تنہا جناب کو
رام اور صرف آہ و بکا ہوں محال ہے — بیکا ہو بال بھائی کا یہ اک خیال ہے
اُن کے مقابلے کی کسی کو مجال ہے؟ — شاید یہ راچھسوں کی شرارت ہے چال ہے
ترکِ گمان بیکسیٔ رام کیجیے
آپ انتظارِ واپسیِ رام کیجیے
اُلجھن تھی جانکی کو لکھن کے جواب سے — سیماب کی روش تھی عیاں اضطراب سے

واقف نہ تھی نگاہِ کرم گو عتاب سے ‏ اُٹھتی نہ تھی کسی کی طرف بھی حجاب سے
لیکن جو مدعا تھا وہ لچھمن سمجھ گئے
سنبل کی طرح دشت بلائیں اُلجھ گئے
پھر یوں گہرفشاں ہوئے ماتا خطا معاف ‏ ارشاد پاک سے ہو مجھے تابِ انحراف
لیکن جو اصل بات تھی کہدی وہ صاف صاف ‏ اس راز کا ابھی کئے دیتا ہوں انکشاف
کرتا نہیں پسند کبھی خودسری کو میں
جاتا ہوں صرف آپ کی فرمانبری کو میں
ماتا پلٹ کے آنے میں کچھ دیر ہو اگر ‏ رگھناتھ جی کی جلد نہ شاید ملے خبر
صحرائے پُرخطر ہے یہ اک راچھسوں کا گھر ‏ آنے نہ پائیں دل میں خیالات مُنتشر
بولے خط ایک کھینچ کے پھر اپنے تیر سے
باہر قدم نہ رکھئے گا آپ اس لکیر سے
یہ کہہ کے لکشمن تو ہوئے اس طرف رواں ‏ تنہا فقط ودیہہ کُماری تھیں اب یہاں
غم تھا فراق رام کا اور وشت بیکراں ‏ کہتی تھی روح وحشتِ صحرا پہ الاماں
الجھن بڑھی تھی اور دل بے قرار میں
محوِ سکوت بیٹھ گئیں انتظار میں
آ پہونچا بن میں مکر سے لنکیش فتنہ گر ‏ کاسہ بدست صورت درویش خوش سیر
دیکھا نظر بچا کے کچھ اس نے اِدھر اُدھر ‏ دی پھر صدا یہ سامنے سیتا کو دیکھ کر
مل جائے دان اگر کوئی مائی کا لال ہو
دے گا دعا فقیر جو پورا سوال ہو
جنگل میں تھا فقیر کی امداد کا خیال ‏ دیتی نہ دان راجکماری یہ تھا محال

معصومیت سے کچھ نہ سمجھ پائیں اس کی چال — سیتا اُٹھیں کہ رد نہ برہمن کا ہو سوال

درمان بے نوائی درویش کر دیا
جو کچھ تھا پاس ادب سے اسے پیش کر دیا

لنکیش نے نہ تحفۂ سیتا کیا قبول — بولا کہ دان ٹین کا کیا ہے یہی اُصول
اس در پہ مانگنا ہی تھا میرے لئے فضول — ردِّ سوال سے مجھے تم نے کیا ملول

ہے اجتناب ایک گدائے غریب سے
دینا اگر ہے دان مجھے دو قریب سے

سیتا نے اصل راز کا اظہار کر دیا — باہر قدم کو رکھنے سے انکار کر دیا
مقصد براریوں کو جو دُشوار کر دیا — درویش کینہ ساز کو بیزار کر دیا

اصرار تھا کہ دان مجھے باہر آکے دو
دو شوق سے ذلیل نہ لیکن بنا کے دو

سیتا بصد ادب ہوئیں پھر اُس سے عذر خواہ — لیکن نہ حیلہ ساز کی سیدھی ہوئی نگاہ
ماتھے پہ ہاتھ رکھ کے بھری ایک سرد آہ — چلنے لگا یہ کہہ کے کہ ناحق ہوا گناہ

دانی وہ کیا نہ آکے جو نزدیک دے سکے
بھوکے فقیر کو بھی نہ یوں بھیک دے سکے

سیتا پہ کید و مکر کا یہ وار چل گیا — دل خدمتِ کمال کے سانچے میں ڈھل گیا
فوراً ہی موم کا سا کلیجا پگھل گیا — یعنی زباں سے کلمۂ طاعت نکل گیا

معصوم تھیں فریب نشاچر سے کھا گئیں
فکر خط کشیدہ نہ کی، باہر آگئیں

سیتا کے پاؤں رکھتے ہی باہر لکیر سے — مکّار ہو گیا وہ نشاچر فقیر سے

آیا نہ باز معرکۂ دار و گیر سے   ظلم و ستم میں اب تھا سوا چرخِ پیر سے
سیتا کو لے کے گود میں مفرور ہو گیا
ایسا اُڑا اِک آن میں کافور ہو گیا

لاہور۔ مطبوعہ اودھ اخبار لکھنؤ
سنہ ۱۹۲۷ء

رُباعی

کر صاف خدا کے واسطے سینے کو   لے دولتِ سرمدی کے گنجینے کو
دنیا کو سمجھ رکھا ہے اِس سے محروم   کیوں پُشت سے دیکھتا ہی آئینے کو

رُباعی

ہر سُو مجھے دنیا میں ضیا بار کیا   چھٹکی ہوئی کرنوں سے نمودار کیا
اک جوہرِ مخفیٔ حقیقت ہوں میں   میرا مری فطرت ہی نے اظہار کیا

(ترجمہ انگریزی)

رُکمنی اور کرشن!

یہ کون نازنین سُبک پا صبا خرام
جُنباں برنگِ شاخِ گُل افشاں چمن میں ہے

قامت میں اپنے حُسن خم وچم سے رشکِ تیغ
ہے وجہ خونِ دل جو شکن پیرہن میں ہے

رنگِ شباب زینتِ چشمِ عدوئے ہوش
جوشِ شراب، ساغرِ توبہ شکن میں ہے

ہے شاہدِ نزاکتِ اندامِ دل رُبا
ہلکا سا جوشِ خوں وہ جو رگ ہائے تن میں ہے

کچھ سعی ضبطِ موجِ تبسم لبوں پہ کچھ
شامل غضب کا رنگ خموشی دہن میں ہے

ہے اختیار وجبر کی اُلجھن میں جذبِ شوق
منصور یا کشاکش دار ورسن میں ہے

دل لے چلا ہے مرکزِ ارماں کو اپنے ساتھ
یہ نسبتِ لطیف کہاں جان وتن میں ہے؟

سینہ میں دل رہینِ خیالِ وفا نہیں
ہے اِک گرہ جو رشتۂ عہدِ کہن میں ہے

آنکھیں بتا رہی ہیں دلِ مضطرب کا حال
سوزاں برنگِ شمع کسی کی لگن میں ہے

جُھرمٹ سہیلیوں کا جِپ وراس جلوہ گر
اِک جان انجمن ہے جو اس انجمن میں ہے

پردے میں شوق کے ہمہ تن اضطراب ہے
کس کے خرام میں روشِ ماہتاب ہے؟

قُربانِ حُسن جانِ دو عالم یہ کون ہے؟
کس کی نظر میں جلوۂ رعنا ہے کرشن کا؟

پیدا بیاضِ رُخ سے تجلّی ہے کرشن کی
آئینہ خالِ رخ میں سویدا ہے کرشن کا؟

نیچی نظر میں کون چُھپائے ہے کرشن کو؟
کس کا حجابِ ناز یہ پردا ہے کرشن کا؟

ڈالی ہے کس نے جانِ جہانِ جمال میں؟
کس کی ادا سے حُسن دوبالا ہے کرشن کا؟

دامن میں اپنے چاند ہزاروں لئے ہوئے
کس کی جبیں پہ نقشِ کفِ پا ہے کرشن کا؟

ہم رنگ عشق و حسن ہیں کس کے طلسم سے؟ | سایہ ہیں کس کی زلف کے سایہ ہے کرشن کا؟
کس نے کیا ہے جادوئے تسخیر کرشن پر؟ | کس کی زباں پہ ذکرِ دل افزا ہے کرشن کا؟
ہے یہ وہ نازنیں جسے کہتے ہیں رُکمنی | جس کو جنوں ہے کرشن کا سودا ہے کرشن کا؟
رکھیں گے آگے لاج وہی اس کے پریم کی | بیچارگی میں دل کو سہارا ہے کرشن کا؟
جاتی ہے اشٹ دیو کی پوجا کو رُکمنی | آنکھوں سے انتظار ٹپکتا ہے کرشن کا؟

اُٹھ کر رہے گی چشمِ زدن میں نگاہ کرشن
مل جائے گی اسے کوئی دم میں پناہِ کرشن

تیج مطبوعہ ۶ ۱۹۳۸ دہلی

رُباعی

میں رفعِ ملال کے لئے آیا ہوں | تزئینِ مآل کے لئے آیا ہوں
پیدا مرے نفس میں نفاست ہو جائے | اصلاحِ خیال کے لئے آیا ہوں

ترغیبِ ارتقا

سپردِ حُسن ازل مائل بقا ہوجا — فنا و عشق کی تکمیل میں فنا ہوجا
وفا سرشت ہو تیری وفا کا بندہ بن — گلہ جفا کا نہ کر کُشتۂ جفا ہوجا
ہے ابتدا ہی سے غفلت جو انتہا کی تجھے — کر ابتدا وہ اب اپنی کہ انتہا ہوجا
گذر خودی سے کہ ہو کیف بیخودی حاصل — خدا بھی تو کبھی اے بندۂ خدا ہوجا
جو کہہ رہا ہوں کہ تو غیر کی تلاش نہ کر — یہ مدّعا ہے کہ اپنا ہی مدّعا ہوجا
اسی سے نیستی بیگانگی کی ممکن ہے — کہ اپنے جوہر ہستی سے آشنا ہوجا
ہر آئینہ ہے ترا دل ہی سرِّ خود مستی — اس آئینہ میں جلا کر کے خود نُما ہوجا
یہی ہے فتح حقیقت، یہی شکست مجاز — کہ اپنے حُسن نہانی پہ خود فدا ہوجا
رسائی ہے جو تری صرف نارسائی تک — تو نارسائی کے اقرار سے رسا ہوجا
رہے مدام نظر تیری اپنے مرکز پر — محیطِ دائرۂ طاعت و رضا ہوجا
نہاں نشاطِ دوامی کا راز اسی میں ہے — جو دل کے ساز سے پیدا ہو وہ صدا ہوجا

بہت لیا ہے منوّر زبانِ قال سے کام
زبانِ حال سے بھی اب سخن سرا ہوجا

مطبوعہ کلیم دہلی

شرد پورنما

ماہِ ستمبر کی ایک رات

منظرِ حسن ہے کیا پیشِ نظر آج کی رات
قابلِ دید ہے تنویرِ قمر آج کی رات

داستاں موسمِ باراں کی ہوئی رفت و گذشت
لائی ہے آمدِ سرما کی خبر آج کی رات

مہ کامل کی تجلی سے دوچار آنکھ ہوئی
جذبۂ دل کا نمایاں ہے اثر آج کی رات

یہ سماں دیکھ کے بیتاب ہوئے جاتے ہیں
اپنے قابو میں نہیں قلب و جگر آج کی رات

چاندنی فرش زمیں پر ہے نہیں لہریں لیتی
دودھ کی نہر ہے ہر راہ گذر آج کی رات

اپنی تقدیر کو ہم روز سراہیں سو بار
آئے دن دیکھنے میں آئے اگر آج کی رات

فیضِ قدرت سے بصارت بھی بصیرت بھی ملی
وا ہوا دیدۂ انجام نگر آج کی رات

اس نے ہر سمت ہوا باندھ رکھی ہے اپنی
لگ گئے چاند میں سرخاب کے پر آج کی رات

راہ میں لاکھ وسیلے ہوں ظفر کے پیدا
گھر سے گر پاؤں اٹھیں بہرِ سفر آج کی رات

پھوٹ نکلا ہے رخِ شاہدِ قدرت کا جمال
جذبۂ شوق مرے تو بھی ابھر آج کی رات

کر لے دل بھر کے ذرا دیدۂ مشتاق یہ سیر
کہ ملے یا نہ ملے بارِ دگر آج کی رات

سال میں چاندنی راتیں تو بہت آتی ہیں
مثل اپنا نہیں رکھتی ہے مگر آج کی رات

تیغ زن معرکۂ رزم میں جانے کے لئے
مانگتے ہیں مہ گردوں سے سپر آج کی رات

کثرتِ نور سے مہتاب کے نادم ہو کر
روشنی چھپ گئی تاروں کی کدھر آج کی رات

موجزن حسن کا دریا نظر آتا ہے مجھے
آنکھ اٹھتی ہے زمانہ میں جدھر آج کی رات

اللہ اللہ یہ تنویر یہ شانِ معراج
لیلۃ القدر سے بڑھ کر ہے مگر آج کی رات

کیا نرا ہرج ہے اے ناظمِ قدرت اس میں
اور بڑھ جائے جو دو چار پہر آج کی رات

ہم بغل شاہدِ معنی سے منور ہوں میں
امن سے چین سے ہوتی ہے بسر آج کی رات

دہلی ۱۹۲۹ء

حدِّ یاس

دشمن ہوئی ہے جنبشِ دامن چراغ کی
کیسے پناہ دوں میں ہوا سے غریب کو
رونق بڑھا دے شعلۂ روشن چراغ کی
جل جل کے کوستا ہے یہ اپنے نصیب کو

کیسا کیا ہے صاف چمن پر خزاں نے ہاتھ
تنکا بھی اک نصیب نہیں عندلیب کو
جینے سے دھوئے ہیں کسی بے خانماں نے ہاتھ
مرنے کی بھی نہیں ہے اجازت غریب کو

کیسی لگی ہوئی ہے ہوا کے جگر میں آگ
جنگل اُڑا کے لے گئی گردوں پہ ڈھاک کا
پانی بھی ہو رہا ہے کسی کی نظر میں آگ
خورشید حشر ہو گیا ہر ذرّہ خاک کا

پھولوں کا شوق ہے دلِ پُر اشتیاق کو
لیکن خیال ہے کہ گلستاں اُجڑ نہ جائے
سمجھے گا خود مسائل وصل و فراق کو
چسکا کسی کے عشق کا انساں کو پڑ نہ جائے

رنگ اپنا کیسے بزم ترنم جما سکے
پردہ تڑپ کے ٹوٹ گیا اس کے ساز کا
دنیا میں کوئی دل نہ کسی سے لگا سکے
اب ٹوٹتا ہے سلسلہ راز و نیاز کا

سورج مکھی کا پھول

سورج مکھی کا پھول شگفتہ چمن میں ہے — یا شمع جلوہ پاش کسی انجمن میں ہے

رنگین بھی خوش ادا بھی ہے ناز آفریں بھی ہے — نازک بھی دلربا بھی ہے یہ اور حسیں بھی ہے

پیدا جو اس میں بات ہے سورج کہاں سے لائے — یہ آن بان اور یہ سج دھج کہاں سے لائے

دیکھو تو جلوہ پاش یہ کس شدّ و مد سے ہے — سوزاں فلک پہ مہر مبیں بھی حسد سے ہے

قدرت نے اپنی شان دکھائی اسی میں ہے — برقِ طپاں سمٹ کے سمائی اسی میں ہے

نام اس کا لے اُڑی ہیں حسینانِ مہ جبیں — جو اس میں وصف ہے وہ کسی پھول میں نہیں

بختِ چمن کا اخترِ تاباں یہی تو ہے — پھولوں کی انجمن میں نمایاں یہی تو ہے

بیٹھا ہے اک رئیس جواں بخت شان سے — خورشید تک رہا ہے اسے آسمان سے

مخزن ہے تازگی کا لطافت کی کان ہے — سچ پوچھئے اگر تو گلستاں کی جان ہے

آنکھوں میں نور رنگ لطافت اثر سے ہے — دل کو سرور حسن ملاحت اثر سے ہے

ہر برگ زرد اک ہے کرن آفتاب کی — لیکن نہیں ہے اس میں جلن آفتاب کی

ہر وقت کاش پھول یہ مدِّ نظر رہے — سرمایہ بخش فرحت قلب و جگر رہے

جب نام ہی میں اس کے کشش انتہا کی ہے — حیرت ہو کیوں جو اس میں شرارت بلا کی ہے

ساماں یہی چمن میں مری دلکشی کا ہے
پھولوں میں پھول اگر ہے تو سورج مکھی کا ہے

دتی ۱۹۲۸ء

پہلاد

ازل سے تو سبق خواں تھا دبستانِ حقیقت کا
ترے دل میں سمندر موجزن تھا نورِ وحدت کا
تجھے تعلیم روحانی ملی تھی بطنِ مادر میں
حقیقت پر فدا ہونے کا سودا تھا ترے سر میں

کیا جب گمرہِ حق نے ترے ایمان پر نرغہ
کیا سو سو طرح غافل نے تیری جان پر نرغہ
تری معصومیت بدعت پرستی کے مقابل تھی
اماں لیکن تجھے دامانِ یزدانی میں حاصل تھی

نہ جادو چل سکا تجھ پر ذرا تعلیمِ باطل کا
جہالت سے مکدّر کر رہے تھے آئینہ دل کا
نمک خواری نے اندھا کر دیا گو اُستادوں کو
نظر آیا نہ کچھ انجام اپنا نامرادوں کو

ہوا قائل نہ اُس کا، تھی جو نفرت خود پرستی سے
نہ تیری ہمّتیں ٹوٹیں پدر کی چیرہ دستی سے
نگاہوں میں تری پندارِ ہستی اک کھلونا تھا
بقا قبضے میں تیرے تھی، فنا کا خوف ہی کیا تھا

فرشتوں کے بھی ہوش اُڑتے تھے تیری ہوشمندی سے
زمیں پر گو تجھے پٹکا۔ پہاڑوں کی بلندی سے
چمکتے حرف تھے تائیدِ حق کے تیری قسمت میں
مگر مالک نے تجھ کو لے لیا آغوشِ رحمت میں

سپردِ آتش جوّالہ ہونا کھیل تھا تجھ کو
فنا کیا خاک کر سکتی تھی ظالم ہولکا تجھ کو
نہ تجھ سے لاگ رکھتے تھے وہ شعلے جو بھڑکتے تھے
وہ ہو جاتے تھے گُل جو سرخ انگارے دہکتے تھے

نکالی باپ نے جب تیرے تیغ خونفشاں اپنی ہوا آمادہ سفاکی سے تیرا سر اُڑانے کو
ہوا تیار ادہر تو نذر جب کرنے کو جاں اپنی اُدہر نازل ہوا فضلِ خدا تیرے بچانے کو

بنا ستیاگرہ[1] کی تو نے نے پہلا ڈالی تھی نہیں اس سے سوا بہتر وسیلہ کامرانی کا
نرالی راہ تو نے فتح و نصرت کی نکالی تھی شرف جس سے ملا تجھ کو دوامی زندگانی کا

لکھنؤ

[1] ستیاگرہ سے مراد خود ضبطی ہے

رُباعی

خود اپنی ہی آنکھ کا اشارا تو ہے خود ذات سے اپنی آشکارا تو ہے
ہستی تری بیگانہ کی محتاج نہیں خود اپنے سپہر کا ستارا تو ہے

(ترجمہ انگریزی)

رُباعی

جب صدق و صفا سے دور ہو جاتا ہوں تسلیم و رضا سے دور ہو جاتا ہوں
رفتہ رفتہ نتیجہ ہوتا ہے یہ میں اپنے خدا سے دور ہو جاتا ہوں

عجائب خانۂ دنیا

ہے کسی کے تجربہ میں اک خراب آباد یہ
جس طرف اُٹھّی نظر دیکھا کہ اک ویرانہ ہے

ہے نظر میں یہ کسی کی اک سرائے کارواں
جس میں ہر اہلِ سفر باہم دگر بیگانہ ہے

کوئی کہتا ہے کہ یہ اک مجلسِ تاریک ہے
جس کا ہر ساکن جنوں پروردہ ہی دیوانہ ہے

ہے کسی کا قول یہ اک آئینہ قدرت کا ہے
جس کا عنواں حیرت افزا ہے یہ وہ افسانہ ہے

اس میں اُس کو بے وفائی شمع کی آئی نظر
جس کی قسمت میں ازل سے حسرتِ پروانہ ہے

ہے کسی مستِ مئے عرفاں کی یہ موجِ خیال
بادۂ نیرنگ سے لبریز اک پیمانہ ہے

ہے نگاہِ عشق میں یہ اک تماشا گاہِ حسن
ہر طرف جس میں نمایاں جلوۂ جانانہ ہے

اور دعویٰ ہے بجا یہ بھی کسی دیندار کا
اہلِ ایماں کی ریاضت کو یہ اک کاشانہ ہے

زاہدوں کے واسطے ہے اک یہ جولانگاہِ زہد
اور رندوں کے لئے اک محفلِ رندانہ ہے

کچھ بھی ہو دنیا منور دوسروں کے واسطے
میری نظروں میں مگر یہ اک عجائب خانہ ہے

لکھنؤ ۱۹۲۶ء

چیونٹی اور میری دُعا

کاٹنے سے مجھ کو اے چیونٹی تجھے کیا مِل گیا — ہاتھ تو نے دھو لئے بیکار اپنی جان سے
اِن دا حسد میں تجھے اس کا نتیجا مِل گیا — کیا تجھے پر خاش تھی اک بے خطا انسان سے

تھا بھلا کب تیرے حق میں در پئے آزار میں — ہے خدا شاہد کہ میں تجھ سے مخاطب ہی نہ تھا
تیرے مرنے کا سبب اک ہو گیا بیکار میں — تجھ کو میری پیٹھ پر چڑھنا مناسب ہی نہ تھا

تیرے امکانات کی معلوم ہے وسعت مجھے — کوہ پیکر ہاتھیوں کی روح لرزاں تجھ سے ہے
لیکن اس جرأت پہ تیری کیوں نہ ہو حیرت مجھے — فخرِ مخلوقات انساں بھی پشیماں تجھ سے ہے

میرے دل میں یہ مگر رہ رہ کے اُٹھتا ہے خیال — تو نے کاٹا تھا مجھے کس چاہ کس ارمان سے
اور اب ممکن نہیں ہرگز کہ حل ہو یہ سوال — کیونکہ تو نے دھو لئے ہیں ہاتھ اپنی جان سے

آہ میرے پاس کوئی چیز بھی شیریں نہ تھی — میں نہ کھانے کے لئے بیٹھا تھا دسترخوان پر
خاک میرے جسمِ فانی کی بھی شہد آگیں نہ تھی — حرص میں تو جس کی یوں کھیلی ہے اپنی جان پر

کاٹنے سے مجھ کو تھا کچھ فایدہ تیرا اگر — مجھ کو درد و کرب سہنا شوق سے منظور تھا
مدعا تیرا مجھے معلوم ہو جاتا اگر — دل ترا رکھتا نہ میں یہ مجھ سے کوسوں دور تھا

جان ننھی سے تری ہو جادہ پیمائے صعود — ہو میسّر اب تجھے چڑھنا سرِ بامِ حیات
ارتقا کی منزلِ اعلےٰ پہ ہو تیری نمود — اور قیدِ عنصری سے تجھ کو مل جائے نجات

نوبستہ اسکول لکھنؤ

۱

درسگاہ قدیم نوبستہ — میں ترا احترام کرتا ہوں
تو مرے بچپنے کا مکتب ہے — جھک کے تجھ کو سلام کرتا ہوں

۲

تیرے ہر سنگ و خشت پر اب تک — کچھ نہ کچھ درس نقش ملتا ہے
جب ترے پاس سے گذرتا ہوں — دل کا ایک ایک تار ہلتا ہے

۳

وہ پس پشت کاظمین کی راہ — جادہ یادگار شاہی ہے
ٹوٹی پھوٹی سی وہ فصیل کہن — پردہ دار وقار شاہی ہے

۴

ترمنی گنج کی وہ آبادی — جس میں اب تک ہے ننہال مری
جس پہ تینتیس جم چکی ہیں تہیں — آہ وہ یاد خورد سال مری

۵

منتشر خون ہے مرے دل کا — مستقل رنگ کہنگی تیرا
ابتدا سے جو تجھ کو قسمت تھا — آج بھی رنگ ہے وہی تیرا

۶

اُس زمانے کی یاد ہیں باتیں — جب مجھے تجھ سے فیض حاصل تھا
اب کہاں وہ قدیم لیل و نہار — فکر دنیا سے پاک جب دل تھا

۷

وہ ریاضی میں اپنی آپ مثال — ماسٹر بیجناتھ کی تعلیم
وہ مرے حال پر کرم ان کا — یاد ہے جس کی دل مرا ہے ندیم

۸

ماسٹر شیو دیال کی آواز — آج تک گونجتی ہے کانوں میں
اس زمانے کے واقعات عظیم — اب ہیں تبدیل داستانوں میں

۹

ہول زادہ صدائے ارمن لال — وہ کہن سال قمچیاں انکی
وہ جماعت میں رعب و داب ان کا — اف وہ ہستی فلک نشاں انکی

۱۰

درسگاہ قدیم نوبستہ — تو مقدس مری نظر میں ہے
بس ترک وطن بھی شان خدا — یاد باقی تری سفر میں ہے

۱۱

اب بھی جمناسٹک کے وہ ساماں — یادگار زمان ماضی ہیں
یہ ترے بیش بہا کی تعمیریں — حاصل داستان ماضی ہیں

۱۲

آہ دھرم سوجی کا وہ مندر — شانتی دل کو دینے والا ہے
رونما عظمت قدیمی سے — آج تک پاس کا شوالا ہے

۱۳

شاد ہوتا ہوں دیکھ کر تجھ کو   جب کبھی میں وطن میں آتا ہوں

جن میں ہے باس دیوتاؤں کا   اُن حدودِ کہن میں آتا ہوں

۱۴

رخصت اے درسگاہِ نوبتہ   دل تجھے پیشکش میں دیتا ہوں

نظر آتی ہے سامنے جب تو   کچھ نہ کچھ تجھ سے درس لیتا ہوں

لکھنؤ نومبر ۱۹۳۸ء

رُباعی

کر یادِ خدا بشر زیاں ہے ورنہ   سب لطفِ حیات رائگاں ہے ورنہ

بات اس کی بڑی ہے صرف ذکرِ حق سے   ٹکڑا چمڑے کا اک زباں ہے ورنہ

(ترجمہ)

رُباعی

رُتبہ دنیا میں اس سے اعلیٰ ہوگا   عقبیٰ میں بھی بول اس سے بالا ہوگا

دہلیز پہ لب کی شمع نامِ حق رکھ   اندر باہر تمام اُجالا ہوگا

(ترجمہ)

عُمر کی تعظیم

اس سبق کی اے منور کچھ عجب تاثیر ہے
حرزِ جاں اسلاف کی تعلیم ہونی چاہیے

کام چل سکتا نہیں ہرگز ترا اس کے بغیر
از سرِ نو زیست کی تنظیم ہونی چاہیے

بے خبر بعد از خرابی ان سے باز آیا تو کیا
قطع زنجیرِ اُمید و بیم ہونی چاہیے

روح کے بیدار ہونے کی یہی ترکیب ہے
پیروی جادۂ تسلیم ہونی چاہیے

زور گھٹ جائے بدی کا نیکیاں اتنی بڑھیں
ضرب کے پردے میں بھی تقسیم ہونی چاہیے

اور رہی کچھ سطوت شاہنشہی کا راز ہے
ختم فکر افسر و دیہیم ہونی چاہیے

زیب دیتی اب نہیں تجھ کو پرستاری نفس
کچھ تو آخر عمر کی تعظیم ہونی چاہیے

جوہرِ ایثار

جو زخمِ دِگر سے جگر افگار نہیں ہے
جو رنج سے دنیا کے خبردار نہیں ہے
جو راہیِ جادۂ ایثار نہیں ہے
شانِ بشریت کا سزاوار نہیں ہے
کیا خاک ہو بندہ کبھی پیارا وہ خدا کا
بندہ جو نہیں جذبۂ ایثار و وفا کا

پڑ جائے اگر درد بھری کان میں آواز
دے غم جو کسی کو فلک شعبدہ پرداز
چہرے سے نمایاں ہوں جہاں کرب کے انداز
ہو جائے عیاں جذبۂ ایثار کا اعجاز
پانی کی جگہ زخم کے دھونے کو لہو دے
ڈورے کی جگہ ہر رگ تن بہرِ رفو دے

دل کوئی اگر سوزش پنہاں سے طپاں ہو
دکھیا جو کوئی مائل فریاد و فغاں ہو
بیوہ جو کوئی مضطرب درد نہاں ہو
تنگ اپنی یتیمی سے جو اک ننھی سی جاں ہو
بیکس پئے امداد اگر کوئی صدا دے
اک آگ سی ایثار کلیجے میں لگا دے

بیچین کرے غیر کی تکلیف کا احساس
پائے وہ تشفی جو ہو سرگشتۂ افلاس
دے بن کے مسیحا اُسے درمانِ غم و یاس
بے آس جو ہو جائے کوئی اس کی بنے آس
ایثار یہ ہے تار سے اپنی رگ جاں کے
زخم تن مجروح کو خود بیٹھ کے ٹانکے

ہو کوئی گرفتار اگر دامِ بلا میں — اُٹھ جائے قدم جادہ ایثار و وفا میں
ہوتی ہے فنا ذات کی تبدیل بقا میں — مقبول یہ ایثار ہے درگاہِ خدا میں
باطن میں فرشتہ ہو تو ظاہر میں بشر ہو
ہر بات میں بہبود خلائق پہ نظر ہو

ہو شرکت ہمسایۂ محزوں دل و جاں سے — دو حرف تسلّی کے نکل جائیں زباں سے
بن کر رگ تاثیر لپٹ جائیں فغاں سے — دنیا کو سبکدوش کریں رنج گراں سے
واقف ہو غم خویش سے دُکھ غیر کا جانے
اس واسطے بخشا ہے دل انساں کو خدا نے

لکھنؤ۔

رُباعی

مانا جلوہ انہیں دکھایا ہوگا — مانا مُوسیٰ کو غش بھی آیا ہوگا
میرے لئے کب زمانہ آئیگا وہ — جب آنکھوں میں تو ہی تو سمایا ہوگا

فلسفۂ تغیّر

ہر زباں پر اندنوں ہیں نعرہ ہائے انقلاب　　گونجتی ہے گوشہ گوشہ میں صدائے انقلاب
آج ہی سے کچھ نہیں ہے ابتدائے انقلاب　　چل رہی ہے روزِ اوّل سے ہوائے انقلاب

ترجمانِ قلبِ فطرت خلق کی آواز ہے
گو نیا عنواں، نئی سرخی نیا پرواز ہے

یہ وہ ہے جس سے ہے لبریز جامِ زندگی　　یہ نہیں تو خاک ہے پھر اہتمامِ زندگی
منحصر ہے اس کی ہستی پر قیامِ زندگی　　ہر نفس تبدیل ہوتا ہے نظامِ زندگی

اس سے ممکن تا بہ روزِ حشر چھٹکارا نہیں
یہ ہے وہ قانون جو دنیا سے مٹ سکتا نہیں

کب وجود اس کا بہارِ گلشنِ ہستی نہ تھا　　کس زمانے میں یہ ہم پر غالب و حاوی نہ تھا
کس لغت میں اس کا ظاہر حاملِ معنی نہ تھا　　آئینہ ہے آج بھی پہلے بھی یہ آئینہ تھا

وقت کی ہستی کے ساتھ اس کو بھی رہنا ہے ضرور
یہ وہ دریا ہے جسے ہر لحظہ بہنا ہے ضرور

کوئی شے تبدیلِ حالت سے کبھی خالی نہیں　　ہوں مبرّا اس عمل سے ہم یہ ممکن ہی نہیں
ایک صورت بھی تو قائم دیر تک رہتی نہیں　　کل جو کچھ تھی کیفیت وہ آج دنیا کی نہیں

آج کا منظر بھی یہ آخر بدل ہی جائے گا
گردشِ دوراں کا جادو اس پہ چل ہی جائے گا

وقفِ گردش ہیں ازل سے آفتاب و ماہتاب　　دَوْر میں رہتے ہیں دائم صورتِ جامِ شراب
خود بخود ہے یہ حقیقت اہلِ دل پر بے نقاب　　کام کرتا ہے اشارے پر کسی کے انقلاب

ہے سکوں اس میں کبھی ہنگامہ خیزی ہو کبھی
سُست رفتاری کبھی ہے اور تیزی ہو کبھی

جب سکوں کے ساتھ ہوتا ہے ظہورِ انقلاب　　گرد دھو دیتا ہے اک عالم کی ہمرنگ سحاب
بے غل و غش کھولتا ہے قلعۂ ہستی کا باب　　نام کو ہوتا نہیں سیماب میں بھی اضطراب

چھیڑتا ہے دیکھ کر خوابیدۂ غفلت ہمیں
گدگداتا ہے نسیمِ صبح کی صورت ہمیں

جب جلو میں لے کے آجاتا ہے طوفانوں کو یہ　　اپنی آمد سے سبق دیتا ہے نادانوں کو یہ
فرض سے آگاہ کر دیتا ہے انسانوں کو یہ　　جان کا تحفہ عطا کرتا ہے بے جانوں کو یہ

اک علاج کارگر غفلت کی بیماری کا ہو
جو ہیں خوابیدہ اُنہیں نسخہ یہ بیداری کا ہو

کاہشِ پیہم سے جب تک خون دل ہوتا نہیں　　گردشِ دوراں سے یہ جب تک خجل ہوتا نہیں
زشت کرداری پر اپنی منفعل ہوتا نہیں　　منتشر یہ اجتماعِ آب و گل ہوتا نہیں

انقلاب اس واسطے ہے لازمی ہر بات میں
جزو لاینفک ہے یہ دنیائے موجودات میں

انقلاب اک داستانِ وقت کی تفسیر ہے　　ذرّہ ذرّہ ایک اس کی معنوی تصویر ہے
اس سے وابستہ ہر اک ذی روح کی تقدیر ہے　　کامرانی کی یہی دنیا میں اک تدبیر ہے

اس کے ذکر و فکر سے بیکار ڈرتا ہے کوئی
کیوں سیاست سے اسے وابستہ کرتا ہے کوئی

رنگ کب کوئی نیا چرخ بریں لایا نہیں کس کی قسمت نے بھلا پلٹا کبھی کھایا نہیں
دور کون ایسا ہے جس میں انقلاب آیا نہیں کب کسی گتھی کو آ کر اس نے سلجھایا نہیں

انقلاب ایمائے فطرت اک مرے نزدیک ہے
یہ غلط ہے انقلاب انسان کی تحریک ہے

گو یہ سچ ہے اس سے ملتا ہے نشانِ زندگی گو ہیں ادنیٰ سے کرشمے اس کے ہستی نیستی
لیکن اس سے خوف کھانا ہی نہایت بزدلی یہ نہیں وہ لفظ جس کے خاص معنی ہوں کوئی

دفعہ معمولی سے ہے یہ اک قدرتی قانون کی
مدّعا اس کا نہیں نہریں بہانا خون کی

دفتر منشائے باری ہے کتاب انقلاب بند کر سکتا ہے کوئی خاک باب انقلاب
تم بھی ہو جاؤ ہم آہنگ رباب انقلاب دو خموشی سے جھکا کر سر جواب انقلاب

اس پہ قابو تم کسی عنواں سے پا سکتے نہیں
خود فنا ہو جاؤ گے اس کو مٹا سکتے نہیں

ہاں اگر پامالیِ قدرت کی ہمّت تم میں ہے ہاں اگر تابِ شکستِ زورِ فطرت تم میں ہے
ہاں اگر امکانِ انکارِ حقیقت تم میں ہے ہاں اگر مثلِ خدا ہونے کی طاقت تم میں ہے

پھر نہیں قائم رہے گا بندوبست انقلاب
مان لوں گا دل سے میں فوراً شکست انقلاب

دہلی - ۱۹۳۰ء

چیونٹی

(بچوں کے لئے)

پیاری چیونٹی عزیز چیونٹی ۔۔۔ ہے تو بھی عجیب چیز چیونٹی
ننھی سی ہے کتنی جان تیری ۔۔۔ ہے پھر بھی نرالی شان تیری
چھوٹے چھوٹے ہیں پاؤں تیرے ۔۔۔ چھانے ہیں شہر گاؤں تیرے
ہمت یہ تری صد آفریں ہے ۔۔۔ ہے کون جگہ جہاں نہیں ہے
چھوٹی ہے اگرچہ دل بڑا ہے ۔۔۔ ہر مرحلہ تو نے طے کیا ہے
رکتا نہیں تیرا پاؤں گھر میں ۔۔۔ ہر دم مشغول ہے سفر میں
ہو خواہ کمال خواہ پستی ۔۔۔ ہر ایک جگہ ہے تیری بستی
اشجار کی کھوہ میں کبھی ہے ۔۔۔ انبار کی تُوہ میں کبھی ہے
گو دیکھنے میں ہے بھولی بھالی ۔۔۔ یعنی فن و مکر سے ہے خالی
ہوتی ہے جہاں مگر غضبناک ۔۔۔ قصہ کرتی ہے فیل کا پاک
ننھے سے شکم میں یہ سمائی ۔۔۔ دیمک کی اک آن میں صفائی
شیرینی پہ جان سے فدا ہے ۔۔۔ تو اس کی مٹھاس میں فنا ہے
ہوتی ہے جو تیری میہمانی ۔۔۔ چارہ دیتے ہیں تجھ کو دانی
آتی ہی نہیں نگاہ میں تو ۔۔۔ روندی جاتی ہے راہ میں تو
ہر دم ہے ترے لئے قیامت ۔۔۔ بچ جاتی ہے پھر بھی تو سلامت
یہ بھی اک شانِ کبریا ہے ۔۔۔ ورنہ تیری بساط کیا ہے
چٹکی ہی سے مل کے کوئی رکھ دے ۔۔۔ جب چاہے مسل کے کوئی رکھ دے
جب تک ترا شیوہ عاجزی ہے ۔۔۔ خدشے سے فنا کے تو بری ہے

جس روز بھی تو نے پر نکالے
ہو جائے گی موت کے حوالے

حیا

جس کے انداز ہوں پروردۂ دامانِ حیا — اُس کی آنکھوں سے ٹپکتے ہیں گلستانِ حیا
مہ و خور بھی نہ کبھی اِس کے مقابل آئے — پوچھتا کیا ہے کوئی وسعتِ امکانِ حیا
کٹ کے آنکھوں ہی میں رہ جائے نظر دشمن کی — کارفرما ہو جو اک جنبشِ مژگانِ حیا
بے زبانی سے ہوں انداز و ادا کی باتیں — اِس فسانے کا ہو آغاز بعنوانِ حیا
اپنی حد میں رہے غمزوں کی نمائش کا جنوں — دیکھنا چاک نہ ہو جائے گریبانِ حیا
اِس خزانہ کی حفاظت ہے اُسی سے ممکن — چاہیئے حُسن کی عِصمت کو نگہبانِ حیا
آنکھ جب تک نہ خود اپنا ہی اُٹھا دے پردہ — لُوٹ سکتا نہیں کوئی سر و سامانِ حیا
پیکرِ نطق میں اس کی سی لطافت ہی نہیں — آہ کس مُنہ سے کرے کوئی بیاں شانِ حیا

سلسلہ ہے یہ منوّر مجھے دل سے مرغوب
بند آنکھوں پہ ہیں پلکیں کہ رگِ جانِ حیا

کھدّر کی شان

کھدّر کے برابر کوئی کپڑا ہی نہیں ہے
اس کا تو مقابل کہیں پیدا ہی نہیں ہے

دن خوبیٔ تقدیر سے پھر اس کے پھرے ہیں
کشمیرہ و زربفت نگاہوں سے گرے ہیں

ہے آب رواں اس کی صفائی سے جو آب آب
ہیچ اس کے مقابل ہیں اب قاقم و سنجاب

ململ بھی ٹھہرتی نہیں کھدّر کے مقابل
مخمل بھی ٹھہرتی نہیں کھدّر کے مقابل

یہ پان سے ہلکا ہے سُبک ہے گُلِ تر سے
اس وصف میں گر جائے گا ریشم بھی نظر سے

کرتا ہے سرفراز یہ ہر فرد و بشر کو
سرمایۂ تسکیں ہے یہ اک قلب و جگر کو

حاصل اسے رتبہ ہوا ملبوس وطن کا
پردہ ہے نگاہوں میں یہ ناموس وطن کا

تلوار یہی اپنی یہی اپنی سپر ہے
ہتھیار ہو یہ پاس تو کس بات کا ڈر ہے

ہے اس کی ترقی کا مدار اہل وطن پر
کھدّر کے سوا اور نہ کپڑا ہو بدن پر

حاصل ہے اسے خاص شرف عہدِ رواں میں
رکھتا یہی لاج غریبوں کی جہاں میں

ہوگا نہ جدا زیست میں کھدّر کبھی تن سے
مرنے پہ بھی لپٹیں گے تو کھدّر کے کفن سے

لوازمِ انسانی

نہیں کچھ ہم کو شکایت جو محبت نہ کرے
مگر انسان کسی سے بھی عداوت نہ کرے

اُس کی محرومیِ قسمت کا ٹھکانا کیا ہے
عیب پر اپنے جو اظہارِ ندامت نہ کرے

شوق و رغبت کا نہیں نشو و نما گر نہ سہی
ہاں مگر پرورشِ جذبۂ نفرت نہ کرے

ایک بربادیٔ کامل کا طریقہ ہے یہ سہل
کہ کبھی پیرویِ راہِ صداقت نہ کرے

مردِ میداں بھی اگر ہو تو اُسے ہیز سمجھ
دلِ سرکش کو جو مجبورِ اطاعت نہ کرے

تاجرِ جنسِ غرض ہے سرِ بازارِ جہاں
دلِ بے لوث سے جو خلق کی خدمت نہ کرے

اپنے تہذیب و تمدّن کی وہیں موت سمجھ
خونِ بیکس پہ اگر نفس ملامت نہ کرے

وہی مومن ہے بجالائے جو ارشادِ ضمیر
کچھ غم اس کا نہیں پروائے شریعت نہ کرے

اُس کے سایہ میں ہے تاریکیٔ صد بختِ سیاہ
اپنے ہمسایہ کی جو دُور مصیبت نہ کرے

وہ بہادر نہیں، جرار نہیں، مرد نہیں
بے پناہوں کی جو ظالم سے حفاظت نہ کرے

اُس کو تعظیم سے ہر ایک سر آنکھوں پہ بٹھائے
وا کسی پر جو کبھی چشمِ حقارت نہ کرے

ق

کوئی مطلب نہیں کچھ ہم کو سروکار نہیں
صرف اگر بخشش و خیرات میں دولت نہ کرے

خرچ لیکن نہو یہ غیر کی پامالی میں
اس سے زردار کبھی خونِ امارت نہ کرے

ستم و جور کو بنیادِ حکومت نہ بنائے
کون کہتا ہے کہ انسان حکومت نہ کرے

ہے اگر دل کو ہر اک قید سے بچنا منظور
رُخ سوئے سلسلۂ دوزخ و جنّت نہ کرے

دہلی - ۱۹۳۲ء

نزولِ حیا

آب و گِل سے جب نمایاں ہو گئے آثارِ حُسن
دستِ قدرت نے دیا ترتیب جب گلزارِ حُسن

رہ گیا کچھ نامکمل ساز و سامانِ کشش
دلرُبا رنگینیوں سے تھا نہ دامانِ کشش

اور سب اجزائے گوناگوں بہم ملتے رہے
اس چمن میں پھول گو یہ مدّتوں کھلتے رہے

عشوۂ دمساز بھی تھا غمزۂ غمّاز بھی
ناز بھی پیدا تھا اس میں جلوہ گر انداز بھی

تاہم اِن پھولوں میں شانِ دلربائی ہی نہ تھی
کافر اندازی میں شامل پارسائی ہی نہ تھی

پھول یہ اک جوہرِ نایاب سے محروم تھے
گوہرِ غلطاں تھے لیکن آب سے محروم تھے

لاجونتی کا تبسم اِن پہ لایعنی نہ تھا
نرگسِ شہلا کا خندہ اِن پہ بےمعنی نہ تھا

ان کی اس بے لاگی پر یاسمن بھی خندہ زن
اِن کی رسوائی پہ آمادہ تھی بوئے نسترن

اِن گلوں سے قطرہ زن عطرِ جوانی ہی نہ تھا
تیرتیں یہ کشتیاں جس میں وہ پانی ہی نہ تھا

چونک اُٹھی قدرت یکایک یہ نظارہ دیکھ کر
اِک نظر ڈالی پھر اس نے حُسن کی تصویر پر

جامۂ نسوانیت دے کے اس قالب کو زیب
ایک جوہر اس میں ڈالا آبدار و دلفریب

جُنبشیں پلکوں کی تہذیبِ حیا سے رک گئیں
حُسن جاذب بن گیا جس وقت آنکھیں جُھک گئیں

دہلی ۱۹۳۵ء

طاؤس

ہے شہنشاہِ طیورِ عالمِ اسباب تو   اک پرندہ ہے ریاضِ دہر میں نایاب تو

شوکت و جبروت کا آئینہ ہے ہستی تری   طرۂ فائق ہے اس پر شانِ خودمستی تری

تیری ہر خوبی پہ ہے صنّاعِ قدرت کو دماغ   دیکھ کر گلشن میں تجھ کو ہے طبیعت باغ باغ

کیسی کیسی جدّتیں اک مشتِ پر میں ہیں عیاں   پیکرِ خاکی میں پیدا کی ہیں کیا رنگینیاں

تیرا ہمتا کوئی تیری شان و شوکت میں نہیں   یہ لباسِ فاخرہ شاہوں کی قسمت میں نہیں

دیکھتا ہر ایک تجھ کو دیدۂ حسرت سے ہے   رُعب طاری دل پہ تیری عظمت و شوکت سے ہے

تو ہے دارا منزلت طالع ہے اسکندر ترا   مائل تسخیر ہے حسن جہاں پرور ترا

عالمِ پرواز میں جاری ترا فرمان ہے   شوکتِ پرویز تیری شان پر قربان ہے

ہمسرِ بابر، ہمایوں فال، اکبر مرتبہ   ہے جہانگیری میں تیرا سب سے بڑھ کر مرتبہ

تو ہے اک شاہ جہانِ حُسن و عالمگیر ناز   تجھ کو قدرت نے پرندوں میں کیا ہے سرفراز

زینتِ صحرا بھی ہے تو رونقِ گلزار بھی   طائروں کا بادشہ سچا ہے، کلغی دار بھی

رنگ کچھ اتنے نکلتے تیرے بال و پر سے ہیں   پر فرشتوں کے بھی جلتے تیرے بال و پر سے ہیں

رشک تجھ سے ہے جہاں میں گلدم و شہباز کو   فخر ہے ہستی پہ تیری عالمِ پرواز کو

تیرے گوناگوں پروں کو دیکھ کر حیراں ہوں میں   دلفریبی پر تصدّق حُسن پر قرباں ہوں میں

ہے نزاکت کچھ ترے بالوں میں ریشم سے سوا   رنگ ہے تیرے پروں کا شوخ نیلم سے سوا

تیرے دلکش پر قبولِ بزمِ سلطانی ہوئے   مورچھل بن کر جو مصروفِ مگس رانی ہوئے

پنکھیاں تیرے پروں کی نازنینوں کو پسند   کلغیاں تیری ہیں چنچل مہ جبینوں کو پسند

تجھ کو حاصل انبساطِ زندگی کا لطف ہے — رقص میں تیرے نشاطِ زندگی کا لطف ہے
دھوم ہر اک گوشۂ عالم میں ہے اس رقص کی — رقص فطرت نام ہے جس کا وہ شاید ہے یہی
مست مثلِ رندِ صہبا نوش یوں جنگل میں ہے — جانِ عالم جلوہ گر گویا رہس منڈل میں ہے
رقص میں پایا نہ اب تک حور و غلماں نے تجھے — منزلت دی اپنی استادی کی انساں نے تجھے
ایک طائر اور انساں میں یہ رسمِ ارتباط — رقصِ طاؤسی ہے بابِ مشقِ اربابِ نشاط
کیوں مشرف ہے بشر دنیائے موجودات میں — اک وجودِ غیر کا ممنون ہے ہر بات میں
ہے ترا مسعود منظر اک شگون اچھا ہے تو — دیدۂ ہندو میں باہن[۱] سرسوتی جی کا ہے تو
کس قدر عزت تری کاشانۂ ایماں میں ہے — منزلت حاصل پر منقوش کو قرآں میں ہے

میں نے کھینچا ہے مرقع آج کاغذ پر ترا
چشمِ دل میں پھر رہا تھا رقص جاں پرور ترا

دہلی

[۱] باہن یعنی سواری

رُباعی

شاکی ہر شخص دہر کا ملتا ہے — آخر اس سے نتیجہ کیا ملتا ہے
شاکی ہے اگر تو اس سے ہو جائے جُدا — کچھ قید میں رہنے سے مزا ملتا ہے

دیکھ

تن پر نگاہ ڈال فنا میں بقا کو دیکھ
قالب میں آدمی کے جمالِ خدا کو دیکھ

جاری ہے کیسی شان سے قدرت کا انتظام
کر غور مہر و ماہ پہ، ارض و سما کو دیکھ

دنیا کے طول و عرض کا اندازہ ہے محال
ڈال اس کی ابتدا پہ نظر، انتہا کو دیکھ

کیوں عیش گاہ اہل دول میں ہے محوِ سیر
ہے آنکھ اگر تو غمکدۂ بے نوا کو دیکھ

انجام سب کا ایک ہے افضل ہو یا حقیر
بینا ہے تو نتیجۂ شاہ و گدا کو دیکھ

راحت نصیب جب ملے کوئی تو شاد ہو
ہو اشک ریز جب کسی غم آشنا کو دیکھ

کھول آنکھ! حُسن شاہد فطرت کے خواستگار
ہر سمت اس کے جلوۂ رنگیں ادا کو دیکھ

کس چال سے جہاں میں ہے چلنا تجھے مُفید
اس شاہراہ میں رُخِ ہر نقشِ پا کو دیکھ

دنیا ترا مذاق منوّر اُڑائے گی
کرنا نہ ترک راہِ حقیقت نما کو دیکھ

نکاتِ ارفع

ہے وہی مردِ مصیبت میں بھی جو اُف نہ کرے
کسی تکلیف کے سہنے میں تکلّف نہ کرے
کام اگر خلقِ خدا کا ہو نکلتا کوئی
جان دینے میں بھی انسان توقّف نہ کرے
جسے امکانِ رفاقت ہو برادر ہے وہی
بھائی بھائی سے گِلہ صورتِ یوسف نہ کرے
کیا حیاتِ ابدی کی ہو کسی کو پہچان
جیتے جی موت سے پیدا جو تعارف نہ کرے
نہیں ممکن ہے فرشتوں سے بھی اس کی اصلاح
عیب پر اپنے جو اظہارِ تاسّف نہ کرے
گنگ ہوجائے اگر ایسی زباں تو بہتر
ظلم پر جو کسی ظالم کے کبھی تُف نہ کرے
سیرِ باطن کا منوّر کو نہو لطف نصیب
دیدہ و دل کو اگر صرفِ تصوّف نہ کرے

دہلی - ۱۹۲۹ء

نظرؔ[1] مرحوم کا خواب میں دیدار

ملا ہے مجھ کو یہ ثمرہ مری عقیدت کا
کہ خواب میں نظر آئے مجھے جنابِ نظرؔ

ہے اعتراف مجھے ان کی خاص شفقت کا
نہیں زمانے میں پیدا کہیں جوابِ نظرؔ

بندھا تھا عالمِ رؤیا میں اک عجیب سماں
بڑے ادب سے میں سنتا ہوں گفتگوئے نظرؔ

جو میرے دل میں ہے اصلاحِ شعر کا ارماں
خیال سوئے نظر ہے نگاہ سوئے نظرؔ

وہی تھی شکل وہی گفتگو وہی انداز
وہی لباس بدن پر تھا روزمرّہ کا

تھی لفظ لفظ میں اک خاص قوّتِ اعجاز
کشش سے جس کی کھنچا جا رہا تھا دل میرا

صدا معاً مرے دل سے اٹھی کہ ہائے نظرؔ
پھر اپنے چار طرف آنکھ کھول کر دیکھا

مگر کہیں بھی تو مجھ کو نظر نہ آئے نظرؔ
نگاہِ غور سے ہر چند ادھر اُدھر دیکھا

مرے خیال! کہاں اب نظر ہیں جلوہ فگن
مرے قیاس! بتا دے مجھے نشاں ان کا

انہیں کی ذات سے اب تک لگی ہوئی ہے لگن
ہے کس دیار میں کس شہر میں مکاں ان کا

---

[1] استاذی مغفور منشی نوبت رائے صاحب نظرؔ لکھنوی

میں آج اپنا تجھے نامہ بر بناتا ہوں
نظر کے پاس یہ لے جا ذرا پیام مرا
قدم قدم پہ ابھی ٹھوکریں میں کھاتا ہوں
نگاہِ فیض کا محتاج ہے کلام مرا

ہے آج زینتِ کاشانۂ عدم ان سے
کہ روح قالبِ خاکی میں جلوہ فرما ہے
سنوں گا جا کے میں افسانۂ عدم ان سے
یہ لوں گا درس کہ مقصودِ شاعری کیا ہے

اگر نہیں ہے تناسخ جہاں میں کوئی چیز
عدم میں گرم ادیبوں کی صحبتیں ہوں گی
وہاں نظر سا بھی اک ہو گا صاحب تمیز
نصیب شعر و سخن کی حلاوتیں ہوں گی

کسی ادیبِ ارسطو وقار سے پوچھو
جو بزم شعر و ادب میں تھا مرتبہ ان کا
وگرنہ مجھ سے عقیدت شعار سے پوچھو
تھا قولِ خضر سے بھی بڑھ کے مشورہ ان کا

مچل رہا ہے کلیجے میں نالۂ دلگیر
ہو اشکبار یہ ضد دیدۂ پُر آب کی ہے
بتا دے کوئی مجھے میرے خواب کی تعبیر
دل حزیں میں عجب حالت اضطراب کی ہے

لکھنؤ ۱۹۲۶ء

طوائف سے خطاب

اے وہ کہ مخاطب کرتے ہیں سب جس کو نامِ طوائف سے
اے وہ کہ ملوّث دامن ہے جس کا ہر وقت کثائف سے

اے نشّۂ حسن کی متوالی کیا تجھ کو کہیں ہم متوالی
برباد بڑی بے عقلی سے تو نے یہ نعمت کر ڈالی

کیوں حسن فروشی میں خود کو بدنام سرِ بازار کیا
ماں باپ کی عزت رکھنی تھی اور ان کو ذلیل و خوار کیا

شرکت منظور ہوئی تجھ کو مردوں کی نفس پرستی میں
مسکن ہے گو کہ بلندی پر رہتی ہے لیکن پستی میں

حاصل تھی دولتِ حسن اگر عصمت کا مزا بھی چکھنا تھا
رسوا نہ اسے یوں کرنا تھا، پردہ میں چھپا کر رکھنا تھا

حسن ایسی گراں قیمت شے کو اتنا سستا کیوں بیچ دیا
کانٹوں کے مول زمانے میں یہ پھول بنا کیوں بیچ دیا

کس درجہ ہوئی تیرے ہاتھوں تحقیرِ فنِ موسیقی کی
پھوٹی ہے تیرے ہاتھوں سے تقدیر فنِ موسیقی کی

کمبخت وہ دن تھا آئی جب تو اہلِ ہوس کے کہنے میں
آتی تھی تجھ پر کون آفت پابندِ عصمت رہنے میں

کیوں حسن نہ تجھ سی شائی ہو کی قدر نہ کچھ تو نے اسکی
ملتی ہے اسی کو دولت یہ ہوتی ہے بڑی قسمت جس کی

عصمت کی جلا سے رکھنا تھا محروم نہ اس آئینے کو
کوڑی کے مول لٹا دینا تھا کیا ایسے گنجینے کو

کیوں اس سے دلِ نہ تڑپ اُٹھے کیسے نہ ہمیں رونا آئے
بننا تھا جسے گھر کی دیوی، بازار کی عورت کہلائے

دہلی۔ مطبوعہ رسالہ گرہستی [illegible]

بہادری

کیا بتائیں تمہیں ہم، چیز شجاعت کیا ہے
فلسفہ اس کا ہے کیا، اس کی حقیقت کیا ہے

ہم نے جب دیدۂ تحقیق سے دیکھا ہے اسے
کچھ سوا عرش سے بھی پایہ میں پایا ہے اسے

ہے شگفتہ چمنِ فطرتِ انساں اس سے
روح کا جوہرِ پنہاں ہے نمایاں اس سے

شمعِ اخلاق کی لَو، نیّرِ تہذیب کی ضَو
حُسنِ باطن کا ہے یہ ایک جلالی پرتو

صیقلِ آئینۂ جوہرِ ایثار ہے یہ
بے گناہی پہ کھڑی ہے جو وہ دیوار ہے یہ

مدّعا رحم کا انصاف کا مقصد ہے یہ
ان اقالیم کی اک باہمی سرحد ہے یہ

نہیں ہر اک پہ عیاں رازِ نہانی اس کے
مختلف جور و ستم سے ہیں معانی اس کے

مرتبہ جانتا ہے ایک زمانہ اس کا
پاک تر، ترک کے بانے سے ہے بانا اس کا

امنِ عالم کے تحفّظ کی سبیل اس سے ہے
تیغِ اخلاق اگر ہے تو اصیل اس سے ہے

نام کو بھی کہیں باطل سے ہے رشتہ اس کا
عشق کے جذبۂ کامل سے ہے رشتہ اس کا

حُسنِ صورت کا وجود اس کی بقا میں شامل
حُسنِ سیرت کا نشاں اس کی حدوں میں داخل

ہے جہاں حُسن، شجاعت بھی ہے موجود وہاں
ہے جہاں عشق وہیں اس کے ہیں پیدا امکاں

بادۂ روح کا پیمانہ ہے رنگیں اس سے
حُسن اور عشق کا افسانہ ہے رنگیں اس سے

جب شجاعت کی بدولت ہوئی حیوان کی قدر
کیوں نہ پھر اس سے بڑھے دہر میں انسان کی قدر

شیر ممتاز اگر ہے تو شجاعت سے ہے
اس کا اعزاز اگر ہے تو شجاعت سے ہے

منحصر یہ نہیں دولت کی فراوانی پر
کچھ مدار اس کا نہیں شوکتِ سلطانی پر

ہے بڑی بات شجاعت کا میسّر ہونا
نہیں ہر شخص کی قسمت میں سکندر ہونا

ہے اگر سلسلۂ عمر کو گھٹنا۔ گھٹ جائے
مدعا اس کا ہے، سرِ راہِ وفا ہیں کٹ جائے

زیر دستوں پہ کبھی ہاتھ نہ زنہار اُٹھے
حق پرستوں پہ نہ تیغِ جگر افگار اُٹھے

رَن میں دائم پئے پامالیِ باطل آنا
جو زبردست ہو صرف اس کے مقابل آنا

ہم نے سمجھی ہے جو کچھ اس کی حقیقت ہے یہی
یہی مردانگی ہے اور شجاعت ہے یہی

دھلی

رُباعی

ہے روشنی پھیلی ہوئی دور و نزدیک
دُنیا نظر آتی ہے تجھے کیوں تاریک؟

ہے زاویہ ہی تیرا غلط سرتا سر
تو پہلے نگاہ کو تو اپنی کر ٹھیک

رُباعی

لہریں گننا نہ کچھ نہانا ہے تجھے
ساحل کی ہوا فقط نہ کھانا ہے تجھے

ملّاح کو ساتھ لے کے کشتی میں بیٹھ
دریا کو عبور کر کے جانا ہے تجھے

راجپوتی حُسن
یا
اُپلے والی

سفر جے پور کے ایک دلفریب منظر کی یاد

اک شب کو جب میں ہمدم مصروف تھا سفر میں
روشن تھا میرے دل میں بجھ کر چراغِ محسنؔ[1]
سینہ کا گوشہ گوشہ ماتم کدہ بنا تھا
میں پھر بھی تھا اکیلا گو ہم سفر کئی تھے
سانچے میں شعریت کے کوئی نہیں ڈھلا تھا
پڑھ کر کلیمؔ[2] دہلی بہلا رہا تھا دل کو
تسکیں کی فضلِ حقؔ[3] نے صورت مجھے دکھا دی
تھی مظہرِ لطافت اک دیدہ زیب سُرخی
جذباتِ جوشؔ کی یہ منظوم داستاں تھی
تھا جانستاں وہ منظر جے پور کے سفر کا
اک حُسن خوابِ منزل آنکھوں میں جلوہ گر تھا

گو جسم ریل میں تھا رکھی تھی جان گھر میں
کرتی تھی کام اپنا تاثیر داغِ محسنؔ
قدرت کی مصلحت سے میں غمزدہ بنا تھا
ڈبہ میں جس قدر تھے دنیا کے آدمی تھے
اک میں ہی تھا جو اس کے آغوش میں پلا تھا
تسنیم میں ادب کی نہلا رہا تھا دل کو
آنکھوں کے سامنے تھی جنگل کی شاہزادی[4]
آنکھوں میں بس رہی تھی یہ دلفریب سُرخی
رگ رگ میں زندگی سی جس سے رواں دواں تھی
تھا کلک جوشؔ گویا رہزن دل و نظر کا
بھڑکا دہ بن کے شعلہ سینے میں جو شرر تھا

---

[1] اشارہ ہے ماموں صاحب قبلہ جگدمبا پرشاد صاحب قیصرؔ لکھنوی کے انتقال پُر ملال کی طرف (۲) کلیمؔ دہلی شاعر انقلاب محبّی حضرت جوشؔ ملیح آبادی کا قوم پرست رسالہ (۳) مسٹر فضل حق قریشی ایم اے (۴) جنگل کی شاہزادی حضرت جوشؔ ملیح آبادی کی ایک نہایت کامیاب نظم ہے۔

میں سیر کر رہا تھا رنگینیٔ نظر کی !
یاد آ گئی مجھے بھی جے پور کے سفر کی !!

دل میں خیال بن کر وجہ فساد آیا
جُھرمٹ وہ لعبتانِ سیمیں کا یاد آیا

جن کے قدم غلط یوں پڑتے اِدھر اُدھر تھے
چھٹکے ہوئے ستارے گویا زمین پر تھے

اک چاند بھی مگر اُس جُھرمٹ میں جلوہ گر تھا
تھی تاج کی عمارت، یا قالبِ بشر تھا

پتھر کی مورتی میں پڑتی تھی جان جس سے
چکّر میں آ رہے تھے ہفت آسمان جس سے

شیریں بیانیاں تھیں رنگین نوائیاں تھیں
ملبوسِ پارسا میں کافر ادائیاں تھیں

محشر خرامیاں تھیں رعنائیوں میں اس کی
تھا ماہِ نو کا پرتو انگڑائیوں میں اس کی

گالوں کی تازگی میں گلشن مہک رہے تھے
آنکھوں کی پُتلیوں سے تارے چھٹک رہے تھے

بھر بھر کے جامِ صہبا گُل کو پلا رہی تھی
ہونٹوں کی مُسکراہٹ کلیاں کھلا رہی تھی

انداز تھا انوکھا تھی ہر ادا اچھوتی !
پلکیں چلا رہی تھیں تلوار راجپوتی

اُپلوں کا ٹوکرا اک رکھا ہوا تھا سر پر
سینے پہ بوجھ تھا کچھ، کچھ بوجھ تھا کمر پر

یہ تو خدا ہی جانے کیا بات کر رہی تھی
پُھرتی میں تتلیوں کو بھی مات کر رہی تھی

زیور نہ زیبِ تن تھے پھر بھی سجی ہوئی تھی
نازک بدن تھی ایسی گویا چھوئی موئی تھی

اس نازکی میں لیکن شامل تھا بانکپن بھی
پھولوں کی شاخ میں تھے تلوار کے چلن بھی

تھی آن کی پجارن یہ بات کی دھنی تھی !
عفت میں لکشمی تھی عصمت میں پدمنی تھی

دامانِ بوالہوس کو پیروں سے روندتی تھی
خرمن پہ معصیت کے بجلی سی کوندتی تھی

بھولے سے بھی جو آکر اس کو وہ چھیڑ دیتی
پیراہنِ صبا کے بخیے اُدھیڑ دیتی

روکے تھی زورِ بحرِ عصیاں کے جزر و مد کا
ہوتا تھا سرد شعلہ اس سے نگاہِ بد کا

پاکیزگی کا جوہر کرتا تھا ضو فشانی !
تھی جس کے گھر کی رانی تھی اُس کے گھر کی رانی

تھی رشکِ صد امارت اُس کے لئے غریبی !
ناداریوں میں اس کی شامل تھی خوش نصیبی

تابانیوں سے اس کی تسخیر تھا زمانہ! — دولت سے حسن کی تھا معمور یہ خزانہ

یہ بھی نہ راستے میں معصوم کو پتا تھا — کون اس کی سمت کیسی نیت سے دیکھتا تھا

کھینچے تھی ہاتھ اپنا نذرِ دل و جگر سے — بے لاگ شمع تھی یہ پروانہ نظر سے

عصمت کے بوستاں کی اک منھ بندھی کلی تھی — صرف اپنے کرشن کی ہی رادھا یہ لاڈلی تھی

میری نگاہ میں بھی گو اس سے خیر گی تھی — نفس زبوں کی لیکن کافور تیرگی تھی

میرے لئے بھی فتنہ گو حسن دلربا تھا — لیکن جمالِ قدرت میں اس میں دیکھتا تھا

دل میں یہ سوچ کر میں لیکن تھا وقفِ حیرت — اُپلوں کے پاتھنے سے کیا دلبری کو نسبت

جو پیکرِ حسیں ہو لعل و گہر کے لایق — جس کی جبینِ تاباں ہو تاجِ زر کے لایق

ہو درخورِ حکومت جس کی یہ کج نگاہی — دنیا تھا زیب جس کے تن پر لباسِ شاہی

ناگن فسوں ہیں جس کی زلفوں کا سلسلہ ہے — کیسے اسیری کا جامہ اُسے ملا ہے

ہر وقت باندیوں کو رہنا تھا ساتھ جس کے — مہرِ لبِ شہی کے قابل تھے ہاتھ جس کے

فطرت کی لغزشوں سے کیوں جائے اُس کے ماتھے
جو حسن کی ہو دیوی اُپلے وہ آہ! پاتھے

۱۹۳۷ - دوران سفر

ابر و باراں

جامنی رنگ کا مشرق سے اُٹھا ہے بادل دیدۂ چرخ میں یا پھیل گیا ہے کاجل
مست ہاتھی چلے آتے ہیں یہ باندھے ہوئے بادل آبنوسی یہ بنا ہے کوئی گردوں پہ محل
مرغ آبی کہیں کس طرح کہ بے پر ہے یہ
ایک اُڑتا ہوا پانی کا سمندر ہے یہ

کوہ سُرمہ کا ہے یہ اوج ہوا پر کوئی یا ہے بھیگے ہوئے کاغذ پہ سیاہی پھیلی
انجن ایک یہ گویا ہے رواں بھونروں کی یا ہے اک دیو صفت ریچھ کی تصویر بنی
اہلِ دنیا کی جہالت کا سویدا ہے یہ
یا کسی دیدۂ پُر آب کا چربا ہے یہ

کسی بدمست کے ہاتھوں سے یہ بکھری ہو مسی یا لپکتی ہے یہ ناگن کوئی کالی کالی
آہ نکلی ہے دھواں بن کے کسی کے دل کی کسی رنجور کے تن پر ہے یہ پوشاک غمی
بحر اسود سے یہ اک موج چلی آتی ہے
حبشیوں کی یہ کوئی فوج چلی آتی ہے

وسعت انگیز کسی کا ہے یہ قلب مایوس ہے سیاہی میں رنگا پردۂ ننگ و ناموس
مائل رقص ہے پھیلا کے پروں کو طاؤس چہ ظلمات ہے یا اوج فلک پر معکوس
کامنی بال یہ اپنے کوئی پھیلائے ہے
نازنیں اک دل مہجور کو اُلجھائے ہے

بھر گیا ہو جو دھوئیں سے وہ غبارہ ہے یہ
راکھ بن کر جو اُڑا ہو وہ شرارہ ہے یہ
مضطرب طشتری چرخ میں پارہ ہے یہ
یا گنہگار کوئی محوِ کفارہ ہے یہ
صبحِ کاذب کا اسے آپ سپیدہ کہیے
یا سیہ فام اک آہوئے رمیدہ کہیے

لاکھ اظہار کمالات میں توڑا ہے قلم
ان تشابیہ کے پردے میں ہے اک پہلوئے ذم
ابر ہے یہ نہ کسی حور کی زلفِ پُرخم
ماتمی ہے نہ حکومت کا یہ شاہی پرچم
کرشن کی موہنی مورت کا مرقع ہے یہ
سانولے شام کی صورت کا مرقع ہے یہ

بال گوپال کی شوخی کی جھلک ہے اس میں
کرشن کے حسن دلآرا کا نمک ہے اس میں
خیرہ آنکھیں ہیں کچھ اس درجہ چمک ہے اس میں
کہ نہاں تابش خورشید فلک ہے اس میں
ایک اس ابر سے ٹھنڈک ہے ہزار آنکھوں میں
جلوہ گر ہو گئی دواپر[1] کی بہار آنکھوں میں

[1] دواپر ہندوؤں کی تقسیم زمانہ کے لحاظ سے ایک دور عظیم کا نام جس میں بھگوان کرشن کا اوتار ہوا تھا باقی ادوار کے نام مشہور ہیں یعنی ست جگ، ترتیا، اور کلجگ۔

(مطبوعہ اودھ اخبار لکھنؤ ۱۹۳۶ء)

شبنم کے قطرے

۱۹۱۴ء کی ایک نظم

یہ خوشگوار قطرے یہ پُر بہار قطرے
شبنم کے دیدنی ہیں یہ آبدار قطرے
سینہ ہے چاک اُن کا بے چاک اُن کا سینہ
رکھتے ہیں موتیوں سے بڑھ کر وقار قطرے
پھولوں کا رنگ دلکش قطروں سے آئینہ ہے
ہیں رشک حور و غلماں یہ گلعذار قطرے
قدرت نے خوشنمائی کچھ ایسی ان کو دی ہے
دل چاہتا ہے دیکھوں میں بار بار قطرے
لے لو ابھی تھے پتّوں پر بے شمار قطرے
اب رہ گئے ہیں باقی بس تین چار قطرے

افسوس ان کی ہستی ہے ایک ہی پل کی
نذر فنا یہ ہوں گے انجام کار قطرے

تیرا بھی ایک دن اے انساں یہ حال ہوگا
تیرا ریاضِ ہستی بھی پائمال ہوگا
پیدا یہ جسم تیرا ذرّات خاک سے ہے
پھر خاک ہی میں ملنا تیرا مآل ہوگا
باتیں حیات کی سب ہو جائیں گی فسانہ
تیرا بھی ذکر آخر خواب و خیال ہوگا
پیچھے پڑے ہوئے ہیں قاصد شہ قضا کے
چنگل سے ان کے بچنا تجھ کو محال ہوگا

قطروں سے لے سبق ہے موہوم ان کی ہستی
تیری بھی اے مُنوّر ہے چار دن کی ہستی

لکھنؤ۔ مطبوعہ اخبار "تفریح"

حضرتِ جوشؔ سے خطاب

(رسالۂ کلیم میں حضرتِ جوشؔ کے ایک مضمون پر)

ہے قابلِ فخر و ناز ہستی تیری — دریا طبعی فراغ دستی تیری
توڑی ہیں حدودِ تنگ تُو نے اے جوشؔ — ہے مجھ کو پسند دل سے مستی تیری

اے شاعرِ کامیاب عہدِ حاضر — اے شاعرِ انقلاب عہدِ حاضر
تسلیم کہ آیا ہے سمٹ کر تجھ میں — یہ عالمِ اضطراب عہدِ حاضر

ہاں باعثِ صد گرمیٔ بازار ہے تو — ہاں جنسِ محبت کا خریدار ہے تو
تجھ کو ہمہ تن جوش سمجھتا ہوں میں — جامِ صہبا کی طرح سرشار ہے تو

دل سے وطنیت کا پرستار بھی ہے — ذہنیتِ عامہ سے بیزار بھی ہے
میں تیرے عقائد کو سمجھتا ہوں خُوب — قربانیٔ جسم و جاں کو تیار بھی ہے

میرا بھی وہی ہے جو ہے ایمان تیرا — معبود ہے میرا جو ہے "انساں" تیرا
اے جوشؔ تجھے میں دل کا دریا سمجھوں — اپنی حد میں رہے جو "طوفاں" تیرا

اس وحی، اس الہام کا کیا ہی کہنا — اس درسِ خوش انجام کا کیا ہی کہنا
ہو امنؔ[1] کے انداز میں اے جوشؔ اگر — مشفق، ترے پیغام کا کیا ہی کہنا

مطبوعہ الکلیم دہلی

[1] مراد ہے منشی گوپی ناتھ امنؔ لکھنوی اسسٹنٹ ایڈیٹر "تیج" سے

ہولی کا ایک لطیف تخیّل

دیکھنا اُٹھ کر کہ کس کے پاؤں کی آہٹ ہے یہ — آگ یہ کس نے لگا رکھی ہے بن میں ڈھاک کے
اک جھلک ہے یہ کسی کے آتشیں رخسار کی — ہم بہت مشتاق تھے اس کے جمالِ پاک کے

کھڑکھڑاہٹ ڈھاک کے پتوں کی بے معنی نہیں — وہ کہیں چشمک زن گردوں ہے شعلہ آگ کا
رندِ دورِ آخری ہیں مست ہیں ساغر بدست — سرزمینِ ہند میں آیا ہے موسم پھاگ کا

اک بلا کا سحر ہے نیرنگیِ دنیائے چشم — اس میں کچھ موسم کی تبدیلی کی بھی تاثیر دیکھ
رُخ ہوا کا جس طرف بدلا اُدھر پہنچی نگاہ — انقلاب دہر کی یہ دلفزا تصویر دیکھ

چھیڑ کی لیتا ہے پہلو سے بغلگیری کا شوق — دل جگر کے ساتھ اُچھلتا ہے خوشی کے جوش میں
بیخودی کا رنگ آنکھوں سے ہے کیا کیا آشکار — پھول بن کر جانشیں کوئی ہوا آغوش میں

بانس باڑی سے لڑی رہتی ہے کیطل اُوشا کی آنکھ — کہہ رہی ہے کس سے آخر خواب پچھلی رات کا
ہے کہیں کوئی مصوّر کوئی شاعر بھی یہاں — کون کر پائے گا اندازہ مرے جذبات کا

چال مستانہ نمایاں اک عروسانہ حجاب — اُف اُچھلتا پاؤں اِس رفتار پر مفتوں ہوں میں
اک پسِ پردہ ادائے باطنی ہے آشکار — ہر نفس دلدادۂ انداز گوناگوں ہوں میں

آنکھ چھپکائے ہوئے منھ اُس طرف سینہ پہ ہاتھ
آنکھ بھر کر اپنے پہلو میں نظارہ بھی کیا
بے حجابانہ دکھائی حُسن باطن کی جھلک
پھر حیا سے رازداری کا اشارہ بھی کیا

آنکھ کے پردوں میں ناچیں مست ہو کر پتلیاں
نشّہ بے مے کی مستی میں غضب کا جوش ہے
یا مت رندانِ بلاکش کو بھی یہ حاصل کہاں
بے خودی میں ہوش بیہوشی کا کس کو ہوش ہے

شبنمی چادر بدن پر اور بھیگا سا لباس
مل گئی گو ناجبینِ ناز پر چُھپکے سے دُھول
کیوں نہ خارستاں میں کانٹوں کو بھی سوجھے چھیڑ چھاڑ
بوسہ کش کیوں دستِ سنگیں سے نہ ہوں دیبو کے پھول

ہر ملک آنکھوں سے کہتی ہے کہ پچکاری چلے
اس کے دم دم پر جھپکنے کا یہی شاید ہے راز
قمقموں سے چوٹ کرنے کے لئے سینہ سپر
بیخودی میں آہ دستِ شوق ہیں ہر سو دراز

اے منور دل پہ کوئی رنگ چڑھنا شرط ہے
خود بخود کھُل جائے گا تیری سخن سنجی کا راز
حُسن باطن کا کرِیں گا فاش میں پردہ ضرور
دیکھ پہلو مارتا ہے یوں حقیقت سے مجاز

(مطبوعہ دربار لکھنؤ)

کوئٹہ کی تباہی

آ رہے ہیں کیوں الٰہی زلزلے پر زلزلے
ہند میں برپا ہیں آثارِ قیامت کس لئے

کیا ہے ان فتنوں کی بیداری میں آخر مصلحت
سو گئی اس خطۂ دلکش کی قسمت کس لئے

ہم نہ بھولے تھے ابھی بربادیٔ ارضِ بہار[1]
ہو گئی کوئٹہ پہ یہ نازل مصیبت کس لئے

کیوں ہوا شیرازۂ امن و فراغت منتشر
درہم و برہم ہوئے اسبابِ راحت کس لئے

اہلِ دولت مل گئے مٹّی میں کیوں دولت کے ساتھ
اہلِ ثروت ہو گئے محرومِ ثروت کس لئے

اس چمن کو کس خطا پر تو نے ویراں کر دیا
ہے سپرِ آتشِ دوزخ یہ جنّت کس لئے

یہ تمنّاؤں کی پامالی یہ ارمانوں کا خون
کر دیا دستِ اجل نے کتنے انسانوں کا خون

سیم و زر میں جو تُلا کرتے تھے وہ مفلس ہیں آج
گھر میں جن کے لُطفِ جنّت تھا وہ بے گھر ہو گئے

خانداں کے خانداں گویا کبھی تھے ہی نہیں
بیبیاں رخصت ہوئیں معدوم شوہر ہو گئے

باپ، بھائی، بیٹیاں، بیٹے بہن ہمدم عزیز
کشتۂ یک گردشِ چرخِ ستمگر ہو گئے

قبض بیدادِ اجل سے روح لاکھوں کی ہوئی
دفن زندہ ڈھیر میں مٹّی کے اکثر ہو گئے

غیر کے محتاج ہو کر اب رہیں گے یہ غریب
آدمی بیکار لاکھوں چوٹ کھا کر ہو گئے

اپنے گھر کو بھی الٰہی تو نے غارت کر دیا
مسجدیں عنقا ہوئیں پامال مندر ہو گئے

منظرِ پُر ہول ہے پیشِ نظر آخر یہ کیا
ہو رہا ہے اے خدائے بحر و بر آخر یہ کیا

دہلی ۱۹۳۶ء
مطبوعہ روزنامہ "وطن"

[1] صوبہ بہار کا وہ زبردست زلزلہ جس نے ۱۹۳۴ء میں قیامت ڈھا دی تھی

بسنت

پھر کچھ بدل رہی ہیں خورشید کی نگاہیں — اُٹھنے لگیں دلوں سے پھر گرم گرم آہیں

لبریز ہو رہا ہے پیمانۂ زمستاں — آیا ہے خاتمہ پر افسانۂ زمستاں

موقوف ہو رہی ہے گردوں سے برفباری — دامانِ کوہ میں ہیں پھر آبشار جاری

سرما کی تھی وہ شدّت جھیلیں جمی ہوئی تھیں — تھا ملتوی تموّج نہریں تھمی ہوئی تھیں

پہلے کی طرح ان میں پھر آ گئی روانی — اک جنبشِ ہوا سے پھر ہو گئی ہیں پانی

پھر موم ہو رہے ہیں جو سنگ زن بنے تھے — سیّال ہیں وہ دریا جو یخ کی سِل بنے تھے

بادِ شمال میں اب عنقا ہے زورِ طوفاں — بادل پھٹے پھٹے سے ہیں کچھ ہوا میں پرّاں

سردی جو اک جہاں کو بے موت مارتی تھی — ارض وسما پر اپنی گرمی اُتارتی تھی

بیچارگی پہ اشکِ حسرت بہا رہی ہے — اُٹھتے ہیں پاؤں اُس کے دنیا سے جا رہی ہے

جاڑا ہے اب نہ گرمی موسم بسنت کا ہے — دنیا بسنت کی ہے عالم بسنت کا ہے

ہر چیز سے ہے ایسا رنگ بہار پیدا — ہے عالمِ سکوں میں اک انتشار پیدا

طوفاں سمندروں میں دریا میں ہے تلاطم — کُہسار ہیں دو رویہ آمادۂ تصادم

قدرت نے کی ہیں پیدا رنگینیاں فضا میں — نکہت ہے زعفراں کی ہر موجۂ ہوا میں

نیرنگئ تصور مضطر بنا رہی ہے — فتنے جو سو رہے تھے اُن کو جگا رہی ہے

جذبات کا تقاضا پیہم اُبھارتا ہے — چھُپ چھُپ کے کون آخر یہ تیر مارتا ہے

کچھ ہاتھ پاؤں ایسے بے رحم نے نکالے — دل سب کے ہو رہے ہیں اللہ کے حوالے

زینت کمانِ گُل سے ہے دستِ نازنیں کی — مہتاب میں ضیا ہے اس کے رخِ حسیں کی

لب مائل تبسم آنکھوں میں کیف پنہاں — سیّارہ وار جن میں ہر مردمک ہے رقصاں
ہے ارتعاش جس سے دنیائے دل میں پیدا — اِک حالتِ تزلزل ہے آب و گل میں پیدا
دیکھا ہے اس ادا سے مدہوش کر دیا ہے — مدہوش کر دیا ہے خاموش کر دیا ہے
اندامِ دلربا ہیں سب لوٹ پیرہن سے — محجوب ہی نہیں ہے عُریانیٔ بدن سے
رعنائیوں میں پیدا طفلانہ شوخیاں ہیں — طفلانہ شوخیاں ہیں مستانہ شوخیاں ہیں
مستانہ شوخیاں ہیں صبر و سکوں کی رہزن — رندانہ شوخیاں ہیں تقویٰ کی خاص دشمن
بالوں کے پیچ سب کو چکّر میں ڈالتے ہیں — دل کی تباہیوں کے پہلو نکالتے ہیں
معصومیت گندھی ہے سر رشتۂ نظر میں — گل ہائے جانفزا کی ہے کردھنی کمر میں
ہے مشک کا خزانہ نافِ شکم نہیں ہے — منظر یہ دیکھنے کا آنکھوں میں دم نہیں ہے
اس سحر سے خدائی مسحور ہو گئی ہے — مسحور ہو گئی ہے مجبور ہو گئی ہے
ایسا سماں بندھا ہے ایسی ہوا چلی ہے — مائل شگفتگی پر ہر منہ بندھی کلی ہے
شاخِ شجر سے لپٹی ہیں دلفریب بیلیں — طاؤس کر رہے ہیں گلزار میں کلیلیں
قمری ہو خواہ بلبل کوئل ہو خواہ سارس — کمبخت دل کے ہاتھوں سب ہو رہے ہیں بے بس
چکّر میں فصلِ گُل کے زاغ و زغن پڑے ہیں — جنگل میں ہرنیوں کے پیچھے ہرن پڑے ہیں
اس فصل کا اثر ہے از ماہ تا بماہی — ہر لب پہ آج کل ہے فریادِ بے پناہی

ایسے میں ہو الٰہی حسرت زدہ نہ کوئی
مرگِ وفا سے دل ہو ماتم کدہ نہ کوئی

دہلی - ۱۹۳۰ء

وصالِ مہرؔ

دہلی کے برگزیدہ شاعر باکمال و عارف عدیم المثال جناب منشی سورج نراین صاحب مہرؔ کے انتقال پر

نظر میں جن کی ہستی تھی نیستی ہستی — تھی ہستی عالم ہستی میں جن کی واقعی ہستی
کوئی ہم سے یہ پوچھے کس قدر تھی وہ بڑی ہستی — نہایت پاک تھی سورج نراین مہرؔ کی ہستی

شرف روح القدس سے بھی سوا آج ان کو حاصل ہے
کہ ان کی روح روحِ عالمِ بالا میں واصل ہے

ہوا آئینہ شفاف یہ گم اپنے جوہر میں — یہ دریائے مصفا مِل گیا آخر سمندر میں
ہوئے اربعہ عناصر محو اپنے اپنے مصدر میں — سفر کو گھر سے جو نکلا تھا پھر داخل ہوا گھر میں

یہ ثمرہ بعد ترک جسم ہے عرفاں شناسی کا
حقیقت کر رہی ہے پیش جامہ بے لباسی کا

وہ عالم عالمِ ناسوت بھی اک جزو جس کا ہے — وہ عالم عالمِ جبروت بھی اک جزو جس کا ہے
وہ عالم عالمِ ملکوت بھی اک جزو جس کا ہے — وہ عالم عالمِ لاہوت بھی اک جزو جس کا ہے

بلند اس سے بھی کچھ مسکن ہے روحِ مہرؔ کامل کا
بتا سکتا نہیں کوئی ٹھکانا اس کی منزل کا

ضیا تھی دیدۂ پُرنور میں آ درخشاں کی — ازل سے مشتعل تھی آگ اس میں عشق و عرفاں کی
دلِ صافی سے ملتی تھی خبر اسرارِ پنہاں کی — خدا کا نور تھا پرتو فگن صورت میں انساں کی

جو عارف ہیں انہیں وہ عارف کامل سمجھتے تھے
وقارِ مہرؔ کیا کچھ تھا یہ اہلِ دل سمجھتے تھے

نہ فکرِ خود نمائی تھی نہ شوقِ جاہ و منصب تھا غرض تھی کچھ نہ دنیا سے نہ کچھ عقبیٰ سے مطلب تھا
جو کچھ تھا سرمد و خیّام کا ان کا بھی مشرب تھا محبّت ان کا ایماں تھا محبت ان کا مذہب تھا

کوئی عالی نسب ایسا کوئی والا نژاد ایسا
نہیں ہے قوم میں اب واقفِ علم معاد ایسا

نہ آزادی سے رغبت تھی نہ شکوہ تھا اسیری کا جوانی کی مسرّت تھی نہ غم تھا عہدِ پیری کا
امارت پر تھا غالب دبدبہ شغلِ فقیری کا لباسِ دنیوی پردہ نہ تھا روشن ضمیری کا

پسند خاطر ہیگا نہ و خویش ایسے ہوتے ہیں
یہ دیکھیں دیکھنے والے کہ درویش ایسے ہوتے ہیں

کہیں سلمان ساوجی کا پایہ ان کو دیتے ہیں کہیں فردوسی و طوسی کا پایہ ان کو دیتے ہیں
اگر کچھ حافظ و سعدی کا پایہ ان کو دیتے ہیں تو اکثر شمس تبریزی کا پایہ ان کو دیتے ہیں

بلند اتنی ملی تھی فیض مرشد سے نظر ان کو
جنک[۱] کی یاد آتی تھی ہمیشہ دیکھ کر ان کو

سخنور وہ سخن سے جن کے تھی روحِ سخن پیدا کیا تھا زورِ بازو سے کمالِ علم و فن پیدا
گہر ریزی سے ان کی ہو گئے لاکھوں عدن پیدا گل افشانی سے ان کی تھے چمن اندر چمن پیدا

رہا کرتی تھی دل میں کیفیت اک خاص مستی کی
مگر آزاد ہیں اب کشمکش سے مرگ و ہستی کی

کس اطمینان سے لاہور میں رخصت ہوئے ہم سے ہمیشہ کے لئے توڑا تعلق بزمِ عالم سے
فضائے خلد گونج اٹھی ہے ان کے خیر مقدم سے کرے کوئی نہ یاد ان کو منوّر اشکِ ماتم سے

نہ غم کچھ عارفوں کو ہو نہ صدمہ کچھ ادیبوں کو
کہ موت ان کی سی ہوتی ہے میسّر خوش نصیبوں کو

دہلی۔ مطبوعہ "تیج" دہلی

[۱] بھگوان رامچندرجی کے خسر اور حکومت متھلا پوری (موجودہ بہار) کے فرمانروا جو تاجدار وقت ہوتے ہوئے بھی دنیا سے بے تعلق رہتے تھے۔

برسات

سماں یہ دیکھ سوئے آسماں نگاہ اُٹھا — کہاں سے ابر کا یہ لکہ سیاہ اُٹھا

کسی کے سینۂ سوزاں سے دودِ آہ اُٹھا — کوئی تپش سے غمِ ہجر کی کراہ اُٹھا

وہ رعب و داب سحاب مطیر بیٹھ گیا — نہ پھر کبھی سرِ طوفان گردِ راہ اُٹھا

چھپی ہیں اس کی قبا میں ہزارہا توپیں — گرج سے رعد کی اک شور بے پناہ اُٹھا

شکوہ ابر درافشاں چڑھا وہ نظروں میں — وقار مہر اُٹھا اعتبار ماہ اُٹھا

چمک رہی ہیں جو یوں بجلیوں میں تلواریں — ستیز کو ہے کوئی ہمرہ سپاہ اُٹھا

ہے ضدّ فصل نمو گرچہ شعلہ باری برق — مگر نہ روئے زمیں سے وجود کاہ اُٹھا

بہار موسم باراں سے دل شگفتہ ہے — قدم جو سیر کو گھر سے دمِ پگاہ اُٹھا

اُجالی رات کے منظر کو برشگال میں دیکھ — نظر تو جانبِ سیلاب نور ماہ اُٹھا

ثواب کا تجھے لذّت سے لطف حاصل ہے — کچھ اب خدا کے لئے لذّت گناہ اُٹھا

تعلقات ہوں پیر مغاں کے ساتھ ترے — ہر ایک ناصح و واعظ سے رسم و راہ اُٹھا

گنہ ہے مشرب میکش میں برقراری ہوش — نہ مست ہو کے اُٹھا جو وہ روسیاہ اُٹھا

یہ ایک خاص کرامت ہے بادہ نوشی کی — جو میکدے سے اُٹھا بن کے بادشاہ اُٹھا

مآلِ کار سے واقف ہیں رند لے واعظ — نہ بار بار یہ تکلیف انتباہ اُٹھا

ہے خیر مقدم ابر بہار کا نعرہ — وہ ایک شور جو ماہی سے تا بماہ اُٹھا

زبان شاہ و گدا صرف شکر باری ہے — نگاہ جانب ہر قصر و خانقاہ اُٹھا

گرے فلک سے جو آب زلال کے قطرے — وفور شوق سے مقدم کو آبِ چاہ اُٹھا

محیط ارض و سما دیر سے ہے نغمہ رُوم — حرم سے چار طرف شور لا الٰہ اُٹھا

سحاب فیض رساں سے سبق منور لے

رہ سلوک میں تفریق کوہ و کاہ اُٹھا

دہلی - ۱۹۲۶ - مطبوعہ بھارت دہلی

تاثیرِ سحر

ہوتی ہے نگاہ و دل کی سیری اس وقت کرتی ہے صعود روح میری اس وقت
خود ہی یا رب بجانے کیسے ہر روز آنے لگتی ہے یاد تیری اس وقت

تہ میں اس کی فراغ بالی بھی ہے حرکت یہ رگوں کو دینے والی بھی ہے
ہے صبح صبیح کی منوّر کیا بات اک ساتھ جمالی بھی جلالی بھی ہے

ہمرنگ عروس تو یہ شرماتی ہیں پہلوئے سحر کو گو یہ گرماتی ہیں
ہر سمت بکھیر کر تبسّم اپنا کرنیں سورج کی دل کو برماتی ہیں

خورشید نے چھیڑا ہے کوئی ساز عجیب اس کے پردے میں ہے اک آواز عجیب
نغمے ہیں جگر سوز یہ گویا پیدا کرنوں کے چھٹکنے کا ہے انداز عجیب

دہلی ۱۹۳۸ء

بھیشم پتامہ اور کرشن

ناوک ارجن کی جو چٹکی سے جُدا ہو کے چلے
زندگانی سے پتامہ کی خفا ہو کے چلے

صاعقہ بن کے گئے موج ہوا ہو کے چلے
جان لینے کے لئے تیر قضا ہو کے چلے

لہریں لیتے ہوئے افعی کی طرح بل کھا کر
لشکر بھیشم جرّار میں پہونچے جا کر

پاؤں میں تھی جو سنبھلنے کی ذرا تاب نہیں
آگیا موت کے پیغام کا بھیشم کو یقیں

آن واحد میں ہوئے زینتِ آغوش زمیں
لب تھے ارجن کے لئے وقف ثنا و تحسیں

عرصۂ جنگ میں ایسا قدر انداز ہے تو
جانتا ہوں میں تجھے صاحب اعجاز ہے تو

جو ہیں انصاف کی دولت سے غنی کہتے ہیں
ایسے بیروں کو شجاعت کا دھنی کہتے ہیں

جنگ کہتے ہیں اسے صف شکنی کہتے ہیں
سچ ہے ارجن اسے ناوک فگنی کہتے ہیں

قابلِ رشک ہے دُنیا میں شجاعت تیری
سورماؤں میں بڑھے اور بھی عزّت تیری

کانپ اُٹھا رن جو پتامہ کا ہوا یہ انجام
ہو گیا لشکر طرفین میں برپا کہرام

کوروں کی جو اُمیدوں کا ہوا کام تمام
خانۂ دل میں کیا حسرت و کلفت نے قیام

رنج سے حال دگرگوں ہوا درجودہن کا
کوچ کرنے کو ہے تھا بیر جو اصلی رن کا

چُپ کھڑے رہ گئے میدان میں جبّار تمام
سر جھکائے ہوئے تھے فوج کے سردار تمام
رن میں انگشت بدنداں تھے سپہدار تمام
ہوگئی سرد معاً گرمیِ پیکار تمام
حوصلہ ٹوٹ گیا معرکہ آراؤں کا
ہوگیا خون دشاسن کی تمنّاؤں کا

کون بھیشم سا تھا میدانِ وغا میں یا مرد
نہ ہوا ٹیس سے زخموں کی ذرا چہرہ زرد
راج نیتی کا وہ ماہر وہ فنِ جنگ میں فرد
اک نئی شان سے تھا زینتِ میدانِ نبرد
دھرم کے چھیترِ میں بستر تھا لگا تیروں کا
جلوہ گر جس پہ وہ سرتاج تھا رن بیروں کا

جانتی تھی نہ زباں، چیز ہے کیا آہ و بکا
نہ تبسّم لبِ تقریر سے ہوتا تھا جُدا
شیرِ مجروح کا نعرہ تھا کہ بھیشم کی صدا
پاس آنے سے پتامہ کے دہلتی تھی قضا
وہی تیور تھے وہی شان وہی بانا تھا
تھا طبیعت کا جو انداز وہ مردانا تھا

برہمچرج اپنے اس اعجاز پہ اتراتا تھا
تیج سے چہرے کے خورشید بھی شرماتا تھا
تیر بستر کا ہر اک، پھول نظر آتا تھا
اور بھی غنچۂ اُمید کھلا جاتا تھا
کوئی تکلیف نہیں کوئی اذیّت ہی نہیں
زخم کہتے تھے کہ مرہم کی ضرورت ہی نہیں

پانڈو خدمت اقدس پہ نظر رکھتے تھے
کورو ہر وقت پتامہ کی خبر رکھتے تھے
فکر جانباز کی سب آٹھ پہر رکھتے تھے
عاجزی سے قدم پاک پہ سر رکھتے تھے
دائیں بائیں تھے سب اربابِ طریقت موجود
دیکھئے جس کو وہی تھا پئے خدمت موجود

مورچہ چھوڑ کے نبی الفور جُدھشٹر آئے بھیم و ارجن سے کماندار دسپہ گر آئے
ساتھ سہدیو نکل ایسے دلاور آئے نذر کو جذبِ دونا شوق سے لیکر آئے

درو پدی جلوہ فگن سایۂ داماں میں تھی
چاندنی چھٹکی ہوئی صحن گلستاں میں تھی

مائل پرسشِ احوال ہوئے جب حضّار جنبش لب سے تھا پانی کی طلب کا اظہار
لا کے پانی جو کیا پیش بروئے سردار کر دیا آپ نے چھونے سے بھی اس کو انکار

عجب انداز سے بھیشم نے وہ دیکھا پانی
ہنس کے بولے کہ میں پیتا نہیں ایسا پانی

جو مقابل تھا مرا پیاس بجھائے گا وہی پانی جیسا مجھے درکار ہے لائے گا وہی
آخری وقت مری بات بنائے گا وہی تشنگی میری وم مرگ مٹائے گا وہی

کوئی اس شبد کا اعجاز سمجھ ہی نہ سکا
رمز یہ' بھید یہ' یہ راز سمجھ ہی نہ سکا

سُن کے ارجن نے گرو نیک پتامہ کی صدا کھینچ کر چلّہ سوے ارض سر اک تیر کیا
جب ہوا جزوِ زمیں تیر اُسے کھینچ لیا اس کو دیکھا تو ٹپکتا ہوا پانی نکلا

دست ارجن سے ہوئی دُجمعی بھیشم کی
پیاس اس تیر کے پانی سے بُجھی بھیشم کی

واقعہ دیکھتے تھے لوگ یہ حیراں ہوکر دم بخود رہ گئے انگشت بدنداں ہوکر
کی نظر چار طرف پہلے تو خنداں ہوکر پھر پتامہ نے کہا یہ گہر افشاں ہوکر

کہ مرے جسم کو آرام ذرا سا مل جائے
سر کے رکھنے کو اگر کوئی سہارا مل جائے

سینکڑوں رکھ دیئے اِک آن میں تکیئے لاکر
پریم کے جوش میں ارباب وفا نے آکر
یوں پتامہ نے عزیزوں سے کہا سمجھا کر
پھر بڑے غور سے تکیوں پہ نظر فرما کر

عقل سے کام کرو ہوش میں آؤ تو سہی
میرے کس کام کے تکیئے یہ بتاؤ تو سہی

مجھے جس شے کی ہے اس وقت تمنّا دے گا
میرا ارجن ہی مجھے آکے سہارا دے گا
ہاں بھیّا کو جو ہر طرح ہو زیبا دے گا
چاہیئے مجھ کو جس انداز کا تکیا دے گا

محوِ حیرت ہوئے سب حکمِ پتامہ سُن کے
کوئی تقریر نہ سمجھا یہ سوا ارجن کے

کہ بنے تکیۂ موزوں سرِ بھیشم کے لئے
تیر بالیں کی طرف تین لگائے ایسے
معجزہ اک یہ کیا فن میں کمانداری کے
آن اس طرح پتامہ کی رکھی ارجن نے

دیں تہِ دل سے پتامہ نے دعائیں لاکھوں
لیں بڑے شوق سے ارجن کی بلائیں لاکھوں

ہوا موّاجِ پتامہ کا بھی دریائے کمال
جب جدھشٹر نے کیا پند و نصیحت کا سوال
گلفشاں ہو کے سُنائی خبر ماضی و حال
تھا طبیعت میں جو موجود ابھی استقلال

بہر اندوز کل آئینِ حکومت سے کیا
آشنا راز تدبّر سے سیاست سے کیا

من ہرن، کشٹ دمن، چندر بدن شیام برن
وشنو اوتار، سری کرشن، جسودھا نندن
سامنے خاص پتامہ کے تھے تنویر فگن
جن کے جلوہ سے ہے معمورۂ دنیا روشن

یہ سماں دیکھ کے کچھ آپ کا دل بھر آیا
مدعا دل میں جو پنہاں تھا زباں پر آیا

اے پتا مہ مجھے رہ رہ کے یہ آتا ہے خیال — ختم ہے ذاتِ گرامی پہ یہ سب فضل و کمال
واہ کیا رعب ہے کیا شان ہے کیا استقلال — نہیں ممکن کہ کبھی آپ کی پیدا ہو مثال

حکم اگر ہو تو نہاں آنکھ سے ہونے ہی نہ دوں
موت کی نیند میں سرکار کو سونے ہی نہ دوں

نہ میسّر ہمیں ہوگا کبھی ایسا کامل — ایسا ذی علم خردمند ہنرور عاقل
ایسا آزاد منش ایسا مدبّر فاضل — مبتلائے غمِ دنیا نہ ہوا آپ کا دل

زندگی آپ کی کہئے تو اٹل ہو جائے
بے نیاز آپ کی صورت سے اجل ہو جائے

شبد بھگوان کے تھے بحرِ اثر میں غرقاب — شکل سیماب ہوا قلب پتا مہ بیتاب
پریم کے آنسوؤں کا رُخ پہ تھا جاری سیلاب — لبِ تقریر پہ بیساختہ آیا یہ جواب

دل مرا روئے جمالی کی پھبن کے صدقے
آہ میں آپ کے اندازِ سخن کے صدقے

آپ ہاتھوں میں لئے رہتے ہیں دل بھگتوں کے — آبدیدہ نہ ہوں کیوں دیکھ کے مجبور مجھے
تھا جو منظور مری آن نہ جانے پائے — لے کے خود میری طرف چکر سدرشن دوڑے

اپنے بھگتوں کے ہمیشہ سے خبردار ہیں آپ
دمِ آخر بھی مرے سامنے سرکار ہیں آپ

خوب لوٹے چمن دہر میں دل بھر کے مزے — بخشئے مجھ کو زیادہ میں کروں کیا جی کے
آپ کے سامنے ہی روح یہ تن سے نکلے — ہے یہی موکش کی پدوی یہی نروان مجھے

دیجئے اب لبِ خنداں سے اجازت مجھ کو
سامنے اپنے ہی کر دیجئے رخصت مجھ کو

لکھنؤ ۱۹۲۶ء

کسبِ کمال اور طولِ عمر

حاصل ہے میرے دل میں جگہ اس خیال کو
کچھ ضد ہے طولِ عمر سے کسبِ کمال کو

تعجیل سے جہاں میں ہے تکمیل رنگ و بو
ہے قطع درمیاں سے وہیں رشتۂ نمو

جلتے ہی جس چراغ کے شعلہ بھڑک اُٹھا
افسردگی سے جلد اُسے سامنا ہوا

قطرہ وہ جس میں شورشِ دریا کا ہے ظہور
ہوتا ہے جلد چشمِ جہاں سے نہاں ضرور

دعوائے عام گو مری تحریر میں نہیں
لیکن ہے واقعات سے یہ قابلِ یقیں

آگاہی کمالِ سکندر کسے نہیں
حیرت اثر مآلِ سکندر کسے نہیں

جلد اس کو باغِ دہر سے منھ موڑنا پڑا
رشتہ جو زندگی سے تھا وہ توڑنا پڑا

اَدْوَیت[1] وادیوں کا وہ سرتاج بے مثال
وحدت کے فلسفہ میں تھا حاصل جسے کمال

شنکر جو متصف تھا ہزاروں صفات سے
محروم قدرتاً تھا وہ طولِ حیات سے

عرفیؔ کہ بزمِ شعرِ عجم کا چراغ تھا
اس پھول سے بہار پہ ایراں کا باغ تھا

جس وقت نیند آئی اُسی وقت سو گیا
خاموش خاص عہدِ جوانی میں ہو گیا

---

[1] اَدْوَیت وادی یعنی موحد ۔ [2] سوامی شنکر اچاریہ جی مہاراج ۔

انگلینڈ کا سخنور مشہور جان کیٹس ‏ ‏ وہ بادشاہِ ملکِ سخن نوجوان کیٹس
عہدِ شباب ہی میں جہاں سے گذر گیا ‏ ‏ یہ باکمال وقت کے پہلے ہی مر گیا

وہ لکھنؤ کا شاعرِ معجز بیاں نسیم ‏ ‏ فخرِ زمان و نازشِ ہندوستاں نسیم
ہے مثنوی اک آئینہ جس کے کمال کا ‏ ‏ اس کو بھی جلد حکم ملا انتقال کا

درگا سہائے ساقیِ خمخانۂ سرورؔ ‏ ‏ کھاتے کچھ اور روز ہوائے جہاں ضرور
لیکن کمالِ فن کی بدولت نہ جی سکے ‏ ‏ جی بھر کے جامِ بادۂ ہستی نہ پی سکے

وہ روحِ پاک شمعِ شبستانِ معرفت ‏ ‏ وہ رام بادشاہ دُرِ کانِ معرفت
کس سن میں غرقِ بحرِ فنا! آہ ہو گئے ‏ ‏ دُنیا سے کتنی جلد جُدا! آہ ہو گئے

آخر کرے گا کوئی کہاں تک شمار اور ‏ ‏ ایسی ملیں گی ہم کو مثالیں ہزار اور
لیکن مجھے بھی دل سے یہی ہے پسند بات ‏ ‏ بیکار ہے طوالتِ افسانۂ حیات
جب مقصدِ حیات کی تکمیل ہو گئی ‏ ‏ منشائے کائنات کی تکمیل ہو گئی
پھر باغِ زندگی میں سکونت فضول ہے ‏ ‏ پھر قیدِ عنصری کی اذیت فضول ہے
ہوں کاش میں بھی شاد حصولِ کمال سے ‏ ‏ وابستہ ہی ہو مری حسنِ مآل سے
کچھ غم نہیں اگر میں زیادہ نہ جی سکوں ‏ ‏ لیکن مئے کمالِ سخن چھک کے پی سکوں
مجھ کو ذرا خیال نہیں سن و سال کا ‏ ‏ چھوڑوں گا کچھ تو نقش جہاں میں کمال کا

لیکن یہ اپنے بس کی منوّر نہیں ہے بات
ہیں سنگِ راہِ شوق ابھی تک مقدرات

دہلی ۱۹۳۲ء

کاسنی کا پھول

نظر فریب دل آویز کاسنی کا یہ پھول
ہے کس قدر طرب انگیز کاسنی کا یہ پھول

ہزار دل سے تصدق میں خوش ادائی پر
ہزار جان سے قرباں میں دلربائی پر

شرارتیں ہیں عیاں اس سے مہ جبینوں کی
کہاں سے طرز اُڑائی ہے نازنینوں کی

یہ گل ہے یا کوئی حُسن و جمال کا پیکر
کہ رنگ شوخ سے ہے وجہِ خیرگی نظر

اسی کو دیکھ کے ہر لب پہ مسکراہٹ ہے
اسی کے دم سے گلستاں میں جگمگاہٹ ہے

حسین شوخ دل افروز جانفزا ایسا
نہیں چمن میں کوئی پھول خوشنما ایسا

بہارِ باغ کا اک ترجمان پھول ہے یہ
لطافت اور نزاکت کی جان پھول ہے یہ

قیامتیں ہیں نہاں حُسن روح پرور میں
ہے اس کو دیکھ کے سورج مُکھی بھی چکر میں

ہے اس کے سامنے اس درجہ رنگ رُخ پھیکا
سر اُٹھ سکا نہ خجالت سے لاجونتی کا

گلاب میں نہیں جوہی میں کیتکی میں نہیں
جو اس کے رنگ میں شوخی ہے وہ کسی میں نہیں

نہیں یہ گُل ہے مئے نیلگوں کا ساغر ہے
سرور بخش نظر ہے حیات پرور ہے

گمان ہے کوئی حسینہ پئے ستمگاری
پہن کے آئی ہے گلشن میں نیلگوں ساری

بدل کے بھیس فلک بوستاں میں آیا ہے
سمٹ کے پھول کے قالب میں جلوہ پیرا ہے

کرے نہ ہم پہ عیاں نیلم اپنے جوہر کو
کہ پھول چھوڑ کے لیتا ہے کون پتھر کو

مقابلہ کی اگر تاب کاسنی سے کرے
قبول اس کی غلامی بڑی خوشی سے کرے

وجود اس کا فقط ہے چمن کی تزئیں کو
چھوئے جو اس کو تو رعشہ ہو دستِ گلچیں کو

یہی ہے روحِ چمن ہاں یہی ہے جانِ چمن
اسی کے حُسن دلاویز سے ہے شانِ چمن

جو اک نگاہ بھی رنگ اس کا دیکھ لیتا ہے کمال صانع قدرت کی داد دیتا ہے

ہے یوں تو معجزہ ہر ایک بے مثال اس کا
ہے ختم کاسنی کے پھول پر کمال اس کا

رُباعی

آؤں گا یہاں کبھی وہاں جاؤں گا لے جائے گا تو مجھ کو جہاں جاؤں گا
ہے کون جگہ جہاں نہیں تو موجود میں تجھ سے جُدا رہ کے کہاں جاؤں گا

رُباعی

سرمایہ عطا کیا ہے سب کچھ تو نے بخشا مجھے اے خدا ہے سب کچھ تو نے
پھیلاؤں میں ہاتھ کیا کسی کے آگے بے مانگے ہی جب دیا ہے سب کچھ تو نے

دیوالی کی شان

ہے خوب ہر ایک بات دیوالی میں
دن بن جاتی ہے رات دیوالی میں
ہو جاتی ہے نور سے منوّر دُنیا
جاگ اُٹھتی ہے کائنات دیوالی میں

میں کیا ہوں

وہ مومن ہوں جو مرتا ہے نگاہ کفر ساماں پر
وہ منکر ہوں جو عاشق ہے جمال روح قرآں پر

وہ عاشق ہوں غذائے روح جس کو غم سے ملتی ہے
وہ مجنوں ہوں بسر کرتا ہے جو ریگ بیاباں پر

وہ میکش ہوں مئے کوثر گری ہے جس کی نظروں سے
وہ زاہد ہوں نگہ رکھتا ہے جو صہبائے عرفاں پر

وہ ساغر ہوں جو اپنی گردشوں میں محو رہتا ہے
وہ صہبا ہوں برستی ہے جو پیہم بزم رنداں پر

وہ قاتل ہوں خود اپنے قتل کا الزام جس پر ہے
وہ بسمل ہوں تڑپ پیدا ہے جس میں خون ارماں پر

وہ کانٹا ہوں سبق دیتا ہے جو تکلیف صحرا کا
وہ غنچہ ہوں تبسم ریز ہے جو رنگ بستاں پر

وہ صحرا ہوں جسے گلہائے خنداں سے تعلق ہے
وہ گلشن ہوں جو تہمت بار ہے خار مغیلاں پر

وہ دریا ہوں روانی ہے ازل سے خاصہ جس کا
وہ ساحل ہوں جو چپ رہتا ہے اکثر شور طوفاں پر

وہ خرمن ہوں بڑھی ہے جس سے عظمت دانے دانے کی
وہ بجلی ہوں جو صیقل کر رہی ہے ابر باراں پر

وہ کنعاں ہوں چھپا کر جس نے رکھا حسن یوسف کو
وہ یوسف ہوں جسے ہے ناز قید چاہ کنعاں پر

وہ مسجد ہوں جو کفر و شرک کی عظمت کا نقشہ ہے
وہ مندر ہوں بنا قایم ہے جس کی دین و ایماں پر

وہ اخگر ہوں جسے انکار ہے آتش فروزی سے
وہ شعلہ ہوں تڑپتا ہے جو ذکر قلب سوزاں پر

وہ آنسو ہوں جو دامن سے گرا ہے ابر نیساں کے
وہ موتی ہوں کہ آب آئی ہے جس سے چشم گریاں پر

وہ رشتہ ہوں اہل جہاں ہیں منسلک جس میں
وہ سوزن ہوں جو مائل ہے رفوئے چاک داماں پر

وہ مجرم ہوں کہ جس کو پا بجولانی سے راحت ہے
وہ قیدی ہوں گماں ہے اپنے گھر کا جس کو زنداں پر

وہ گیسو ہوں جو ہے الجھا ہوا خود پیچ میں اپنے
وہ شانہ ہوں جو ڈورے ڈالتا ہے زلف جاناں پر

وہ عابد ہوں کلیسا جس کو ہر قلب مصفّا ہے ۔۔۔ وہ زائر ہوں چڑھاتا ہی جو نذریں کعبۂ جاں پر
وہ جادہ ہوں جو کر دیتا ہے ظاہر چور راہوں کو ۔۔۔ وہ پردہ ہوں جو پڑ جاتا ہی اکثر چشم درباں پر
وہ رہرو ہوں جسے گم گشتگی خود اپنی رہبر ہے ۔۔۔ وہ رستہ ہوں کہ جاتا ہی صراط بحر امکاں پر
وہ جوہر ہوں جو پنہاں ہو جگر میں سنگ یزداں کے ۔۔۔ وہ ہستی ہوں بنا جس کی ہو ذرات پریشاں پر

مُنوّریوں تو میں سب کچھ ہوں کہنے کے لئے ورنہ
وہ قصّہ ہوں جگہ جس کو ملے گی طاقِ نسیاں پر

رُباعی

پیدا کرتا ہے یا فنا کرتا ہے ۔۔۔ اچھا کرتا ہے یا بُرا کرتا ہے
کچھ دخل نہیں کسی کا اس میں غافل ۔۔۔ جو کچھ کرتا ہے سب خدا کرتا ہے

رُباعی

حیف اس پہ جو قائل تری قدرت کا نہیں ۔۔۔ حیف اس پہ جو شاغل تری اُلفت کا نہیں
قسمت ہی خراب ہے الٰہی اس کی ۔۔۔ طالب تجھ سے جو تیری رحمت کا نہیں

گلہری

(بچوں کے لئے)

بیدار نصیب ہے گلہری
ذی روح عجیب ہے گلہری

ہے چڑھ گئی یہ مری نظر میں
ہر وقت رواں دواں ہے گھر میں

کیا پیٹھ پر اس کی دھاریاں ہیں
قدرت کی یہ دستکاریاں ہیں

پھرتیلا بدن، سڈول، خوش گام
دن رات ہے دوڑ دھوپ سے کام

چلتی ہوئی ڈھیٹھ، چست، چالاک
دیکھو تو یہ کس قدر ہے بیباک

چنچل، چپلا، شریر، ہشیار
خوش رنگ حسین شوخ طرار

ہر گھر میں یہ بن بلائی مہمان
کھاتی ہے ملائی، دودھ، پکوان

کھانے کی جو چیز ہاتھ آئے
فوراً اسے لے کے بھاگ جائے

برفی پیڑے کی خاص مشتاق
پینے میں ہے دودھ کے یہ مشاق

چڑھ کر کبھی پیڑ سے اُتر کر
ہے پھینکتی پھل کتر کتر کر

پکڑو تو کبھی پکڑ نہ پاؤ
لڑنا چاہو تو لڑ نہ پاؤ

جاندار ہے اک یہ ریل گاڑی
میدان کی اپنے ہے کھلاڑی

شوخی میں ہے برق مات اس سے
چلتی نہیں کوئی گھات اس سے

صورت گر دہر کے کرم سے
نقاشی ہے اسی کے دم سے

بال اس کے ہیں زیب کلک ارژنگ
ہے یہ جاں بخش روغن و رنگ

لگتی ہے انہیں بہت یہ پیاری
بچوں سے ہے اس کی رشتہ داری
ہو لکھنؤ خواہ دلّی
بچے کہتے ہیں اس کو رگلّی
گوٹے پٹھے کا مخملی طوق
گردن میں پہناتے ہیں بصد شوق
ہے ان کے لبوں پہ اس کی تعریف
گیت اس کے لئے ہوئے ہیں تصنیف
مُنّی سی گلہری کھائے پیڑا
دمڑی کا منگا کے لائے پیڑا

دہلی - ۱۹۳۷ء

رُباعی

دانا کی جہاں میں یہی پہچان ہو ایک
ہے جس کو خبر۔ سب کا بس ایمان ہو ایک
ہے ویسے ہی ایک سب کا ایماں غافل
جس طرح کہ سب قالبوں میں جان ہو ایک

رُباعی

تجھ سے گر دُور خود پسندی ہو جائے
شیوہ تیرا جو ہوشمندی ہو جائے
میں دعوے کے ساتھ تجھ سے کہہ سکتا ہوں
حاصل تری روح کو بلندی ہو جائے

بے بسی

آہ شرمندہ معنی نہیں تدبیرِ وطن
جاگتی ہی کسی عنواں نہیں تقدیرِ وطن

اور بھی آج ہے بگڑی ہوئی تقدیرِ وطن
شل نہیں نام کو بھی دستِ گلوگیرِ وطن

کھائے جاتا ہے غمِ کوششِ برباد ہمیں
وقت دیتا ہی نہیں رخصتِ فریاد ہمیں

خدا کا ہاتھ

(ایک ابتدائی نظم)

ضو بار ماہتاب جو سارے جہاں پہ ہے ہر نجم محوِ خندہ زنی آسماں پہ ہے
کیفیّت بہار ہر اک گلستاں پہ ہے نغمہ یہ عندلیب چمن کی زباں پہ ہے

جس ہاتھ نے بنایا مجھے وہ خدا کا ہے

اعجاز دیکھئے کششِ ماہتاب کا بدلا ہوا ہے طرز روانی آب کا
عالم ہر ایک موج پہ ہے پیچ و تاب کا افسانہ سُن رہے ہیں یہ ساحل حباب کا

جس ہاتھ نے بنایا مجھے وہ خدا کا ہے

رنگ اپنا ہر طرف ہے چمن میں جمائے شوق شام و سحر نسیم ہے جوشش فزائے شوق
گُل بلبلوں کے سُنتے ہیں افسانہ ہائے شوق قمری کا قہقہہ ہے کہ ہے یہ صدائے شوق

جس ہاتھ نے بنایا مجھے وہ خدا کا ہے

قرباں ہیں باغِ دہر میں رنگ بہار کے نظارے دلفریب ہیں کیا لالہ زار کے
ہر نونہال مست ہے سینہ اُبھار کے یوں کہہ رہا ہے جوشِ نمو میں پکار کے

جس ہاتھ نے بنایا مجھے وہ خدا کا ہے

یہ عالمِ خلا یہ زمیں اور یہ آسماں آخر نگاہ اپنی میں ڈالوں کہاں کہاں
ہر چیز سے ہے جلوۂ حُسن نہاں عیاں مسطور ہے یہ صفحۂ ہستی پہ داستاں

جس ہاتھ نے بنایا مجھے وہ خدا کا ہے

خالق کا ذرّہ ذرہ میں جلوہ ہے آشکارا ہیں مہر و ماہ پرتو انوار کردگار
ہیں ایک اور قدرتیں اس کی ہیں بے شمار آتا ہے میرے لب پہ یہی ذکر بار بار

جس ہاتھ نے بنایا مجھے وہ خدا کا ہے

ضمیر کی آواز

اگرچہ کان دیئے ہیں خدا نے انساں کو
اگرچہ روح میں داخل کیا ہے ایماں کو

ضمیر کی نہیں سنتا کبھی مگر یہ صدا
چھپی ہی ساز میں رہتی ہے بیشتر یہ صدا

ملیں گے تم کو "منور" زیادہ ایسے بشر
جنہیں ضمیر کی ہستی کی بھی نہیں ہے خبر

بہت کم اس کی حقیقت سے بہرہ ور ہوں گے
بہت کم اس کی لطافت سے باخبر ہوں گے

ہے گو بشر پہ عیاں ہر بلندی و پستی
مگر لطیف بہت ہے ضمیر کی ہستی

ہے خیر خواہ دوامی ضمیر انساں کا
جو ہے تو اک ہے یہی دستگیر انساں کا

یہ تیرگی سے ہمیں روشنی میں لاتا ہے
رہِ حیات کے خطرات سے بچاتا ہے

ضیائے حق کا خزانہ اسی میں پنہاں ہے
تجلّیٔ مہ و خورشید اس پہ قرباں ہے

صدا ضمیر کی رکھتی ہے شانِ حکمِ خدا
ضرر کبھی کوئی اس سے پہنچ نہیں سکتا

برا اگر کوئی مانے تو شوق سے مانے
بلا سے کوئی اگر تم سے دشمنی ٹھانے

وہ باپ ہو کہ ہو بھائی کسی سے ڈرنا کیا
ہو بادشاہ کہ حاکم کسی کی پروا کیا

بزرگ دوست عزیز آشنا غلام آقا
سنو ضمیر کے آگے نہ تم کسی کی صدا

ہو خواہ کلفتِ آزار پابجولانی
تمام عمر رہو خواہ بن کے زندانی

بلا سے آئے مٹانے تمہیں بلا کوئی
ہلاکِ تیغ کرے کاٹ لے گلا کوئی

پہاڑ ٹوٹ پڑیں خواہ آندھیاں آئیں
فلک سے خواہ مہ و مہر آگ برسائیں

سمندروں سے بپا خواہ شورِ طوفاں ہو
فنائے زیست کا پیدا کوئی بھی ساماں ہو

جگر میں تیر ہو پیوست سر پہ خنجر ہو
غضب سے برق جہندہ بھی شعلہ گستر ہو
اگرے حقیر کوئی خواہ خود پرستی سے
اُڑا دے جسم کے ٹکڑے بھی چیرہ دستی سے
مگر نہ حرفِ شکایت زبان پر لانا
جو کچھ ضمیر بتائے وہی کیے جانا
جہاں ضمیر پرستی میں آزما لے گا
خدائے پاک تمہیں آ کے خود بچا لے گا
چڑھو گے اِس کی بدولت نگاہ میں اُس کی
ملے گی امن کی دولت پناہ میں اُس کی

رُباعی

ظالم کے ظُلم سے جو ڈر جاتا ہے
موت آنے سے پہلے ہی وہ مر جاتا ہے
کشتی مُراد اس کی ہو جاتی ہے پار
تلوار کے گھاٹ جو اُتر جاتا ہے

رُباعی

اس کارا ہم کو کارِ طفلاں نہ سمجھ
یعنی اک شغل گوئے و چوگاں نہ سمجھ
لوہے لگ جاتے ہیں مُنوّر اس میں
ذاتی اصلاح کو کچھ آساں نہ سمجھ

ناکام حیات

"ذیل کی نظم اُس زمانے کے جذبات کا مظہر ہے جب برادر معظم ووالد مکرم کی یکے بعد دیگرے وفات حسرت آیات کے صدموں سے مصنّف کو دوچار ہونا پڑا تھا۔

(۱)

جب سے ہوئی اسیری زندانِ روزگار | زنجیر بستہ نفس شعلہ بار ہوں
سیماب وار ہے دل مایوس بیقرار | میں وقفِ آتشِ غمِ لیل و نہار ہوں

(۲)

جکڑا ہوا سلاسلِ لیل و نہار میں | پابند رشتہ مندی احباب دستدار
اُلجھا ہوا کشاکش اغیار و یار میں | ہوں ایک سحر گشتۂ نیرنگ روزگار

(۳)

اک مبتلائے کشمکشِ زیست و مرگ ہوں | رہتا ہوں چشم بر رُخِ فکرِ مآل کار
سیدھا نہیں ہی مجھ سے مرا بخت واژگوں | اُف اُف یہ ہیں شدائدِ آلامِ روزگار

(۴)

شور فغاں یہ شورِ سلاسل سے کم نہیں | وحشت زدہ میں صورتِ صید رمیدہ ہوں
میدانِ کارزار میں جمتا قدم نہیں | ناکامیٔ اُمید پہ میں آب دیدہ ہوں

(۵)

دل میں مرے تموّج وحشت فروز ہے | لیکن ہر ایک موج ہی مجھ سے کھنچی ہوئی
اس بحر میں تلاطم اندوہ و سوز ہے | گرداب میں ہے کشتی پھنسی ہوئی

(۶)

رہتی ہے آہ مجھ سے نسیم چمن پھری
قمقری کے قہقہوں کا نشانہ بنا ہوں میں
لیتی ہیں چٹکیاں کبھی کلیاں گلاب کی
سنبل کی طرح فکر میں اُلجھا ہوا ہوں میں

(۷)

مارا صبا نے ایک طمانچہ عذار پر
لی بوستاں میں خار نے جھنجھلا کے نوک کی
سنبل یہ کہہ رہی تھی چڑھا دوں گی دار پر
وحشت زدہ بتاتی تھی مجھ کو کلی کلی

(۸)

بادل گرج گرج کے گراتا ہے بجلیاں
آنسو مگر نہ ایک گرایا زمین پر
گھیرے ہوئے ہے آہ شرر بار کا دھواں
لیکن ہوا کے زور سے وہ بھی ہے منتشر

(۹)

سایہ نے ساتھ چھوڑ کے حیران کر دیا
تنہا میں رہ گیا پئے بیدادِ روزگار
چکّر دیئے وہ مجھ کو پریشان کر دیا
رہ رہ کے بیکسی میں اُلجھتی ہے جان زار

(۱۰)

جل جل کے دیکھتی ہے مجھے شمع بزمِ ناز
پروانہ اس سے کہتے ہیں جا جا کے میرا حال
مطرب نے میرے حال پہ چھیڑا نہ کوئی ساز
محفل میں بھی مجھے نہ ہوئی کوئی نیک فال

(۱۱)

سوزاں ہوں غم سے مجمرِ آتش فروز ہوں
شعلے نکل رہے ہیں مرے جسم زار سے
صرفِ الم ہوں پیکرِ اندوہ و سوز ہوں
باہر ہے میری آہ مرے اختیار سے

(۱۲)

محبوسِ تنگنائے حیات و ممات ہوں
اس کشمکش سے میرا نکلنا محال ہے

بڑھتا نہیں مرا قدم آگے ہیں کیا کروں　　اس رہگزر میں اب مرا چلنا محال ہے

(۱۴۲)

مجبور ہو کے بیٹھ رہوں گا مآل کار　　ارماں ہیں دل میں لاکھ مگر میں خموش ہوں
رخت سفر میں ہیں غم و آلام روزگار　　دنیا میں اک مسافر خانہ بدوش ہوں

لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء

رُباعی

ہر شخص کو طلب منفعت کا ارماں　　ہر فرد ہے اپنی برتری کا خواہاں
جس کو دیکھا غرض کا بندہ پایا　　غافل یہ نجات کے ہیں ساماں کہاں

رُباعی

سمجھا اب تک جو رنگ بازار نہیں　　ہم سا کوئی بے عقل خریدار نہیں
کس طرح سے مال ہاتھ آئے آخر　　قیمت دینے کو آپ تیار نہیں

شکوۂ ابر

" اس نظم کی تصنیف کے کئی سال بعد یعنی ۱۹۳۲ء میں معلوم ہوا کہ اسی بحر اور اسی قافیہ اور ردیف میں ایک نظم رسالہ "ادیب" مرحوم کے اوراق کی زینت ہو چکی تھی اور یہ محترم قبلہ جناب محمد ہادی عزیز مبرور کی تصنیف تھی۔ افسوس کہ مولنا بھی احباب رفتگاں کی صف میں شامل ہو گئے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ جس زمین میں مولانائے مرحوم نے گلکاریاں فرمائی ہیں اسی میں مجھے بھی اظہار جذبات کا شرف حاصل ہوا ہے "

ترے کرم کی ہے دنیا اُمیدوار برس
برس خدا کے لئے ابرِ نوبہار برس

دکھا نہ ہم کو زیادہ اب انتظار برس
نہ بے رُخی کا طریقہ کر اختیار برس

جو اتنی دھوم سے آیا ہے گھر کے گردوں پہ
ہے تجھ کو کس کے اشارہ کا انتظار برس

زمیں کا خشک جگر ہے تپش سے گرما کی
تمام خلق اُمس سے ہے بیقرار برس

دکھا تو ہم کو کہ پانی ہے کس قدر تجھ میں
بٹھا دے ظرف کا تو اپنے اعتبار برس

پھپھولے پھوڑ خوشی سے کہ دل کو تسکیں ہو
نکال دل میں بھرا ہوا جو کچھ بخار برس

نہ تشنہ کاموں کو مایوس کر دعائیں لے
فغاں بلب ہے ہر اک قریۂ دیار برس

جُھلس کے راکھ ہوا کاروبار صحرا کا
شجر شجر ہے طپاں صورتِ چنار برس

یہ ہیں پہاڑ کہ جلتے ہوئے پجاوے ہیں
ہیں پانی مانگ رہے تجھ سے آبشار برس

جلا مئی کا نظّارہ دکھا دے میداں میں
بڑھا دے رونق ہر دشت و کوہسار برس

غبار و گرد سے گردوں کا صاف مطلع ہو
دماغِ ارض کا ہو دور انتشار برس

یہ تیری خشک مزاجی یہ ماہ ساون کا!
ذرا تو خجل پہ اپنے ہو شرمسار برس

ترے کرم سے ہو سر سبز وادیِ غربت — کہ راہ میں نہیں اک نخل سایہ دار برس

کرم صفت ہی تری ہاں کرم نمایاں کر — بنا ہے کس لئے اب کے ستم شعار برس

لگے گی آہ تجھے بے گنہ پرندے کی — نہ کر پپیہے کا ظالم جگر فگار برس

ہے منحصر تری بخشش پہ آس دہقاں کی — کسی غریب کو یوں رکھ نہ سوگوار برس

گلوں کے حلق میں کانٹے پڑے ہیں بستاں میں — ہے خشک شاخ شجر پر زبان خار برس

ہمارے واسطے کھل جائے تیرا گنجینہ — ملیں ہیں بھی ترے دُرِ شاہوار برس

فسردگی کا مٹے دور تازگی آئے — کہ نخل نخل ہے محتاج برگ و بار برس

ترس رہی ہی یہ اب بوند بوند پانی کو — خدا کے واسطے سن خلق کی پکار برس

یہ وقت چھیڑ کا دوشیزہ چمن سے ہے — شباب کا ہے دکھانے کو پھر اُبھار برس

کرا دے سیر حسینوں کی رنگ رلیوں کی — دکھا دے جھولوں کا نظارہ خوشگوار برس

لگائے تان کوئی دلفریب کجری کی — اُڑائے ہوش کوئی گا کے پھر ملار برس

پڑے پھوہار جمے راگ رنگ کی محفل — کہ محوِ شغل ہوں رندان بادہ خوار برس

ہزار بار جو برسا ہے اپنی موج سے تو — ہمارے کہنے سے بھی دوست ایک بار برس

یہ کیا کہیں تو ستم ڈھا دیا ہی طوفاں سے
زمیں کہیں کی ہے محرومِ فیض باراں سے

لاہور ۱۹۲۷ء

کوئل

چٹکیاں لیتا تھا دل میں روز ارمانِ بہار
رونما دشت و چمن میں ہوگئی جانِ بہار
جلوہ گر پھر میری محفل میں ہے مہمانِ بہار
اس کی آمد سے دوبالا ہوگئی شانِ بہار

اس کی خاطر کیا کروں اس کی تواضع کیا کروں
اس کے نغموں کی بیاں شانِ ترفع کیا کروں

آبِ حیواں ہیں اثر میں نغمہ ہائے خوشگوار
صرف اس سے ایک گھونٹ امرت کا ہوا امیدوار
اس ترنم پر تصدق ان ترانوں پر نثار
میں انہیں نغموں کو سننے کے لئے تھا بیقرار

کس قدر مانوس ہوں اس کی صدائے ناز سے
ہوگیا ہے سحر سا اک دل پر اس آواز سے

صبح دم پہلے ہی آ کر جگاتی ہے مجھے
یادِ ایامِ مسرت ؕ دلاتی ہے مجھے
کس قدر جادو بھرے نغمے سناتی ہے مجھے
بانسری والے کی گویا یاد آتی ہے مجھے

یہ نہ جب ہو ہند میں پھر نغمۂ دلجو کہاں
یہ کُواُو کُواُو کُواُو کُواُو کُواُو کُواُو کہاں

وہ جو میں نے عہدِ طفلی میں لگایا تھا انار
اب دکھاتا ہے مجھے کھل کھل کے پھولوں کی بہار
اگّہ ہائے ابرِ مشرق سے چلے متانہ وار
دھوپ کا جلوہ ہے اس موسم میں کیا خوشگوار

ہے مسلّط آسماں پر کیا فضائے دلفریب
جھل رہی ہے ہر طرف پنکھا ہوائے دلفریب

اے منوّر ہے گوارا یہ اُمس برسات میں
ہے زیادہ شہر سے دلکش سماں دیہات میں
دیکھتا ہوں جلوۂ قدرت عیاں ہر بات میں
ایک ہنگامہ سا پیدا ہے مرے جذبات میں
شوق سے اس کے ترانے صبحدم سنتا ہوں میں
مجھ پہ طاری وجد ہو جاتا ہے سر دھنتا ہوں میں

لکھنؤ۔ ۱۹۱۸ء

رُباعی

یکساں ہر اک کی چال کیسے ہو جائے
تیرا جو ہے سب کا حال کیسے ہو جائے
ہے تیری پسند کچھ تو اس کی کچھ اور
دنیا تری ہم خیال کیسے ہو جائے

رُباعی

جوہر یا زندگی کے پیدا کرے
یا جانبِ مرگ تو رُخ اپنا کرے
کیوں بیچ میں دونوں کے پڑا ہے آخر
ایسی حالت سے کاش توبا کرے

نغمۂ زندگی

ہم نے مانا کسی شاعر کی یہ تخییل بھی ہے
نظم کا اس میں ہو اسلوب یہ تمثیل بھی ہے

یہ بھی تسلیم کہ اک نثر کا دفتر ہے یہ
منتشر جس میں ہیں جذبات وہ منظر ہے یہ

یہ بھی ممکن ہے کہ اک پیکرِ تصویر ہو یہ
کسی مانی قلم کار کی تحریر ہو یہ

روغن و رنگ کی ہو شعبدہ بازی اس میں
کلکِ ارژنگ کی ہو نقش طرازی اس میں

یا ہو کوئی چمن آرا چمن آرا اس میں
اُس کی ایک ایک روش کا ہو نظارا اس میں

زُلف کھولے ہوئے ہو سلسلہ جنباں کوئی
بے پر و بال ہو یا مُرغ یہ پرّاں کوئی

یا اک آئینۂ ویرانیٔ صحرا ہو یہ
یا کسی جھیل سے نکلا ہوا دریا ہو یہ

دستِ آذر کی نمایاں ہو صفائی اس میں
بُت تراشی کی ہو اعجاز نمائی اس میں

یا ہو یہ جنبشِ اعضا کسی رقاصہ کی
اس میں ہو ضربِ کفِ پا کسی رقاصہ کی

زندگی ایک کرامات ہے موسیقی کی
میری نظروں میں بڑی بات ہے موسیقی کی

کسی مطرب کا ہے اندازِ ترنّم اس میں
جنّتِ گوش ہے آوازِ ترنّم اس میں

یہ وہ نغمہ ہے جو فانی بھی ہے باقی بھی ہے
اس میں آہنگ حجازی بھی عراقی بھی ہے

زیر و بم اس میں کسی سازِ خوش آواز کا ہے
زمزمہ اس میں لبِ زمزمہ پرواز کا ہے

باربد اس میں کوئی نغمہ سرا رہتا ہے
ساز یہ سوزِ ترنّم سے بھرا رہتا ہے

اس کے پردہ میں خوش الحاں کوئی داؤد بھی ہے
اس کی تاثیر سے گلِ آتشِ نمرود بھی ہے

عشق کی آتش خاموش ہے گویا اس میں
حُسن کا دامن گل پوش ہے پردا اس میں

کیفیت بزم کے ساماں میں ہے موسیقی کی
گھن گرج رزم کے میداں میں ہے موسیقی کی

لب سے خندہ ہو نمایاں کہ تبسم پیدا
اس میں ہر ڈھنگ سے ہے رنگ ترنّم پیدا

رُخِ بشّاش میں تصویرِ غِنا ملتی ہے
راگ کی جنبشِ مژگاں سے ہوا ملتی ہے

دلِ بسمل کا بھی ہے شور ہویدا اس میں
تیغِ قاتل کی بھی جھنکار ہے پیدا اس میں

نالۂ درد اک آہنگ ہے موسیقی کا
چہرۂ زرد میں بھی رنگ ہے موسیقی کا

پردۂ ساز ہر اک سازِ نفس اس میں ہے
لوچ ہر طرح کا ہر قسم کا رس اس میں ہے

زمزمے روح میں یہ چنگ کے سارنگ کے ہیں
دھڑکنیں دل کی نہیں بول یہ مردنگ کے ہیں

دلربائی کا نہیں سازِ رباب اس کا ہے
نگہِ ناز کی شوخی میں حجاب اس کا ہے

سوز اس میں ہے محبّت کا گداز اس میں ہے
اثر اندازیِ فریادِ نیاز اس میں ہے

شورِ طوفانِ حوادث ہے نتیجہ اس کا
آتشِ قہرِ جہاں سوز ہے شعلہ اس کا

سازگاریٔ مقدّر کا ترانہ ہے یہ
جو ہے محتاجِ ترنّم وہ فسانہ ہے یہ

ہے بم و زیر عیاں لمحہ بہ لمحہ اس میں
گٹکری کا ہے سماں لحظہ بہ لحظہ اس میں

سُن کے دھن اس کی میں سرمست ہوا جاتا ہوں
ہر رگ و پے میں کسی لے کو بندھا پاتا ہوں

نقشِ تسخیر یہ اک نطق کے جادو سے ہے
تان کھینچی یہ کسی بانسری والے نے ہے

گونجتی اس میں صدا بھیروی ترشول کی ہے
اپنے معیار کی رفعت میں یہ دھرپد بھی ہے

آب و آتش کی صفتِ اس میں بہم ملتی ہے
راگ تاثیر میں یہ میگھ بھی دیپک بھی ہے

رشکِ گہوارۂ جنباں کبھی ہنڈول سے ہے
اپنی عظمت میں سری راگ یہ ہر بول سے ہے

مالکوسی یہ کوئی نالۂ شبگیر بھی ہے
اس میں فریاد ہے فریاد کی تاثیر بھی ہے

صبح کی بھیروی دیوی کا جلال اس میں ہے
شام کلیان کی پھیلائے جمال اس میں ہے

کیف کافی کا ہے پیلو کا بھی حال اس میں ہر ‏ ‏ رونما لطف باندازِ خیال اس میں ہے
ندیاں جیسے سرِ بحر رواں ملتی ہیں ‏ ‏ اس ترانہ میں بہم راگنیاں ملتی ہیں

گرمیٔ شوق میں پابند صدا ہوتا ہے
یہ وہ مطلب ہے جو نغمہ سے ادا ہوتا ہے

دہلی ۱۹۳۶ء

رُباعی

خود تجھ کو ہے وصف تیرا ستر مکتوم ‏ ‏ ورنہ کسی خوبی سے نہیں تو محروم
ہے کتنی بڑھی ہوئی جہالت تیری ‏ ‏ اپنے جوہر نہیں تجھے خود معلوم

رُباعی

ہر سمت مچا رہا عبث شور ہے تو ‏ ‏ پامال جو ہر دم صفت مور ہے تو
ہے تیری سزا یہ اس خطا پر غافل ‏ ‏ معذور ہے محتاج ہے کمزور ہے تو

برسات کی آمد

ملتا ہے پتہ یہ آسماں سے — گرمی کا عمل اُٹھا جہاں سے
برسات کی فصل آ رہی ہے — پیغامِ حیات لا رہی ہے
کانٹا سا پڑا جو حلق میں تھا — شورِ فریاد خلق میں تھا
افسردہ تھا ہر کسان کا سا دل — بوڑھے کا سا تھا جوان کا دل
لُوں کی شدّت سے فق تھے چہرے — گرمی سے عرق عرق تھے چہرے
ہر ایک پہ چھائی مُردنی تھی — نخلستاں سی زمیں بنی تھی
نارِ دوزخ برس رہی تھی — پانی کو زمیں ترس رہی تھی
پھولوں میں تھا التہاب پیدا — کانٹوں میں تھا اضطراب پیدا
بھولے تھے پرند نغمہ خوانی — افسانہ تھا ذکرِ شادمانی
ہرنوں کو نہ چوکڑی کا تھا ہوش — صحرا میں پڑے ہوئے تھے خاموش
اب کاوشِ گرد باد ہے گرد — دم بادِ سموم نے بھرا سرد
صرصر کی شرارتیں ہیں بیکار — گرمی کی حرارتیں ہیں بیکار
بدلی جو ہواؤں کی روانی — مہرِ گردوں ہے پانی پانی
برسات کو پھر خدا نے بھیجا — تر گاوِ زمیں کا ہے کلیجا
اڑتی نہیں نام کو بھی اب خاک — حدّت نہ ہے دھوپ کی غضبناک
کھیتوں میں ہے کتنی کثرتِ آب — پانی سے بھرے ہوئے ہیں تالاب

صحرا مثلِ چمن بنے ہیں — گلشن رشکِ عدن بنے ہیں
ساحل کے لبوں پہ ہے تبسّم — پیدا دریا میں ہے تلاطم
ہے فصلِ نشاط عالم آرا — ہے رنگِ بہار آشکارا
طاؤس کا رقص دلرُبا ہے — پُر لطف پپیہے کی صدا ہے
بادل کی گرج جنوں فزا ہے — بجلی کی کڑک میں اک ادا ہے
جب ابر سے چھاگیا اندھیرا — دل چھین کے لے گئی یہ بیرا
اُمڈے مثلِ سحاب جذبات — پیغامِ حیات لائی برسات
اس طرح سماگئی نظر میں — تسکیں نے کیا ہے گھر جگر میں

دیکھا رُوئے نگارِ قدرت
ہوتا ہوں میں ہمکنارِ قدرت

رُباعی

یا تیغ ترے جور و جفا کی کر جائے — یا قلب ترا ظُلم سے ظالم پھر جائے
یا دستِ خدا تجھے جھٹک دے ایسا — قبضہ ترے ہاتھوں میں رہے پھل گر جائے

بسنت کا تصوّر

کسی کو بستر گل پر جو آئی انگڑائی — بکھر گیا جو کسی کا جمالِ رعنائی
ہنسی کے ساتھ کسی کی جو آنکھ شرمائی — ہوا کسی کو جو پیدا اسیرِ خود آرائی
میں سادگی سے یہ سمجھا بسنت رُت آئی

کسی کے بال جو بکھرے ہوئے نظر آئے — کسی کو شوق سے دیکھا جو ہاتھ پھیلائے
جو محوِ حُسن ہوا کوئی آنکھ جھپکائے — کسی نے حُسن پرستوں کے دل جو ٹھکرائے
میں سادگی سے یہ سمجھا بسنت رُت آئی

کسی کے سر سے جو سرکی ہوئی ملی سلری — کہیں جو مانگ میں سیندور کی جھلک دیکھی
کسی کے ماتھے پہ چمکی جو خوشنما بیندی — کسی کے لب پہ نظر آئی جب مسی کی دھڑی
میں سادگی سے یہ سمجھا بسنت رُت آئی

کسی کے کان میں کنڈل کی جب جھلک دیکھی — کسی کی آنکھ میں رقصاں جو مردمک دیکھی
جہاں کسی کی جھپکتی ہوئی پلک دیکھی — کسی کے عارضِ گلگوں کی جب چمک دیکھی
میں سادگی سے یہ سمجھا بسنت رُت آئی

کسی کے نخلِ جوانی کا جب ثمر دیکھا — کسی کا حُسنِ دروں جب اُبھار پر دیکھا
شباب جب کسی محرم کا پردہ در دیکھا — جو ہار کمر کی سینے پہ جلوہ گر دیکھا
میں سادگی سے یہ سمجھا بسنت رُت آئی

کسی کے لب پہ جو دیکھی دو پان کی سُرخی — چمک سے جس کی گری دل پہ ایک بجلی سی

کھلی ہوئی جو کسی کی ہلی وہ بتیسی ہوئی زبان کسی کی جو محو گلریزی
میں سادگی سے یہ سمجھا بسنت رُت آئی

نظر فروز ہوا جب وہ قالب سیمیں وہ سحر خیز ادائیں وہ پوشش رنگیں
ہوا جو پردے سے باہر وہ حُسن پردہ نشیں کسی کے ہاتھ کی وہ چوڑیاں جہاں کھنکیں
میں سادگی سے یہ سمجھا بسنت رُت آئی

ہوا جو کوئی کہیں مائل خرامِ ناز کسی کے پاؤں کی چھاگل کی جب سُنی آواز
کسی نے کھول دیئے خود جب اپنے حُسن کے راز جو سُرخ سُرخ مہا در دکھا گئی اعجاز
میں سادگی سے یہ سمجھا بسنت رُت آئی

لکھنؤ۔مطبوعہ آزاد کانپور

رُباعی

ماضی میں بھی دُنیا کا کہیں تھا نہ وجود ہستی ہر حال میں بھی اس کی نابُود
یہ راز بھی ہوگیا مُنوّر اب صاف آیندہ بھی نقش اس کا ہوگا مفقود

پپیہے پر عتاب

(ایک ہندی گیت کا تخیل)

روز و شب محبوب کی فرقت میں ہوں بیتاب میں — قلزم اُلفت میں آ پہونچی سر گرداب میں
آج کی شب پھر رہی محروم لطفِ خواب میں — اُف تڑپتی ہوں برنگ ماہی بے آب میں

میرے دل کی بڑھ رہی ہیں دمبدم بیتابیاں
او پپیہے رٹ رہا ہے کس لئے تو پی کہاں

اور ہوتا کوئی بیتابِ غمِ اُلفت اگر — وہ دکھا دیتا تجھے اس شور و شیون کا اثر
مُضطرب رکھا ہے تونے فرطِ غم سے رات بھر — نوچ ڈالوں گی ابھی آکر میں تیرے بال و پر

اب سُنوں ہرگز نہ تری جاں گسل آواز میں
چھین لوں گی تجھ سے ورنہ قوتِ پرواز میں

رات بھر گائی ہے فرقت کی غم افزا داستاں — آگ سی ہر سو لگا دی صورتِ برق طپاں
کیوں خدایا جل نہیں جاتی پپیہے کی زباں — پھونک دے اے آہ سوزاں تو ہی اس کا آشیاں

کیوں برس پڑتی نہیں اس پر فلک سے بجلیاں
سُن نہیں سکتی میں فرقت میں صدائے پی کہاں

ابر نیلی فام لایا ہے پیا کا کچھ پیام — اک نرالی شان سے گردوں پہ ہے مستِ خرام
اب خدا کے واسطے مجھ سے نہ ہو محوِ کلام — مجھ کو سونے دے نہ ظالم نیند ہو میری حرام

دیکھ سوئے آسماں کیسا ہے یہ دلکش سماں
او پپیہے رٹ رہا ہے کس لئے تو پی کہاں

دل مرا کوئل کے نغموں سے بہت مانوس ہے　　تیرے نالوں کی صدا میرے لئے منحوس ہے
کیا خبر تجھ کو نہیں کیا رنج کیا افسوس ہے　　میرے دل پر کیا گذرتی ہو یہ کیوں مایوس ہے
اُف ہیں داغِ دل فروزاں اور ہیں آتش بجاں
اے پپیہے اپنے لب پر اب نہ لانا پی کہاں

لکھنؤ

رُباعی

رندی کیا شئے ہے مے پرستی کیا ہے　　جو عارضی ہو وہ لطفِ ہستی کیا ہے
ہم رہتے ہیں بے پیئے منوّر مخمور　　جو ہو محتاجِ مے وہ مستی کیا ہے

رُباعی

ٹھوکر کیسی یہ نفس کی کھا کے گرا　　قعرِ تاریک میں جو دُنیا کے گرا
جُز رحمتِ حق اُسے اُٹھائیگا کون　　دیکھو تو منوّر کو کہاں جا کے گرا

رادھا

جو ہو حکمرانِ دیارِ مُحبّت ہو سب کچھ جسے اختیارِ محبّت
نظر کے گلستاں ہیں دل کے چمن میں جسے ڈھونڈھتی ہو بہارِ محبّت
بسر جس کی ہوتی ہو دیوانگی میں اگر ہو تو ہو ہوشیارِ محبّت
رہے سامنے روئے محبوب، جس کے ہو دل جس کا آئینہ دارِ محبّت
چھپائے جو خود کو حجابوں میں اس کے نظر جس کی ہو شرمسارِ محبّت
جسے دام و دانہ کی حاجت نہ ہو کچھ بنے خود بخود جو شکارِ محبّت
جبیں سے جو شرمائے آتشکدوں کو تڑپتے ہوں جس میں شرارِ محبّت
جھکائے سر اپنا اسی بتکدے میں رہے جو عبادت گذارِ محبّت
جو سینے کے داغوں کو روشن بنا کر کھلایا کرے لالہ زارِ محبّت
کبھی جس کو فرصت نہ اس شغل سے ہو رہے منہمکِ دل بکارِ محبّت
ہر اک قید و بندش سے آزاد ہو کر ہو پابندِ قول و قرارِ محبّت
سبکدوش بارِ دو عالم سے ہو کر اُٹھائے ہوئے ہو جو بارِ محبّت
لب و لے بہم متصل جب کبھی ہوں بنے نغمۂ خوشگوارِ محبّت
فرشتے بھی جس کے لئے مر رہے ہوں ہو فردوس جس کا کنارِ محبّت
چہکتا رہے مست اپنی ہی دھن میں جو ہو بلبلِ شاخسارِ محبّت
نہ اندیشۂ رہزن ہو جس کے سفر میں کھلی جس پہ ہو رہگذارِ محبّت

غمِ دہر جس کو کوئی نہ کوئی ستائے | اگر ہو تو ہو سوگوارِ محبّت
لہو بن کے دل جس کی آنکھوں سے ٹپکے | بنے سرخیِ نوکِ خارِ محبّت
سمیٹے ہوئے ہو جو دفتر کے دفتر | سکوں ہو جسے انتشارِ محبّت
رہِ شوق منزل میں پامال ہو کر | جو ہو سر بسر کامگارِ محبّت
جو ساقی صفت ہو اُن آنکھوں کا مالک | ٹپکتا ہو جن سے خمارِ محبت

رہے ایک کا جزو جوبن کے رادھا
منوّر اسی کو میں کہتا ہوں رادھا

رُباعی

بیچھا چھوڑو اب اس کا شاکی ہے نیند | تم پر غالب کس انتہا کی ہے نیند
آنکھیں کھولو ذرا منوّر جاگو | کتنا سوتے ہو تم بلا کی ہے نیند

رُباعی

ہستیِ دنیا کی اک ہے امرِ باطل | باطل کو بھلا فروغ کب ہے حاصل
دھوکا کھائے گا جو پھنسے گا اسمیں | بچتا ہے جو اس سے ہے وہ مردِ عاقل

ابر میں جلوۂ ماہ

ابرِ باراں میں ہے نور افشاں فلک پر ماہتاب

پرتوِ حُسنِ ازل ہے زیرِ دامانِ سحاب

مہ جبیں کوئی یہ اپنے رُخ پہ ڈالے ہے نقاب

یا ہے دل بادل میں بیٹھا اک شہ گردوں کاب

ہالۂ رنگیں کو اس کے چترِ نورانی کہوں

چترِ نُورانی کہوں یا اک مہِ ثانی کہوں

پھولوں کی بہار

ہے دلکشی پہ فدا اک جہان پھولوں کی
نظر فریب ہے کیا آن بان پھولوں کی

نمودِ حسن کی رفتار دیکھیے تو سہی
ہے مثلِ بخت طبیعت جوان پھولوں کی

صدائے دلکش و شیریں ہے عندلیب کی روح
ادائے خندہ رنگیں ہے جان پھولوں کی

دلوں کو صید بناتا ہے کام دیو اپنا
بنا کے موسمِ گل میں کمان پھولوں کی

وہ رعب حسن ہے ان کا کہ دم بخود ہو کر
ہے شکل دیکھ رہا آسمان پھولوں کی

نہ کیوں ہو شوقِ مدارات حسنِ دلکش کو
ہے عندلیبِ چمن میہمان پھولوں کی

شرف نصیب ہوا کعبہ و کلیسا میں
صنم کدوں میں دو بالا ہے شان پھولوں کی

گلے میں شوخ حسینوں کے ان سے زینت ہو
خدا کے فضل سے رہ جائے آن پھولوں کی

خرامِ ناز میں سرگرم دلفریب نسیم
زبان حال سے ہے ترجمان پھولوں کی

کہاں نصیب میں ان کے تھی یہ گل افشانی
ہے بلبلوں کے دہن میں زبان پھولوں کی

کچھ آؤ چل کے منور کریں خریداری
لگائے بیٹھی ہے قدرت دکان پھولوں کی

لکھنؤ

گومتی کا سیلاب

دیکھ آج اپنی طرف کیا ہو گیا گوما تجھے
سچ بتا دے آگیا کس بات پر غصّا تجھے
کس لئے پامالیِ خلقت کا ہے سودا تجھے
ہم تو مدّت سے سمجھتے تھے بہت سیدھا تجھے
لکھنئو والوں نے آخر کیا بگاڑا تھا ترا
ہے بپا قہر و غضب کس واسطے اتنا ترا

ہم تری شکلِ جمالی کے پرستاروں میں تھے
ہم ترے حُسنِ خموشی کے خریداروں میں تھے
ہم ترے فیض دوامی کے طلبگاروں میں تھے
تیرے دیوانوں میں تیرے ناز برداروں میں تھے
کس لئے ہیبت زدہ شانِ جلالی سے کیا
کیوں دل اپنا خوش ہماری پائمالی سے کیا

گومتی گنگا کی اے چھوٹی بہن اے گومتی
پوجتے ہیں تجھ کو صدہا مرد و زن اے گومتی
دیویوں کی طرح تھا تیرا چلن اے گومتی
تیرے دل میں تھے نہ ہرگز مکر و فن اے گومتی
کس لئے پھر آج طرز و طور بدلا ہے ترا
ہر جگہ خلقِ خدا پر قہر برپا ہے ترا

تیرے جس پانی سے ہر ذی روح کی بجھتی ہی پیاس
آج اس کو دیکھ کر ہوتا ہے دل وقفِ ہراس
کیا ذرا رسم مروت کا نہیں اب تجھ کو پاس
چھوڑ دیں کیا شہر میں ہم چین سے بسنے کی آس
اب نہ سرکش ہوں کبھی امواج طوفانی تری
کشتیٔ دل غرق کر دیتی ہے طغیانی تری

ٹیسو کا پھول

مرحبا مرحبا گلِ رنگیں
حبذا حبذا گلِ رنگیں
اللہ اللہ رے حسنِ زیبائی
اللہ اللہ رے شانِ رعنائی
آگ گویا لگی ہے جنگل میں
ایک ہلچل مچی ہے جنگل میں
آتش افروز رشک تیری بہار
جل مرے حسن دیکھ کر یہ چنار
ہے تری شوخیوں سے آگ گلاب
اور گلنار شرم سے آب آب
ریشہ ریشہ تھا ڈھاک کا پُرخوں
پتہ پتہ تھا ڈھاک کا پُرخوں
کس نے یارب یہ کر دیا جادو
کھنچ کے پھولوں میں آگیا ہے لہو
سرزمیں یمن ہے یا جنگل
اک شگفتہ چمن ہے یا جنگل
ہیں دہکتے ہوئے یہ انگارے
اُتر آئے ہیں چرخ سے تارے
شعلۂ نار جابجا روشن
مہرۂ مار جابجا روشن
مئے احمر کا یا ہے بحرِ رواں
اُف رے اس کا یہ جوش یہ طوفاں

ہے قیامت کا اس میں جوش و خروش
کیا ٹھکانے لگے سفینۂ ہوش

کیوں ہے روتا لہو گلِ رنگیں
کس سے پھولا ہے تو گلِ رنگیں
کون دشمن ہوا ترے دل کا
خون کس نے کیا ترے دل کا
رحم نازل کرے خدا تجھ پر
میں بھی تیری طرح ہوں تفتہ جگر

کیا کروں اپنے دل کا حال بیاں   آشکارا ہو گیا غم نہاں

رہے یہ راز اگر تو بہتر ہے

نہ ہو اس کی خبر تو بہتر ہے

پھول ٹیسو کے ماجرا ہے یہ کیا   کس سے کس بات پر ہے اتنا خفا

اس قدر تیرا چہرہ لال ہے کیوں   اس قدر تجھ کو اشتعال ہے کیوں

کون ہے تجھ کو چھیڑنے والا   بخیۂ ہوش اُدھیڑنے والا

آگ ہے شعلہ ہے بھبو کا ہے   کیوں نزول آنکھ میں لہو کا ہے

دیکھ تو اپنی سمت جانے دے   آگ اس کو یونہیں لگانے دے

یہ بھی اک مدعائے قدرت ہے

یہ بھی اک مقتضائے قدرت ہے

پھول ٹیسو کے تجھ پہ ہوں میں نثار   دنگ ہوں دیکھ کر تری یہ بہار

ہو ترے وصف میں نہ بند زباں   ڈال دے قالبِ سخن میں جاں

شعر وہ کیا جو دل میں گھر نہ کرے   کیا سخن وہ جو کچھ اثر نہ کرے

تو سما جا کلام میں میرے

ڈوب جاؤں میں رنگ میں تیرے

صُبحِ وطن

دیارِ غیر میں ہے انتظارِ صبحِ وطن نگاہِ شوق نہیں شرمسارِ صبحِ وطن

ہے شامِ یاس ہی اک یادگارِ صبحِ وطن نصیب ہی میں نہیں کیا بہارِ صبحِ وطن

چراغ گُل ہو غم و یاس کا۔ اُمید نہیں

ضیائے مہر سے دامانِ دل سفید نہیں

برہنی

ہجراں نصیب

(ہندی جذبات کا آئینہ)

اے کالے کالے بادل مجھ پر رحم نہیں کیوں کھاتا ہے
تو پانی یہ برساتا ہے یا دل میں آگ لگاتا ہے

جب تیری بوندیں گرتی ہیں غم کی ماری رو دیتی ہوں
جب شور ترا یہ سنتی ہوں میں ہوش اپنے کھو دیتی ہوں

اُف کیسا پپیہا ظالم ہے تو نے اس کو بھڑکایا ہے
پیتم کی یاد دلانے کو پی پی کا شور مچایا ہے

بے پیتم میرا کون بھلا دل رکھنے والا ہمدم ہے
میں اپنے دیس میں بے بس ہوں پردیس میں میرا پیتم ہے

ساون کے نہ یہ صدمے سہتی بھادوں سے نہ میں یہ دکھ پاتی
پرواز اگر ہوتی اڑ کر پیتم کے پاس پہنچ جاتی

ناگن کی طرح میری جانب بجلی کمبخت لپکتی ہے
وہ سوز بھرا ہے سینے میں ہر دم اک آگ بھڑکتی ہے

ایسا بھی دنیا میں کوئی اے بادل بھولا ہوتا ہے
جس چیز کو میں چھو دیتی ہوں پیتم کا دھوکا ہوتا ہے

میں ان پہ نچھاور ہوتی ہوں میں ان کی بلائیں لیتی ہوں
بندھتا ہے تصور چرنوں کا جب سر ان پہ رکھ دیتی ہوں

دہلی - ۱۹۲۹ء

بسنت کی ڈالی

جاڑے کے اُتار کا زمانہ آیا
مستی کے اُبھار کا زمانہ آیا
بدلا بدلا وہ رُخ ہوا کا بدلا
دیکھو کہ بہار کا زمانہ آیا

مسحورِ بہار، دل حسینوں کے ہوئے
جلوے بیتاب مہ جبینوں کے ہوئے
اللہ رے، شکست ناز، یہ حالتِ دل
گم ہوش و حواس نازنینوں کے ہوئے

سرمایۂ لطفِ زندگانی لائی
تحفہ میں بہارِ شادمانی لائی
خوانِ الطاف اپنے ہاتھوں میں لئے
سامانِ ضیافتِ جوانی لائی

مُطرب گت جھوم کر بجا دے کوئی
نغمہ وجد آفریں سُنا دے کوئی
مرغوب ہے کانوں کو فقط فصل کی چیز
گانا ہے، اگر بسنت گا دے کوئی

گوشہ گوشہ کو جگمگا دیتی ہے
اک رشکِ ارم چمن بنا دیتی ہے
دل کس لئے آخر نہ ہو قربانِ بہار
اک آن میں معجزہ دکھا دیتی ہے

رنگت ایسی ہے کچھ ہوا کی بدلی
حالت دلِ خلقتِ خدا کی بدلی
رندانِ جواں کو شغل میں جب دیکھا
نیت پیرانِ پارسا کی بدلی

سامان مسرت کے بہم دیکھتے ہیں　　اللہ کی یوں شانِ کرم دیکھتے ہیں
آنکھوں میں نور دل میں بڑھتا ہے سرور　　پھولی ہوئی سرسوں کو جو ہم دیکھتے ہیں

حاصل ہے سرور و شادمانی بیحد　　حالت یہی قائم رہے تا روزِ ابد
یارب آنکھیں کھلی رہیں یہ جب تک　　ہو سب کو بسنت کی مبارک آمد

قطعہ

تیرے سوا ہے کس کو بھلا کوئی مقدرت　　جو کچھ بھی ہے جہاں میں تجھے اختیار ہے
تیرے بغیر ذکرِ بقا و فنا فضول　　دنیا کا تیری ذات پہ دار و مدار ہے

قطعہ

تیری وحدت کے تصدق تیری کثرت کے نثار　　دو جہاں میں ہے نمایاں حسنِ یکتائی ترا
اور کچھ تیرے سوا اس کو نظر آتا نہیں　　غیر سے ناآشنا رہتا ہے شیدائی ترا

ابرِ بہار کا افسانہ

جس نے دیکھا منظرِ مستانۂ ابرِ بہار
ہوش کھو کر ہوگیا دیوانۂ ابرِ بہار

جھومتا ہے دیکھ کر دیوانۂ ابرِ بہار
زینت دوش ہوا میخانۂ ابرِ بہار

اس طرف بھی ہو رُخِ پیمانۂ ابرِ بہار
ہم بھی دیکھیں موجۂ مستانۂ ابرِ بہار

ہوش میں آ اے دلِ دیوانۂ ابرِ بہار
تو نے کچھ سمجھا بھی ہے افسانۂ ابرِ بہار

مرحبا رنگینیٔ افسانۂ ابرِ بہار
ہو رہا ہے اک جہاں دیوانۂ ابرِ بہار

دفترِ معنی ہے سیاروں کی گردش میں نہاں
لوحِ گردوں پر ہے درج افسانۂ ابرِ بہار

ہے عیاں ہر قطرۂ باراں سے اعجازِ نسیم
قصۂ منظوم ہے افسانۂ ابرِ بہار

آہ وہ دل جو نہیں لطف آشنائے برق و باد
آہ وہ آنکھیں جو ہوں بیگانۂ ابرِ بہار

باد کیا ہے اک نگارِ مست رعنائی کی موج
برق کیا ہے اک چراغ خانۂ ابرِ بہار

کھا رہا ہے چرخ پر کیا کیا جھکولے دیکھئے
اک ہنڈولا ہے کہ ہے کاشانۂ ابرِ بہار

کی کسی مستِ فلک منزل نے فرمائش جہاں
آگیا اُڑ کر وہیں میخانۂ ابرِ بہار

جس بگولے کی نہ سمجھی ہم نے پہلے خاک قدر
بن رہا ہے سُرخیٔ افسانۂ ابرِ بہار

برہمی مثلِ مزاجِ یار کہساروں میں تھی
چوٹیوں میں جا کے اُلجھا شانۂ ابرِ بہار

قسمتِ محروم اس کی کتنی یاس انگیز ہے
تنگ ہو جس کے لئے پیمانۂ ابرِ بہار

کر دیا پانی اسے آخر جو دل کی آگ تھی
دیدنی ہے جوہرِ پروانۂ ابرِ بہار

شمع کس محفل کی ہے وہ جس کا دلدادہ یہ ہے
مضطرب ہے چرخ پر پروانۂ ابرِ بہار

دھوپ جب پڑتی ہو بن جاتا ہی سونے کا محل
گو ہے اک چاندی کا گھر کاشانۂ ابرِ بہار

پڑگیا ہے اس پہ شاید پرتو تقدیرِ شمع
ہو پپیہا ورنہ کیوں پروانۂ ابرِ بہار

روح پر ہے وجد طاری دل کو ہی فرحت نصیب
کوک کوئل کی ہے یا افسانۂ ابرِ بہار

بجلیوں کے کوندنے سے آئینہ ہوتا ہے یہ
ہے سراپا سوزِ دل پروانۂ ابرِ بہار

گوہرافشانی منوّر خوب کی برسات میں
نظم تیری ہے کہ اک افسانۂ ابرِ بہار

دہلی

رُباعی

گرا دیتا ہے دل کو خواہشوں کا اوج پستی میں
زیاں اپنا ہی دیکھا ہر طرح دنیا پرستی میں

ہوا ترک تعلق باعث تسکین روحانی
لگایا دل کسی شے سے نہ ہم نے بزم ہستی میں

رُباعی

رحمت تری جاوداں ہے پایندہ ہے
ہستی بیدار موت شرمندہ ہے

مرجھائے ہوئے پھول شگفتہ ہیں آج
مُردہ پہلے تھا جو وہ اب زندہ ہے

ہولی

اور

ایک آدرش نوجوان ہندو بیوہ کے جذبات

کسی کے ساتھ گئی سب ہنسی خوشی میری ۔ کہ پوچھتا نہیں اب کوئی بات بھی میری
ہے ایک عالم تاریک زندگی میری ۔ نہ کیوں ہو رنگ سے بیزار چونری میری
مُصیبت آہ رنڈاپے کی اپنے جھیلوں گی
کسی کے ساتھ نہ ہولی میں رنگ کھیلوں گی

اُٹھائیگا جو کوئی میری سمت پچکاری ۔ کروں گی سلسلۂ اشک ماتمی جاری
نہ آئے کوئی بھگونے کو اب مری ساری ۔ کسی کی یاد میں روتی ہوں رنج کی ماری
نشاط و عیش کے دن ہیں رنگ راگ کے دن
چلے گئے ہیں سدا کے لئے سہاگ کے دن

کسی کے ہنسنے ہنسانے کو آئی ہے ہولی ۔ لگی کسی کی بجھانے کو آئی ہے ہولی
مگر مجھے تو جلانے کو آئی ہے ہولی ۔ جگر میں آگ لگانے کو آئی ہے ہولی
یہ میرے جی میں ہے کچھ کھا کے آج سو جاؤں
میں جل کے آگ میں ہولی کی راکھ ہو جاؤں

وہ جنس ہوں نہ خریدار کوئی جس کا ہو ۔ وہ باغ ہوں جو فضا میں مثال صحرا ہو
وہ رنگ ہوں جو نگاہ جہاں میں پھیکا ہو ۔ وہ پھول ہوں جو خود اپنی نظر میں کانٹا ہو

مرے بہار کے موسم میں آگ لگ جائے
مرے شباب کے عالم میں آگ لگ جائے

کوئی جو فرطِ مسرت سے راگ گاتا ہے
مرے شباب پہ برقِ ستم گراتا ہے
جو رنگ ڈال کے مجھ کو لہو رُلاتا ہے
اک آگ سی مرے جذبات میں لگاتا ہے

خوشی یہ، لُطف یہ، یہ عیش، یہ مزا کیسا
وہی نہیں ہیں تو پھر رنگ کھیلنا کیسا

کسی کو بھی نہیں دنیا میں حق یہ اُن کے سوا
کہ آ کے ہاتھ پکڑ لے چھوئے بدن میرا
میں ایک عزت و دل دے چکی جسے اپنا
مری نگاہ میں ثانی نہیں کہیں اُس کا

تمام عُمر مصائب خوشی سے جھیلوں گی
مگر نہ غیر سے ہولی کبھی میں کھیلوں گی

قطعہ

اُڑے گا رنگ و روغن سب کا جتنی بھی ہیں تصویریں
فنا ہو جائیں گی اِک روز آب و گِل کی تعمیریں
مآل کار ہیں مرنا ہر اک صورت سے برحق ہے
کرے انسان چاہے جس قدر جینے کی تدبیریں

ایک وجدانی نغمہ

ارنڈ کا درخت اک چمن میں تھا لگا ہوا   چمن یہ اپنے لطف میں تھا خلد ساں بنا ہوا
تھا ایک خاص شان سے ہر ایک گل کھلا ہوا   ترانہ سنج اُس میں ایک مُرغ خوشنوا ہوا

توہی توہی توہی توہی توہی توہی توہی

وہ مُرغِ خوشنوا تھا یا کوئی پری تھی اندر کی   تھی اس کی نغمہ سنجیوں میں ایک طُرفہ دلکشی
ہوئی وہ دل کو تازگی کلی ہر ایک کھل گئی   صدا یہ سُن کے صوفیوں کی چشمِ معرفت کھلی

توہی توہی توہی توہی توہی توہی توہی

یہ مرغِ خوشنوا نہ تھا، تھا کوئی عارفِ الٰہی   عطا کیا خدا نے تھا جسے کمالِ حق رسی
پڑی جو میرے کان میں، ملا سرورِ باطنی   صدائے خوشگوار یہ کچھ اتنی لُطف خیز تھی

توہی توہی توہی توہی توہی توہی توہی

طلسم ریز اس کے قلب میں خدا کی ذات تھی   کہ روح اس پرند کی بہارِ کائنات تھی
میں اس پہ دل سے تھا فدا نہاں وہ اس میں بات تھی   رسیلا ایسا راگ تھا، شکر بھی جس سے مات تھی

توہی توہی توہی توہی توہی توہی توہی

ہے عارف اس کو ماننے میں کیا کسی کو پس و پیش   مٹا چکی ہے ذہن سے یہ اپنے جسم کا قفس
نظر میں اس کی ایک ہی ہے اب قرار خار و خس   زباں کو اس کی رٹ یہی لگی ہوئی ہے ہر نفس

توہی توہی توہی توہی توہی توہی توہی

ضرور رہ چکا ہے یہ فضائے کوہ طور میں   سما چکا ہے اس کا دل خدا کے پاک نور میں

ہے اک یہ مرغِ حق پرست حلقۂ طیور میں — کہ نغمہ سنج دیکھئے ہے عالمِ سُرور میں

توہی توہی توہی توہی توہی توہی توہی

خدا کے ذکر و فکر سے ہیں دور حضرت بشر — نہیں ہے اس کی یاد سے پرند بے خبر مگر

منورؔ اپنی سمت بھی تو دیکھ آنکھ کھول کر — گذر کر اب خودی سے ہاں یہ ذکر لا زبان پر

توہی توہی توہی توہی توہی توہی توہی

قطعہ

بادِ صبا کے جھونکوں سے چال مشابہ ہے ان کی — جس گلشن میں جاتے ہیں ایک نیا گُل کھلتا ہے

بستی ہو یا ویرانہ آنکھ جدھر اُٹھ جاتی ہے — پیشِ جگر اک ہوتا ہے ایک نیا دل ملتا ہے

قطعہ

نہ بچپن پر کبھی اترا نہ بھول اتنا جوانی پر — نظر تیری رہے دائم مآلِ زندگانی پر

بُڑھاپا آ کے تجھ کو موت کا منظر دکھاوے گا — ہے آخر اعتبار اتنا یہ کیوں دنیائے فانی پر

برسات کا ترانہ

ہوائیں جنوں زا چلی آ رہی ہیں
شرارت سے شوخی سے اٹھلا رہی ہیں
کسی کے کلیجے کو تڑپا رہی ہیں
کسی کے جگر کو یہ برما رہی ہیں
گھٹائیں اُمڈتی چلی آ رہی ہیں

طبیعت میں ہے ایک ہیجان پیدا
ہم آرزو میں ہے طوفان پیدا
وہ دلبستگی کے ہیں ساماں پیدا
کہ ہے جسم میں اک نئی جان پیدا
عجیب اس میں خالق کی ہے شان پیدا

طرب خیز کیسا ہے منظر فلک پر
گھٹاؤں نے پھیلائے ہیں پَر فلک پر
رواں ہے یم آبِ کوثر فلک پر
اُمڈ آیا ہے شاید سمندر فلک پر
ہیں آئینہ قدرت کے جوہر فلک پر

کبھی موسلا دھار بارش کا عالم
کبھی بوندیاں ننھی ننھی ہیں کم کم
اُمڈتے ہیں رہ رہ کے جذبات پیہم
برستا ہے جس وقت پانی جھما جھم
سماں ہے سہانا۔ ہے دلچسپ موسم

بیاباں میں اعجاز قدرت کے دیکھو
گلستاں میں انداز قدرت کے دیکھو
نظارے فسوں ساز قدرت کے دیکھو
خود آرائی پر ناز قدرت کے دیکھو
کھلے خود بخود راز قدرت کے دیکھو

دہلی - ۱۹۳۰ء

پریم ناؤ

(ایک تصویر دیکھ کر)

چوم لوں آ اِدھر اے خانۂ نقاش تجھے
کہہ رہا ہوں تری نُدرت پہ میں شاباش تجھے

داد تو نے فنِ تصویر کی کیا کیا دی ہے
نقش تیرا ترے اعجاز کا فریادی ہے

فتنہ برپا کیا تصویر بنا کر تو نے
پا لیا کیا مجھے دلگیر بنا کر تو نے

ڈگمگاتی ہے جو کشتی مرے ارمانوں کی
کیفیت ہے مرے جذبات میں طوفانوں کی

تو نے تصویر یہ کھینچی کہ ستم ڈھایا ہے
خامۂ مانیؔ و بہزادؔ کو شرمایا ہے

بحرِ اُلفت میں روانی جو سفینے کی ہے
کیفیت کوئی مصوّر ہی کے سینے کی ہے

یوں کیا راز ہے جس نے کوئی افشا اپنا
کھینچ کر رکھ دیا کاغذ پہ کلیجا اپنا

اس کے نظّارے سے دل بھر کے مزا لیتا ہوں
تیری تصویر کو سینے سے لگا لیتا ہوں

وہ دمِ شام جھپکتی ہوئی چشمِ خورشید
دن کے ڈھلنے کی ہوائے لبِ جُو سے تائید

سبزہ زاروں کی فضا خوب ہویدا کی ہے
بات دریا کی روانی میں بھی پیدا کی ہے

تیرتے پھول کنول کے نظر آتے ہیں مجھے
بیخود بوئے دلآویز بناتے ہیں مجھے

اوجِ گردوں سے جو چھن چھن کے برستا ہے یہ نور
تیرگی اُڑ گئی دُنیا سے برنگِ کافور

ہلکی ہلکی سی نمایاں ہے شفق کی لالی
جھومتی وجد میں پیڑوں کی ہے ڈالی ڈالی

لطفِ گلزار بھی کیفیّتِ صحرا بھی ہے
لبِ دریا ہے وہ کچھ دور شوالا بھی ہے

جو ادھر مائلِ پرواز طیور آتے ہیں
پیاس دریا میں بجھانے کو ضرور آتے ہیں

پر اٹھائے کوئی پھیلائے کوئی آتا ہے
بیٹھتا ہے کبھی نیچے تو جھجک جاتا ہے

چھیڑ دیتا ہے انہیں دستِ حنائی کوئی
اپنے دیدوں کی دکھاتا ہے صفائی کوئی

جس کی آرائشِ گیسو میں ہیں اندازِ ستم
خمِ محراب کا ابرو میں ہے جس کے عالم

جس کے بالوں کی سجاوٹ گلِ خنداں سے ہے
جس کے جلووں میں ادا فرق نمایاں سے ہے

جس کی ہر آنکھ میں پنہاں کوئی قتّالہ ہے
حسنِ رُخ جس کا کوئی شعلۂ جوّالہ ہے

جس کے گالوں سے مہ و خور کی تجلّی ہے عیاں
جس کے لب ضبطِ ستم کے لئے ہیں کوشاں

برگِ پاں کی ہیں عیاں جس کے دہن میں سُرخی
جس کی سرخی سے ہے یاقوتِ یمن میں سُرخی

کان میں جس کے ہیں پھولوں کے جڑاؤ کنڈل
ناک جس کی ہے کوئی سنگِ بلوریں کا محل

جس کا سینہ ہے نہاں پردۂ زنگاری سے
ہے تکلّف جسے محرم کی گرانباری سے

چوڑیاں ساعدِ سیمیں کی ہیں زینت جس کو
حُسن کی جان ہے اندازِ نزاکت جس کو

زیب دیتی ہے شکم سے کفِ پا تک ساری
دستِ صنّاع کی ہے جس سے عیاں گلکاری

مسندِ گل پہ جو لیٹی ہوئی راحت سے ہے
سیرِ دریا میں جو مشغول مسرّت سے ہے

مخملِ سرخ کی یہ مسندِ نیرنگ نما
خون سے بیربہوٹی کے رنگی ہے گویا

تکیۂ گل کا ہے مطبوع سہارا جس کو
اُف نہیں بارِ نزاکت بھی گوارا جس کو

استراحت کا ہے اک ہاتھ سے ظاہر عالم
دوسرے ہاتھ میں صیّاد کا اندازِ ستم

دل یہ کہتا ہے کوئی حُسن کی دیوی ہے یہ
حورِ فردوس ہے یہ نور کی پتلی ہے یہ

جس پہ ہر ایک تصدّق ہو وہ صورت ہی یہ
جس کا ہر ایک پجاری ہے وہ مُورت ہے یہ

دیکھتی چشمِ عقیدت سے ہے جس کا انداز
شوق سے جانب بائیں کوئی مصروفِ نیاز

بارکاشانۂ معبود میں پانے کے لئے
ہاتھ میں ہار ہے پھولوں کا چڑھانے کے لئے

مثلِ مہتاب ضیا بار چلی جاتی ہے
خود بخود نور کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے

دیوتا پریم کا قربان ہے اس دیوی پر — رخ گلگوں پہ کہیں جسم کے نہ رہ جائے نظر

ناؤ میں اپنی محبت سے بٹھایا ہے اُسے — زینت کشتی آغوش بنایا ہے اِسے

موج تھی چل کے ذرا دیکھئے دریا کی بہار — جس میں یک جا ہے بہم گلشن و صحرا کی بہار

اے مصوّر تری صنعت کا میں راز اب سمجھا — جو ترے دل میں ہے مستور وہ مطلب سمجھا

جو ندی اس میں بہائی ہے ندی پریم کی ہے — جو ندی تو نے بنائی ہے ندی پریم کی ہے

خلد سے دہر میں جمراج نے بھیجا جس کو — اپنے الفاظ میں ہم کہتے ہیں جمنا جس کو

روغن و رنگ سے ہے پریم کا اس میں اظہار — پریم ہی ناؤ ہے اور پریم ہی اس میں ہے سوار

جلوہ افروز ہے جو عشق سراپا ہو کر — کرشن کے دل پہ جو منقوش ہے رادھا ہو کر

وہ بھی خود پریم ہے کہتے ہیں پجارن جس کو — پریم کی بھیک کی سمجھے ہیں بھکارن جس کو

پریم کی داد ہے خود پریم ہی دینے والا — پریم کی ناؤ کا ہے پریم ہی کھینے والا

کششِ حُسن کا جو مرکز پنہانی ہے — جس کی دنیائے محبت میں جہانبانی ہے

نُور چہرے پہ کھلا جس کے سویدا ہو کر — چاند گوکل کا بنا ہے جو کنہیا ہو کر

یہی خاکا یہی نقشہ نظر آتا ہے مجھے
پریم ہی پریم کا جلوہ نظر آتا ہے مجھے

دہلی - ۱۹۳۰ء

اشاراتِ شوق

غیر سے آنکھ ملانا بھی گوارا کیوں ہو
جو ہمارا نہو آخر وہ ہمارا کیوں ہو

رہ کے پہلو میں جو ہو قائل دیوار حجاب
شمع بن کر وہ کہیں انجمن آرا کیوں ہو

پہلے جس سمت نظر باندھ کے منہ پھیر لیا
اب اسی سمت کنکھیوں سے اشارا کیوں ہو

جسے منظور نہ منظور نظر ہونا تھا
دیدۂ شوق کو پھر اس کا نظارا کیوں ہو

ہائے اُس جانِ تمنا کا مُنوّر دیدار
جس سے آبادیٔ آغوشِ تمنا نہوئی

دید نادید کی اس عید سے حاصل ہی کیا
گوشۂ دل میں اگر انجمن آرا نہوئی

اِف رے اس نیم نقابی کا یہ اندازِ ستم
ہو کے بھی پردہ درِ جلوہ رعنا نہوئی

کس لئے مرغ نظر کو ہو اُلجھنے کی ہوس
دامِ صیاد اگر زلفِ چلیپا نہوئی

ہو گئے خاک بھی ہم سوزِ محبت سے اِدھر
آگ یہ دل میں اُدھر نام کو پیدا نہوئی

پردہ پردہ میں رہا شغلِ پرستاریٔ حسن
نہوئی ہم سے منوّر کبھی توبہ نہوئی

پانی کا توڑا

خلقت کی روح لرزتی ہے دل دہقاں کا گھبراتا ہے — پانی کا اب تک نام نہیں ساون بھی گزرا جاتا ہے
کچھ کھیتوں کی تیاری کی بیچارے کو اب آس نہیں — ان ہلکے ہلکے چھینٹوں سے بجھنے کی ہرگز پیاس نہیں
گرمی سے سوکھے کھیت پڑے ہیں کیسے ان کو سینچیگا — دن رات پڑا ہی ہیں جُست کر کتنا پانی یہ کھینچیگا
اے اندر[1] یہ غفلت کیسی ہے کیوں توڑا ہے یہ پانی کا — اک حالت ہے مایوسی کی اک عالم ہے حیرانی کا
ڈر اندر اس چھن جانے کا کیا تیری راہ میں حائل ہے — کیوں اتنی دیر لگائی ہے کیوں فرض سے آخر غافل ہے
کچھ تیرا زور پون[2] پر ہے کچھ تجھ سے برن[3] سے سازش ہے — پھر کیوں امساکِ باراں ہے پھر کیوں فقدان بارش ہے
کیا مہر و قلزم بھول گئے امسال بنانا بادل کا — کیا دنیا میں اک کام نہیں پانی برسانا بادل کا
جو اس کا ٹکڑا گردوں پر بھولے بھٹکے آجاتا ہے — وہ خود اپنی ناداری پر کچھ آنسو ٹپکا جاتا ہے
اٹھے جتنے دریا نہر بنے اور ریگ رواں ہے نہروں میں — ہر لب پر مانگ ہے پانی کی دیہاتوں میں اور شہروں میں
کیفیت ہم کو ملتی ہے جھیلوں میں ریگستانوں کی — پانی کا توڑا ہونے سے افزوں ہے حدت کانوں کی
پھولوں کی محفل گرم نہیں مایوسی ہے گلزاروں کو — گردوں پر بھلے تانے ہیں ہے اتنا غصہ خاروں کو
بیٹھا ہے پپیہا چپ سادھے دل کوئل کا افسردہ ہے — بے جانوں کا کیا حال کہیں جاندار ہر اک جب مردہ ہے

یارب اب تیری رحمت ہو ٹل جائے مصیبت یہ سر سے
ہو جوش سمندر میں پیدا بادل اُمڈے پانی برسے

دہلی - ۱۹۲۸ء

[1] اندر پانی برسانے کا دیوتا [2] پون ہوا کا دیوتا [3] برن پانی کا دیوتا۔

انسان کی خونخواری

ذبیحِ خنجرِ عصیاں ہے عقلِ انسانی
رُلائے خوں نہ کہیں بیکسوں کی قربانی
چُھری ہے تیز مدام انقباضِ جاں کے لئے
ہزار ظلم ہیں اک لذّتِ زباں کے لئے
نہ آفرینشِ جاں کی ہو مقدرت جس کو
خدائے پاک نے دی ہو نہ یہ صفت جس کو
قضا کے ساتھ وہ مصروفِ ساز و باز ہو کیوں
کسی کی جان بھی لینے کا وہ مجاز ہو کیوں

جتا نہ اپنی فضیلت فضول انساں تو
جو بے زباں ہیں نہ بن ان کا دشمنِ جاں تو
کیا نہ تربیتِ نفس نے اثر اب تک
بنا ہے کس لئے خونخوار جانور اب تک
ہزار حیف تری سفلہ کاریاں نہ گئیں
ہزار حیف یہ بدعت شعاریاں نہ گئیں
جدا نہ خود سے کبھی ہستیِ جہاں کو سمجھ
عزیز جان سے اپنی ہر اہلِ جاں کو سمجھ
شکم میں جھونک نہ معصوم بے زبانوں کو
غذا نہ اپنی بنا بے گناہ جانوں کو
ترا شعار جو تکریمِ زندگی ہو جائے
تری سرشت سے خارج درندگی ہو جائے

دہلی۔ ۱۹۲۹ء

بے ثباتیٔ دُنیا

اے جُرعہ کشِ ایاغِ ہستی — اے عاشقِ سبزہ باغِ ہستی
اے طائرِ مرغزارِ عالم — محوِ سیرِ بہارِ عالم
پروانۂ شمعِ زندگانی — دیوانۂ شمعِ زندگانی
اے جان جہاں پہ دینے والے — اے نقدِ طرب کے لینے والے
ناداں تو کس خیال میں ہے — کچھ دیکھ تو کون حال میں ہے
تو اک ہے اسیرِ دامِ تزویر — بیشک پھوٹی ہے تیری تقدیر
چاروں طرف اپنے اک نظر ڈال — دنیا کا بغور دیکھ سب حال
ہے جز و بقا کا اس میں معدوم — ہر چیز کا ہے وجود موہوم
ہر سمت بچھا ہے وہم کا دام — ہر شے کا یہاں فنا ہے انجام
مٹنے والی ہیں جملہ اشکال — اک موج ہوا ہے دولت و مال
ہو طفل جوان ہو کہ ہو پیر — ہیں سب یکساں فنا کی تصویر
دو دن کی ہر ایک زندگی ہے — مٹنا اک روز لازمی ہے
یہ ماو شُما کی رشتہ مندی — اقبال کی پستی و بلندی
یہ شام و سحر تلاشِ راحت — احباب و عزیز کی محبّت
یہ قصر حویلیاں عمارات — یہ مرتبہ اوج یہ خطابات
یہ شان و شکوہ یہ مراتب — یہ حسن و صفات یہ مناقب

یہ فہم وخرد، یہ عقل وادراک　　یہ خلعتِ فاخرہ یہ پوشاک
جن پر تجھے ناز اس قدر ہے　　کچھ ان کے مآل کی خبر ہے
فانی ہیں یہ ہاں تمام فانی　　ان میں نہیں کوئی جاودانی
ہرگز ان سے نہ دل لگانا　　ان کا نہیں کوئی بھی ٹھکانا
جو ان پہ مگس صفت فدا ہیں　　پابند ہیں، غم میں مبتلا ہیں
ساماں جتنے بھی دلنشیں ہیں　　نیش عقرب سے کم نہیں ہیں
گو ہیں ان کی ادائیں شیریں　　مسموم ہیں یہ غذائیں شیریں

ان سے رہنا مدام آزاد
آزاد ہمیشہ رہتے ہیں شاد

لکھنؤ ۱۹۲۳ء

رُباعی

اس عالم آب وگل پہ مرتا کیوں ہے　　غفلت سے بسر جہاں میں کرتا کیوں ہے
منھ پھیر کے مالک سے منوّر آخر　　پستی میں بلندی سے اُترتا کیوں ہے

نعرۂ وحدت

مہِ پُرنور ہوں میں مہرِ درخشاں ہوں میں
ذرّہ ذرّہ میں ضیا بن کے نمایاں ہوں میں

چپّے چپّے پہ عیاں جوشِ نمو مجھ سے ہے
چمنِ دہر کے ہر پھول میں بو مجھ سے ہے

جلوہ زا خندۂ گلریزِ سحر میں ہوں میں
رونما حسنِ تجلّیِ شرر میں ہوں میں

موجۂ بادِ دل افروزِ دمِ شام ہوں میں
دلِ عاشق کے لئے باعثِ آرام ہوں میں

بہرِ مرغانِ چمن قوتِ پرواز ہوں میں
پرِ طاؤس ہوں میں بازوئے شہباز ہوں میں

حسن بن کر میں نمایاں رخِ محبوب میں ہوں
شرم بن کر میں ہویدا دلِ محجوب میں ہوں

جو حسینوں میں ادا ہے وہ ادا ہے میری
پردۂ حسنِ دل آرا میں ضیا ہے میری

چاشنی بن کے نمایاں لبِ شیریں میں ہوں
رنگ بن کر میں نمایاں گلِ رنگیں میں ہوں

شورہا جنگ میں ہوں مائلِ پیکار ہوں میں
برشِ فرقِ عدو کے لئے تلوار ہوں میں

دلِ مادر کے لئے مایۂ اُلفت ہوں میں
طفلکِ سینہ سرِ جوشِ محبت ہوں میں

گُلِ گلشن ہوں کہیں، بلبلِ گلزار کہیں
ہوں کہیں برہنہ پائی خلشِ خار کہیں

ہوں عیاں زمزمۂ طائرِ بستاں بن کر
لبِ جو مست ہوں میں سروِ خراماں بن کر

خوشۂ تاک ہوں میں بادۂ انگور ہوں میں
روحِ میخانہ ہوں میں میکشِ مسرور ہوں میں

سطحِ تالاب پہ کھلتا ہوں میں بن بن کے کنول
چرخ پر جا کے برستا ہوں میں بن کر بادل

میں ہوں چقماق میں موجود شرارا بن کر
ضوفشاں ہوں سرِ گردوں میں ستارا بن کر

رند ہوں، ساغرِ مے، ساقیِ مینا ہوں میں
دیکھتی ہے جسے دنیا وہ تماشا ہوں میں

شمع سوزاں بھی ہوں، پروانۂ محفل بھی ہوں　　میں مسافر ہوں مسافر کی منازل بھی ہوں

میزباں ہوں میں کہیں اور کہیں مہماں ہوں میں
یونہیں ہر چیز میں ہر سمت نمایاں ہوں میں

لکھنؤ

قطعہ

روح کو تسکیں بھی ہے کچھ درد کی ایذا کے ساتھ　　خار کی صورت خلش زا شغل گلچینی بھی ہے

اس سے گھبرانا منوّرؔ ہے حماقت کی دلیل　　فرض کے احساس کی تلخی میں شیرینی بھی ہے

قطعہ

ہے ازل سے یوں تو جاری کارخانہ موت کا　　ایک دن ہر شخص بنتا ہے نشانہ موت کا

بے وسیلہ سلب کر سکتی نہیں یہ روح کو　　کچھ نہ کچھ ہوتا ہے دنیا میں بہانہ موت کا

گنگا جی

ترنم روح افزا ان میں اک ہر وقت جاری ہے
تری موّاجیوں پر دل سے میں قربان اے گنگا
اگر پیدا ہیں نغمے دلربا تیری روانی سے
عیاں کرتا ہوں تجھ پر میں بھی اک ارمان اے گنگا

ازل سے جلوہ گاہِ ناز تیری ملک میں دیکھی
ظہور پاک تیرا چشمۂ گنگوتری سے ہے
ہوا ہے سرزمین ہند کو تجھ سے شرف حاصل
ہمالہ سربلند اتنا تری جلوہ گری سے ہے

تری ہستی کے پردے میں نہاں کچھ رمز ہے شاید
نہ در نہ چشم عالم میں یہ تیری منزلت ہوتی
تجھے کیوں اور دریاؤں سے افضل مرتبہ ملتا
نہ تیرے پاک پانی میں اگر کوئی صفت ہوتی

ترے پانی میں ہے آب بقا کا جزو بھی شامل
عجب کیا ہے جو ندیوں میں تجھے سرتاج کہتے ہیں
جو کچھ تھا تجربہ ان کا ہمارا بھی ہے صاد اس پر
جو کل اسلاف کہتے تھے وہی ہم آج کہتے ہیں

تعیّن سے ترے آغاز کے ادراک قاصر ہے
ترے انجام کی مُدّت بھی مجھ کو اک معمّہ ہے
بتا اے آب رود پاک کتنی عمر ہے تیری
بساطِ دہر میں تو جاوداں یا چند روزہ ہے
نگاہوں میں کھنچا ہے تیرے عرض و طول کا نقشہ
ہزاروں میل طے کرتی ہوئی پہونچی ہے منزل پر
ترے دامن میں پھیلا تھا تمدن ہند والوں کا
پڑی تہذیب کی بنیاد تیرے پاک ساحل پر

کیا رشیوں نے ماضی میں جو روشن شعلۂ عرفاں   ترا ساحل ہی اس کو ہر طرف پہنچانے والا تھا
ہوئی سیراب کشتِ دل ترے شفاف پانی سے   ترے ساحل پہ ڈیرا مختلف قوموں نے ڈالا تھا

کہیں بھی ہو تجھے مطلب ہے اے گنگا روانی سے   پہاڑوں کی کوئی وادی ہو یا صحرا کا داماں ہو
نہیں آبادی و ویرانہ میں تمیز کچھ تجھکو   ہو کوئی شہر یا قریہ پلیٹو ہو کہ میداں ہو

تری ہم شوق[1] اک زیرِ زمیں بھی جلوہ فرما ہے   تری ہم نام اے گنگا فرازِ آسماں بھی ہے
نگاہِ دور رس سے دیکھنے والے یہ کہتے ہیں   ترا جلوہ جہاں میں آشکارا بھی نہاں بھی ہے

لکھی جائے گی تیری لوح پر تاریخ مستقبل   ترے ساحل کو ہے احوال ماضی کی خبر گنگا
کنارہ کش ہے لیکن آج تو کیوں جہد ہستی سے   ہماری بیکسی پر کیوں نہیں تیری نظر گنگا

ترے اشنان سے سنتے ہیں پھل ملتا ہے مکتی کا   ہمیں کیوں کر دیا ہے تو نے محروم نجات آخر
بتا دے کچھ سبب اس کا زبانِ حال سے ہم کو   پھری ہم سے ہے کیوں تیری نگاہِ التفات آخر

رہا دامن جو آلودہ یونہیں گردِ کثافت سے   نہ فرق آ جائے اے گنگا کہیں تیری طہارت میں
نمایاں ہم پہ غسلِ پاک کی تاثیر ہو جائے   سکون دامن کا دریا ہو پھر امواج بھارت میں

---

[1] یعنی پاتال گنگا [2] یعنی آکاش گنگا

جمنا

پربت پر سے آنے والی گنگا تٹ پر جانے والی
پریم سندیسہ لانے والی انہد[1] شبد بنانے والی
میری پیاری جمنا تو ہے

آریہ ورت کو سینچا تو نے کھینچا خلد کا نقشہ تو نے
طے کئے وادی صحرا تو نے رنگ جمایا اپنا تو نے
میری پیاری جمنا تو ہے

تیری چال بڑی مستانہ تیرے ناز ہیں معشوقانہ
ایک جہاں تیرا دیوانہ تجھ میں ہے حسن جانانہ
میری پیاری جمنا تو ہے

رن بھومی[2] میں دھوم مچائی دلی آگرہ متھرا آئی
کرشن کے راج میں دھاک جمائی برہما ورت میں شان دکھائی
میری پیاری جمنا تو ہے

جوگن کرشن کنہیا کی ہے شوخ سہیلی رادھا کی ہے
گوالن الہڑ متھرا کی ہے پاک بہن تو گنگا کی ہے
میری پیاری جمنا تو ہے

اترا کھنڈ میں تیرا گھر ہے مدت سے تو محو سفر ہے
شہروں شہروں تیرا گذر ہے منزل پر ہر وقت نظر ہے
میری پیاری جمنا تو ہے

جب تیری لہریں بل کھاتی ہیں اٹھلاتی ہیں مٹھلاتی ہیں
ساحل سے جب ٹکراتی ہیں دل کو میرے تڑپاتی ہیں
میری پیاری جمنا تو ہے

رشیوں نے دی تجھ کو فضیلت ہے پریاگ میں تیری عزت
تیرے لئے ہو باعث رحمت گنگا کا آغوش محبت
میری پیاری جمنا تو ہے

شام کا وقت ہوا اندھیرا روشنی ہو یا گھپ ہو اندھیرا
نرمل نرمل پانی تیرا دل چھینا کرتا ہے میرا
میری پیاری جمنا تو ہے

اُف ہے یہاں کیا دم خم تیرا اور ہی کچھ ہے عالم تیرا
بھرتی ہے گنگا دم تیرا پاک ہے کتنا سنگم تیرا
میری پیاری جمنا تو ہے

تیرا مخرج پاک ہمالا اونچی اونچی چوٹیوں والا
پاؤں جہاں مسکن سے نکالا میدانوں میں ڈیرا ڈالا
میری پیاری جمنا تو ہے

دل کو مست بنا جاتی ہے آگ سی ایک لگا جاتی ہے
کیفیت اک چھا جاتی ہے سامنے جب تو آجاتی ہے
میری پیاری جمنا تو ہے

[1] انہد شبد یعنی سلطان الاذکار [2] رن بھومی یعنی کورو کھشیتر کا تاریخی میدان جنگ ۔

شکوۂ مزدور

غمزدہ ہوں زار ہوں دلگیر ہوں رنجور ہوں
بیکسی قسمت میں ہے ناچار ہوں مجبور ہوں
صبح نورانی میں بھی رنگِ شبِ دیجور ہوں
دیکھتے کیا ہو مجھے حیرت سے میں مزدور ہوں
میری محنت کے پسینے کی کوئی قیمت نہیں
میں ہی وہ ہستی ہوں جس کی خاک اہمیت نہیں

خونفشانِ غم ہوں مجوزاری ہوں ازل سے ہائے ہائے
مبتلائے رنج دخواری ہوں ازل سے ہائے ہائے
ہیں رہینِ بے وقاری ہوں ازل سے ہائے ہائے
کشتۂ سرمایہ داری ہوں ازل سے ہائے ہائے
میں بناتا ہوں جنہیں مجھ کو مٹاتے ہیں وہی
میں اُٹھاتا ہوں جنہیں مجھ کو گراتے ہیں وہی

گو ہوئی دن کی مشقت سے کمر خم آہ آہ
پھر بھی اربابِ جفا کو کچھ نہیں غم آہ آہ
محنت جانکاہ پر اصرارِ پیہم آہ آہ
تنگ دل لینے نہیں دیتے ذرا دم آہ آہ
شرم گو آتی نہیں کام اس قدر لیتے ہوئے
دم نکلتا ہے مگر اُجرت مجھے دیتے ہوئے

ہے سپرد اہلِ دولت اختیار زندگی
خاک باغ دہر میں لُوٹوں بہار زندگی
چند پیسے اور یہ کُل کاروبار زندگی
اک لنگوٹی پر ہے پوشش میں مدار زندگی
کچھ بجز اُجرت نہیں مطلب مجھے انعام سے
ہے بہت یہ بھی اگر بچ جاؤں میں دشنام سے

خاک ہیں الماس و گوہر میری محنت کے بغیر
ہاتھ آسکتے ہیں کیونکر میری محنت کے بغیر

بن نہیں سکتا کوئی گھر میری محنت کے بغیر
ہیچ ہیں گو دولت و زر میری محنت کے بغیر

پھر بھی مجھ پر اہلِ سرمایہ کی بدعت ہے روا
دُور ہوگا کب الٰہی نقص یہ تہذیب کا!

دہلی۔ وطن ۳۶ ۱۹ء

قطعہ

وہ کم ہیں اپنے حق میں ہی خود بیج بدی کے بوتا ہے
انسان کے نیکی کرنے میں جو آکر حارج ہوتا ہے

کیسا ہی عالم و فاضل ہو کتنا ہی عاقل و دانا ہو
محروم ہے چشمِ باطن سے ظاہر کی بھی آنکھیں کھوتا ہے

قطعہ

ہوں آبِ دریا بھی فیض و کرم سے
غنی ہو تو ایسا سخی ہو تو ایسا

ہو خالق کو بھی ناز ہستی پہ جس کی
مُنوّر اگر آدمی ہو تو ایسا

نیل کنٹھ

نیل کنٹھ اے نیل کنٹھ اتنے دنوں سے تھے کہاں
کیا ہمالہ کی گپھاؤں میں ابھی تک تھے نہاں

ایک عرصہ سے تمہاری ہی تھی مجھ کو جستجو
ایک عرصہ سے تھی تم کو دیکھنے کی آرزو

گو خلش زا میرے دل میں آرزوئے دید تھی
آج ملنے کی نہ لیکن کوئی بھی اُمّید تھی

کس لئے اتنا گلو ہے دلربا ہے نیل فام
کیا تمہارا کوہ گوری شنکروں پر ہے قیام

لے کے شو سے زہر کا اک جام تقسیمِ ازل
پی لیا تھا تم نے کیا ہنگام تقسیم ازل

نیل کی وادی سے اُڑ کر کیا یہاں آئے ہو تم
کیا کوئی تحفہ بھی میرے واسطے لائے ہو تم

میں اگر سمجھوں تمہیں زائر تو کچھ بے جا نہیں
میں نہ تم کو گر کہوں طائر تو کچھ بے جا نہیں

صحن، گلشن میں نہیں اب خوشہ چینی کس لئے
وادیِ غربت میں یہ صحرا نشینی کس لئے

غالباً مشغول رہتے ہو ریاضت میں کہاں
اور ملتا ہے تمہیں اس طرح لطفِ جاوداں

بیٹھ کر خاموش اک نخل کہن کی شاخ پر
ڈالتے ہو کس لئے رہ رہ کے تم مجھ پر نظر

آج کل رتؔ راج[1] ہے ہندوستاں میں جلوہ گر
یہ گلِ رنگیں ہے گلزارِ جہاں میں جلوہ گر

شام کے آثار مشرق سے عیاں ہونے لگے
خیمہ زن لب پر سئیؔ[2] کے کارواں ہونے لگے

ایسے موسم میں بھی ہے شیریں نوائی سے گریز
کیوں ہو چپ آخر ہے کیوں نغمہ سرائی سے گریز

کیا مری مانند کوئی عاشق ناشاد ہو
ہجر میں کیوں قائل خاموشی فریاد ہو؟

غالباً میری طرح تم بھی جنونی ہو کوئی
عاشقِ ناکام محبوبِ حقیقی ہو کوئی

بات جو مجھ کو پسند آئی تمہیں آئی پسند
میں بھی تنہائی پسند اور تم بھی تنہائی پسند

[1] یعنی موسم بہار [2] اُناو کے قریب ایک چھوٹی سی ندی

پھول کا میں کام لیتا ہوں ہمیشہ خار سے
اُنس ہے مجھ کو بھی دشت و وادی و کہسار سے

فتنہ زار حشر ہے دنیا کی آبادی مجھے
بخش دے خالق تمہاری طرح آزادی مجھے

میں تمہارے ساتھ ہی اب کے مناؤں گا بسنت
چہچہاؤ تم ذرا پھر میں بھی گاؤں گا بسنت

لکھنئو ۱۹۱۷ء

"یہ نظم ایک قدرتی منظر دیکھ کر ۱۹۱۷ء میں دیکھ کر کہی گئی تھی۔ اناؤ سے لکھنئو تک بیل گاڑی کا سفر تھا۔ فروری کے مہینے میں بسنت کا موسم اپنے پورے شباب پر تھا۔ دوران سفر میں ایک سڑک کے کنارے ایک بے برگ و بار درخت کی چوٹی پر نیل کنٹھ دکھائی دیا جو اقعی کئی سال کے بعد نظر سے گذرا تھا۔ لکھنئو پہنچکر اسی منظر کی تصویر نظم میں کھینچی گئی۔

رُباعی

دل میں مرے یارب جو ہو مسکن تیرا
آنکھوں میں بھی ہو جلوۂ روشن تیرا

غافل نہ رہوں یاد سے دم بھر تیری
چھوٹے نہ کبھی ہاتھ سے دامن تیرا

دو بھائی

خالق نگاہِ بد سے ان کو بچائے رکھے — فرزند ہیں وطن کے یہ خوش نصیب دونوں

دل میں ہے درد قومی سودائے ملک سر میں — اس کے رفیق دونوں اس کے حبیب دونوں

سرمایۂ قناعت گنجینۂ طرب ہے — دل ہے امیر ان کا گو ہیں غریب دونوں

اب تک سپہر واژوں پیچھے پڑا ہوا ہے — مدت سے ہیں شکارِ رشکِ رقیب دونوں

ہوں کامراں نہ آخر کیوں محفلِ سخن میں

ہیں لاجواب بھائی اَمن[1] و ادیب[2] دونوں

[1] منشی گوپی ناتھ اَمن لکھنوی اسسٹنٹ ایڈیٹر "تیج" دہلی

[2] مسٹر گور سرن لال ادیب ایم، اے۔ لکھنوی

شبِ آخر کی موسیقی

مزہ دیتی ہیں کیسا اے منوّر آخر شب میں — فلک پیما الاپیں مارواڑی نازنینوں کی
جہاں برسات کے موسم میں بادل گھر کے آتے ہیں — اُمڈ پڑتی ہے نغمہ بن کے مستی ان حسینوں کی

اسی جانب پہونچ جاتا ہے کھنچ کر سازِ دل میرا — یکایک جس طرف اپنے گلے کو موڑ دیتی ہیں
نکل جاتی ہے اپنے جسم سے روحِ رواں گویا — غضب ڈھاتی ہیں جب یہ تان اپنی توڑ دیتی ہیں

نہیں اعجاز گستر یہ صدائے نازنیں ان کی — فضا میں مائل پرواز ہے حُسنِ حسیں ان کا
گلے میں موہنی ہے کس قدر تانیں سُریلی ہیں — سراپا ساز ہے ہر نغمۂ سحر آفریں ان کا

گھٹائیں ساتھ ہی دیتی نہیں ان کے ترنّم کا — جہاں رنگ و بو میں ورنہ اک سیلاب آ جاتا
ٹپکتے پھول بن کر جب زمیں پر گرم گرم آنسو — کنارِ شمع میں پروانۂ بیتاب آ جاتا

کلیجا ہو رہا ہے ٹکڑے ٹکڑے سننے والوں کا — نہاں پردے میں یہ اپنے سنان و تیر رکھتے ہیں
ستارے بھر رہے ہیں سسکیاں روئے قمر فق ہے — یہ نغمے نالۂ شبگیر کی تاثیر رکھتے ہیں

جہانِ خواب میں بھی کام کر جاتا ہے سوز ان کا — بھڑک اُٹھتی ہے شعلہ بن کے خاموشی چراغوں کی
جھپک جاتی ہیں پھر کھُلتی ہیں جب جھکی ہوئی آنکھیں — نظر گم ہو رہی ہے روشنی میں دل کے داغوں کی

برہ کے گیت گا اٹھتی ہو جب فرقت زدہ کوئی
ہم اس کو اصطلاحِ اہلِ دل میں آگ کہتے ہیں
بنا دیتا ہے شادیِ مرگ ہم کو سوزِ پنہاں سے
ہے نغمہ نام جس کا لوگ جس کو راگ کہتے ہیں

کیا ہے اپنے اپنے دیوتا کا دل میں آواہن
تلاطم خیزیِ دریا ہے جذباتِ نہانی میں
ہجومِ شوق میں گھر سے قدم اٹھنے ہی والے ہیں
بجھے گی آگ ان نغموں کی اب جمنا کے پانی میں

دہلی۔ سنہ ۱۹۳۹ء

قطعہ

رہروِ راہِ عشق ہوں حُسنِ ازل کی ہے تلاش
فکرِ نجات کیا کروں شوقِ نجات ہی نہیں
عشق بقائے روح ہے عشق غذائے روح ہے
یہ جو نہیں تو دہر میں لطفِ حیات ہی نہیں
کیسے بتاؤں ہمدمو عشق و فنا کی لذّتیں
چُپ نہ رہوں تو کیا کروں کہنے کی بات ہی نہیں

برہمچرج

تباہ کس لئے آئیں نظر نہ اہلِ وطن
بدل گئے ہیں جہالت سے مرد و زن کے چلن

نہیں نگاہ میں بچتے ذرا اصولِ کہن
عمل میں آج نہیں برہمچرج کا سا دھن[1]

ہے زندگی تو مگر زندگی کی شان نہیں
جوان آج جوانی میں بھی جوان نہیں

ہوئے ہیں ضعف سے شل اپنے بازوئے ہمت
شگفتگیٔ گلِ رخسار سے ہوئی رخصت

نہ روح میں ہے لطافت نہ جسم میں طاقت
نہ ہے مسرّت دینی نہ دنیوی راحت

ہو قحط آب تو سرسبز باغ کیونکر ہو
نہ ہو جو تیل تو روشن چراغ کیونکر ہو

ہوا ہے جب سے نظامِ حیات قوم شکست
وہ چار آشرموں کا کہاں ہے بندوبست

زوالِ عقل سے معیارِ زندگی ہے پست
حواس پر نہیں قدرت بنے ہیں نفس پرست

کبھی جو کرشن کے بندے تھے رام کے پیرو
وہ ہو گئے ہیں جہالت سے کام[2] کے پیرو

ملے نہ تربیت نفس کی اگر تعلیم
نہ ہو جو ذہن نشیں برہمچرج کی تکریم

نہ زندگی کی جو آغاز ہی سے ہو تنظیم
نہ چار آشرموں میں ہو جو اس کی ہو تقسیم

محال ہے کہ کوئی لکشمن جتی نکلے
شجاع بھیم سا بجرنگ سا بلی نکلے

---

[1] سادہن یعنی عمل [2] لذات شہوانی

جو برہمچرج کا سادھن عمل میں لائیں ہم
کمر ہلال کی صورت نہ پھر جھکائیں ہم
کرن کا زور بتاما کا بل دکھائیں ہم
مقابلہ پہ غنیموں کے فتح پائیں ہم

جہاں میں دھاک جمے قوم کے دلیروں کی
نگاہِ قہر سے ہو روح قبض شیروں کی

ہماری سمت کوئی آنکھ تک اٹھا نہ سکے
چراغِ عقل کو بادِ ہوس بجھا نہ سکے
اٹھیں ہم ایسے کہ گردوں بھی پھر بٹھا نہ سکے
ہمارے سامنے پیکِ اجل بھی نہ آ سکے

وہ دل سے جوہرِ تسخیر آشکارا ہو
بپا ہو قہر جدھر آنکھ کا اشارا ہو

یہ ہے ذریعۂ تاب و توانِ جسمانی
یہ ہے وسیلۂ لطف و سرورِ روحانی
یہی ہے زینۂ بامِ وصالِ یزدانی
اصول اور نہیں اس اصول کا ثانی

خوشی سے چین سے جینے کی ہم کو آس نہیں
جو برہمچرج نہیں ہے تو کچھ بھی پاس نہیں

جو ہے خیال کہ پھولے پھلے وطن اپنا
جو چاہتے ہیں کہ شاداب ہو چمن اپنا
بنائیں طرزِ عمل نیک مرد و زن اپنا
کہ وجہ رشک زمانے میں ہو چلن اپنا

ہو برہمچرج سے اک تیج ایک بل پیدا
کہ سورما ہوں کرن ایسے آج کل پیدا

سکون دل کو میسر ہو کاہشیں گھٹ جائیں
مقابلہ پہ غنیم آ کے خود بخود ہٹ جائیں
جو بدلیاں غم و آلام کی ہوں سب چھٹ جائیں
جو بیڑیاں ہیں غلامی کی پاؤں میں کٹ جائیں

بدن پہ گرمی و سردی کا کچھ اثر ہی نہ ہو
ہوائے نفس کا دل میں کبھی گذر ہی نہ ہو

ہو برہمچرج تو روشن ضمیر پیدا ہوں　　ہوں دھرم ویر عیاں کرم ویر پیدا ہوں
وشسٹ و ویاس سے کامل فقیر پیدا ہوں　　شجاع ہند میں پھر بے نظیر پیدا ہوں

مقابلہ پہ جو آئے وہ زک اٹھا کے رہے
جسے ہو فتح کا دعویٰ شکست کھا کے رہے

یہ نسل عہدِ رواں اور یہ تنِ لاغر　　رگوں میں خون نہیں ہے جھکی ہوئی ہے کمر
بدن میں کس نہ ہے باقی نہ آب چہرے پر　　کسی کو دل کی نقاہت کسی کو ضعفِ جگر

لگا اسی سے جبیں پر کلنک کا ٹیکا
یہی ہے صرف سبب ملک کی تباہی کا

ہو اس عمل کی جو تعلیم ملک میں جاری　　ہر ایک قسم کی ہو جائے دور بیماری
اسی عمل سے مرادیں بر آئیں گی ساری　　نجات قوم کی ہوگی اسی سے تیاری

اسی سے ملک میں دورِ نشاط آئیگا
یہی ہمیں رُخ عیش و طرب دکھائیگا

رُباعی

جب خار ہوس دل سے نکل جاتا ہے　　سر سے دُنیا کا جب خلل جاتا ہے
فطرت معصومیت میں ہوتی ہے شریک　　انساں کا خمیر ہی بدل جاتا ہے

کُوچ

اے مرغِ رُوح اب پرِ پرواز تول دے
اپنی قبائے زیست کا ہر بند کھول دے

کہہ دے تعلقات کی دُنیا کو الوداع
احباب و دوست دار و اعزا کو الوداع

مُنھ اپنا دوستوں سے عزیزوں سے موڑ لے
آرام اور عیش کی چیزوں سے موڑ لے

کیسا ہی کوئی جان سے پیارا نظر میں ہو
حائل نہ آ کے تیرے سکونِ سفر میں ہو

اُلجھے ہوئے نفس کا ہر اک تار ٹوٹ جائے
اس عارضی وجود کی دیوار ٹوٹ جائے

قایم نہ رکھ مصیبت و راحت کا سلسلہ
ہو منقطع مُحبّت و نفرت کا سلسلہ

شانِ نزول

ہے یہ وہ جہاں جہاں سے شکلیں — وابستۂ نام ہو رہی ہیں
بے پردۂ عرش و فرش رہ کر — محجوب مقام ہو رہی ہیں
آنکھیں وہ جو بے خمار سی تھیں — اب بادہ بجام ہو رہی ہیں
جتنی بھی خموشیاں تھیں لب پر — مائل بکلام ہو رہی ہیں
وحدت کی ادائیں تھیں جو مخصوص — کثرت میں وہ عام ہو رہی ہیں
مُرغ آزاد کی نگاہیں — خود حلقۂ دام ہو رہی ہیں
ٹپکیں نہ قدم سے لغزشیں کیوں — مجبورِ خرام ہو رہی ہیں
قربان میں لامکانیوں کے — صرفِ در و بام ہو رہی ہیں

اُف رے آزادیاں کسی کی
اپنی ہی غلام ہو رہی ہیں

رُباعیاتِ بہار

اندازِ ستم میں آفتِ جان نکلا
ظالم بخیالِ خونِ ارمان نکلا
آنِ واحد میں گُل کھلائے لاکھوں
جب بن کے بہار حُسنِ عُریاں نکلا

آنکھیں جھپکا کے مُسکرانے والے
مستی برسا کے لڑکھڑانے والے
ہاں مجھ پہ سنبھل کے ڈال جادو اپنا
ہیں میرے قدم بھی ڈگمگانے والے

اے دعوتِ کیفِ حال دینے والے
دل کے ارماں نکال دینے والے
دیکھوں میں بھی کہ سحر کیا کرتے ہیں
آنکھیں آنکھوں میں ڈال دینے والے

دریا میں ہیجانہ کیوں تلاطم ہو جائے
موجوں میں بہم نہ کیوں تصادم ہو جائے
دل کے ارماں تڑپ نہ اُٹھیں کیسے
جب کوئی کہیں محوِ تبسّم ہو جائے

مُرجھائے ہوئے پھول مہک اُٹھتے ہیں
انگارے بجھے ہوئے دہک اُٹھتے ہیں
حرکت میں جمادات کو لاتی ہے بہار
مُرغانِ زباں بند چہک اُٹھتے ہیں

سُرخی یہ لبِ خموش پر ہے کس کے
پھولوں کی کماں یہ دوش پر ہے کس کے
حُسنِ عریاں میں بجلیاں سی بھر کر
حملہ یہ جہانِ ہوش پر ہے کس کے

خوشنما دُنیا میں وہ حاجت روا مینار ہیں

روشنی سے جن کی ملّاحوں کے بیڑے پار ہیں

کرشن کا مقام

ہے نظر دید سے اندازہ سے قاصر ادراک
کیا کہیں کتنی بلندی پہ مقام آپ کا ہے

پرم آنند کی لذّت نہ ہو کیسے حاصل
کہ نہاں خانۂ باطن میں قیام آپ کا ہے

دھیان سے آپ کے ہوتی ہے خوشی وقت سحر
کیرتن باعث راحت دمِ شام آپ کا ہے

کرم خاص کا بھگتوں کو میسر ہے شرف
فیض ہر چند کہ آفاق میں عام آپ کا ہے

دل آگاہ نہیں اس کی فنا کا قائل
سربسر زندہ جاوید کلام آپ کا ہے

نہ رہے کرم سے غافل ہے یہ انسان کا فرض
پھل کریں کام کی تجویز یہ کام آپ کا ہے

آپ کی خاکِ قدم کے مہ و خور ہیں ذرّے
جلوہ گر نور ہے جتنا بھی تمام آپ کا ہے

ہے اک اک حرف میں سرمایۂ تسکیں پنہاں
پاک تردید کی بانی سے بھی نام آپ کا ہے

لاکھ دنیا میں کوئی خود کو شہنشاہ کہے
اک منوّر کی نگاہوں میں غلام آپ کا ہے

دہلی - ۱۹۳۳ء

فریادِ جنوں

اے نے نواز جلوہ گرِ بزمِ لامکاں — میں تشنہ کام شربتِ دیدار پاک ہوں
پھر جوئے شیر پہلوئے جمنا میں ہو رواں — اک مبتلائے جوشِ جنوں سر بہ خاک ہوں

آتی ہے تا گوش کہیں سے صدائے نے — یعنی صدائے خلق کا مجموعۂ لطیف
غنچہ کشائے روح ہیں یہ نغمہ ہائے نے — ہے مشکریزان کا ہر اک موجۂ لطیف

پہلوئے دل میں جلوہ گہِ نازِ حُسن ہے — محوِ ضیا کشی رخِ تابناک ہوں
تکمیل شوق پردہ درِ رازِ حُسن ہے — جذبِ نہاں عیاں ہو جو میں سینہ چاک ہوں

مدّت سے کھینچتا ہوں میں آبِ حیاتِ روح — اک لذّت آشنائے سرورِ بقا ہوں میں
سیراب مجھ سے ہے چمنِ کائناتِ روح — وجہ شگوفہ کاری بادِ صبا ہوں میں

تیرے ہی دستِ پاک میں ہے آبروئے شوق — نظّارہ بازِ جلوہ گہِ تابناک ہوں
پھر جوش پر ہے آج روانی جوئے شوق — دامن بدستِ غسلِ دوامی سے پاک ہوں

لکھنؤ۔ ۱۸ ۱۹ء

بھگوت گیتا کی روح

جب خاصہ یہی ہے روزِ ازل سے اس کا
پھر انقلابِ دوراں محسوس کس لئے ہو

آزادئ دوامی جس کا ہو جزوِ فطرت
وہ قیدِ نیک و بد میں محبوس کس لئے ہو

دنیا کی لذّتوں کا انجام بددلی ہے
دنیا کی لذّتوں سے مانوس کس لئے ہو

جنبش تو ہے قدم میں لیکن ہے چال اُلٹی
ہوتا جو ہے ترقی معکوس کس لئے ہو

گیتا سے کھل چکی ہیں آنکھیں اگر منوّر
اُمّیدوار کیوں ہو مایوس کس لئے ہو

دہلی- ۱۹۳۸ء

بھگوان رام کی عظمت

بے خودی میں رات دن رہ کر ہم آوازِ نفس ہو گیا ہوں قائل نیرنگ اعجازِ نفس
آشکارا ہو گئی اہمیت رازِ نفس پردۂ رازِ ازل ہے پردۂ سازِ نفس
دیدۂ بینا کمالِ آرزو نے وا کئے
جو تماشا ہو گیا پیشِ نظر دیکھا کئے

کتنے نظارے نہ جانے ہو چکے پیشِ نظر اک نئے پردے پہ ہے اب حُسنِ دلکش جلوہ گر
جب نظر پڑتی ہے اس دنیائے پُرتنویر پر کیا کہوں ہوتا ہے میرے قلب پر کیسا اثر
کچھ ہنسی آتی ہے، کچھ بہتے ہیں آنسو آنکھ سے
پریم کے ہر دم رواں رہتے ہیں آنسو آنکھ سے

کون لے آیا ہے بزمِ نازِ قدرت میں مجھے عالمِ وحدت نظر آتا ہے کثرت میں مجھے
لطف روحانی ہوا حاصل حقیقت میں مجھے تھا کمالِ مشق پے در پے محبت میں مجھے
بزمِ فطرت میں مرا دل مائلِ تمیز تھا
جو مجھے جلوہ نظر آیا وہ کوئی چیز تھا

چرخِ نیلی سے اُتر آیا زمیں پر آفتاب خود بخود حُسنِ نگاریں ہو رہا ہے بے نقاب
دیکھنا نظارہ بازوں کی یہ شانِ انتخاب آج تک دنیا نہ پیدا کر سکی جس کا جواب
آہ یہ شانِ جمالی ہے فقط شایانِ ہند
دیکھ لے دنیا تماشائے نگارستانِ ہند

سرزمینِ ہند ہے میری نظر میں سرفراز　　اپنی تہذیبِ گذشتہ پر بجا ہے اس کو ناز
آشکار اس میں قدرت نے کئے خود اپنے راز　　آئینہ اس میں حقیقت ہے بعنوانِ مجاز

آبرو اس نے بڑھائی ہے دیارِ غیر کی
تابشیں اس میں بھری ہیں آستانِ دیر کی

اے مقدّس ہند اے بھارت کی پیاری سرزمیں　　ہے دلاویزی میں تو غیرت دہِ خلدِ بریں
محوِ تسخیرِ جہاں ہے تیری خاکِ دلنشیں　　آہ تجھ پر آفریں صد آفریں صد آفریں

ایک دنیا دیکھ کر اعجاز اس کا دنگ ہے
خاک تیری کیا ہے گویا پردۂ نیرنگ ہے

کون کہتا ہے سنگھالوجی ہیں ذکرِ پاکِ رام　　آج تک ہے جن کی عظمت کا ہر اک دل میں قیام
تذکرہ جن کا رہا کرتا ہے گھر گھر صبح و شام　　کارنامے جن کے ہیں وردِ زبانِ خاص و عام

جب زمانے میں دکھائی حسنِ لاثانی کی شان
آئینہ کر دی ادائے فرضِ انسانی کی شان

اے منوّرؔ شغل تیرا رام ہی کی یاد ہو　　نورِ مطلق سے ترا ایوانِ دل آباد ہو
فیض یاب رام تیری خاطرِ ناشاد ہو　　رنجِ دنیا سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو

رام کے زرّیں اصولوں پر جو عامل ہو گیا
آدمی دنیا میں وہ انسانِ کامل ہو گیا

لکھنؤ ۱۹۱۸ء

گرونانک

قالب میں ترے نورِ ازل جلوہ نما تھا
انسان تھا ظاہر میں تو باطن میں خدا تھا

قسمت میں تری وصلِ دوامی کا مزا تھا
تھا تجھ سے نہ حق دور نہ تو حق سے جدا تھا

اللہ رے کس شان کا صوفی تھا گدا تھا
شاہوں سے بھی پایہ ترا افضل تھا سوا تھا

تو اپنے زمانے کا تھا اک عارفِ کامل
تجھ سا نہ کوئی مستِ مئے فقر و فنا تھا

دل تھا کہ تجلی گہِ عرفانِ حقیقت
سینہ تھا کہ آئینہ صدق و صفا تھا

کیوں ہادیٔ اعظم نہ تجھے ہم کہیں آخر
گم ہو کے رہِ عشق میں خود راہنما تھا

نانک کے لقب سے ہوئی حاصل تجھے شہرت
جلوہ پہ نرنکار[1] کے تو دل سے فدا تھا

فرصت کبھی ملتی ہی نہ تھی یادِ خدا سے
ہر وقت تجھے مشغلۂ حمد و ثنا تھا

توحید پرستی کا دیا درس جہاں کو
تو دل بہ خدا آگہِ اسرارِ بقا تھا

دنیا ہے ترے نورِ ہدایت سے منوّر
کیا مرتبہ عرفاں میں ترا اصلِ علیٰ تھا

[1] نرنکار یعنی جس کی کچھ شکل و صورت نہ ہو۔

ایک نیا پیغام

بانیٔ اسلام اے خورشید تابانِ عرب — اے محمد مصطفےٰ جانِ عرب شانِ عرب
ظلِّ اقدس میں پھلا پھولا گلستانِ عرب — جگمگایا نورِ وحدت سے بیابانِ عرب

آپ کے پیغام کی بنیاد تھی الہام پر
اک نئی دنیا بسا ڈالی خدا کے نام پر

اپنے مسلک کے محافظ اپنی اُمت کے کفیل — سینۂ شفاف کی خاک مدینہ ہے دلیل
آپ نے کر دی نجات روح کی پیدا سبیل — حشر میں اہلِ صفا کے آپ ہی ہونگے وکیل

لاکھ کعبے ضوفشاں تھے دیدۂ پرنور میں
روشنی پیدا نہ تھی ایسی چراغِ طور میں

آپ پر نازل خدائے پاک نے قرآن کیا — سرمۂ توحید سے وا دیدۂ عرفاں کیا
آشکارا زندگی کا جوہر پنہاں کیا — پیکر اقدس کو رشک کعبۂ ایماں کیا

جو نہ سمجھیں آپ کا رتبہ وہ اہلِ دل نہیں
اور کوئی جادۂ تسلیم کی منزل نہیں

دانہ ہے چشمِ ضمیر اب تک نہ صاحب دل ہوں میں — دور ہے کوسوں جو بیداری سے وہ غافل ہوں میں
ناشناس رازِ پنہانِ حق و باطل ہوں میں — کیسے پھر اسلام کی تفہیم کے قابل ہوں میں

گو مسلماں میں نہیں پر قائلِ اسلام ہوں
کیونکہ مردانِ خدا کا بندۂ بے دام ہوں

بانیٔ اسلام! خونِ اسلام کا ہوتا ہے آج
خندہ زن حالت پہ دینِ پاک کی دنیا ہے آج
پھر دلوں میں گمرہی کی کیفیت پیدا ہے آج
راز داں اسلام کا اسلام میں عنقا ہے آج

بے خبر قرآں کے معنیٰ سے کچھ میں ہی نہیں
عظمتِ اسلام سے واقف مسلماں بھی نہیں

جانتے ہیں راز مردانِ خدا اسلام کا
ہیں سمجھتے مرتبہ اہلِ صفا اسلام کا
ہے فقط عشقِ الٰہی مدعا اسلام کا
اور کچھ مقصد نہیں اس کے سوا اسلام کا

ہو بنا نفرت پہ جس کی یہ وہ مذہب ہی نہیں
دوسروں سے ترکِ الفت اس کا مطلب ہی نہیں

سرزنش کافر کی اور اسلام، ناممکن ہے یہ
ہو دل آزاری سے اس کو کام، ناممکن ہے یہ
دے کسی کو موت کا پیغام، ناممکن ہے یہ
ہاتھ میں لے تیغ خوں آشام، ناممکن ہے یہ

اور جو کرتے ہیں ایسا آڑ میں اسلام کی
دھجیاں اڑتی ہیں ان کے جامہ احرام کی

مذہبی دیوانگی اسلام کا عنصر نہیں
عقل پر صیقل یہ کرتا ہے جنوں پرور نہیں
قلب کے جذبات حیوانی کا یہ مظہر نہیں
نفس کے افعالِ شیطانی کا یہ مصدر نہیں

اور جو قائل ہے اس کا وہ مسلماں ہی نہیں
بندہ اسلام ہو کیسے جو انساں ہی نہیں

خون کافر پر نہیں حصر و قیام اسلام کا
اس سے مستحکم نہیں ہرگز نظام اسلام کا
حبِّ عالمگیر سے چمکا ہے نام اسلام کا
ورنہ میں کرتا نہ ہرگز احترام اسلام کا

وید میں تعلیم جو کچھ ہے وہی قرآں میں ہے
نقص اگر کچھ ہے تو فہم و دانش انساں میں ہے

کھیل کیوں سمجھا ہے اک اہلِ شریعت نے لسے — طاق پر رکھا ہے کیوں اہلِ عبادت نے اسے
کر لیا قبضے میں ارکانِ حکومت نے اسے — کر دیا بد نام اربابِ سیاست نے اسے

جس کا بانی آپ سا ہادی ہے یہ وہ دین ہو
اس کی پابندی نہ کرنا آپ کی توہین ہو

کیوں ہیں تاویلیں یہ اُلٹی آپ کے احکام کی — صبح نورانی میں کیوں شامل ہو ظلمت شام کی
پھر ہو عظمت آشکارا آپ کے پیغام کی — لیجئے آکر خبر پھر عالمِ اسلام کی

نام پر مذہب کے ظلم و جور کی بدعت نہو
راہ سے بے راہ یعنی آپ کی اُمّت نہو

رُباعی

ٹھوکر کیسی یہ نفس کی کھا کے گرا — قعرِ تاریک میں جو دُنیا کے گرا
جُز رحمتِ حق اسے اُٹھائے گا کون — دیکھو تو مُنوّر کو کہاں جا کے گرا

خدائے حُسن کرشن

مخزنِ حُسن ہے تو حُسن ہے پیدا تجھ سے
ہے شب و روز رواں حُسن کا دریا تجھ سے

فطرتِ حُسن ہے تو حُسن ہے فطرت تیری
قلزم حسن میں ہے غرق حقیقت تیری

حسن اول ہے ترا حُسن ہے آخر تیرا
حسن باطن ہے ترا حسن ہے ظاہر تیرا

طالب حسن ہے تو حُسن ہے طالب تیرا
قالب حسن ہے تو حسن ہے قالب تیرا

حُسن آئینہ ترا اور تو آئینۂ حُسن
لٹ رہا ہے ترے دربار سے گنجینۂ حُسن

تیرے الطاف و عنایات کا قائل ہوں میں
اک ترے حُسن کے دربار کا سائل ہوں میں

حیرت انگیز کشش بیز ہے تیری ہستی
کس قدر آہ دل آویز ہے تیری ہستی

معجزہ حسن دلآرا کا ہویدا کر دے
حرکت کالعدم عشق میں پیدا کر دے

آنکھیں بہ جائیں تری چاہ میں جمنا ہو کر
روح مضطر ہو ترے شوق میں رادھا ہو کر

بے خودی اتنی بڑھے، دشتِ جنوں میں کھو جائیں
پتلیاں دیدۂ مہجور کی گوپی ہو جائیں

ہو عطا حسن ترنم مرے کانوں کے لئے
ہمہ تن گوش ہوں بنسی کے ترانوں کے لئے

لے اُڑیں صبر مرے دل سے ادائیں تیری
ہاتھ بیتاب ہوں لینے کو بلائیں تیری

تجھ سے سرمایہ الطاف و کرم لینے کو
سینہ آئینہ بنے عکس قدم لینے کو

لب تقریر کو لگ جائے ترے نام کی رٹ
سرِ ناچیز ہو یہ اور ترے در کی چوکھٹ

ایسا ہو جائے مرے پاؤں میں چکر پیدا
جاؤں جس سمت ترے حُسن کا دیکھوں جلوا

جو سزاوار ترے فیض قدم کا ہو جائے
جسم کا جسم یہ اک پیڑ کدم کا ہو جائے

اکرشن لے کرشن ہے تو شاہد رنگیں میرا — نظر آجائے مجھے بھی کہیں جلوہ ترا
اکرشن ہے نام ترا ۔ کام ترا آکرشن[۱] — کھینچ لے اپنی طرف دے مجھے اپنے درشن
کھینچ لے اپنی طرف کھینچنے والا ہے تو — کشش قلب میں لاثانی دیکھتا ہے تو

نام کا پاس ہو کچھ، نام کی تاثیر دکھا
کھینچ کر اپنی طرف جوہر تسخیر دکھا

[۱] آکرشن یعنی کشش ۔

دہلی ۔ مطبوعہ تیج

رُباعی

جب کام سے دُنیا کے بیزار ہوتا ہوں — اُلجھن ہوتی ہے سخت گھبراتا ہوں
اُس وقت کی ہوتی ہے تھکاوٹ بھی عجیب — کرتے ہی میں بند آنکھ سو جاتا ہوں

دسہرہ

سنبھل کے دستِ تعدّی کوئی دراز کرے
مآلِ جور و ستم ہولناک ہوتا ہے
سبق ملا ہے یہ ہم کو جنابِ راون سے
خود اپنے ظلم سے ظالم ہلاک ہوتا ہے

ہمیشہ مرد خود بیں دہر میں ناکام ہوتا ہے
ضرور اک روز وہ شرمندہ انجام ہوتا ہے
جہاں راون صفت کرتا ہے کوئی ظلم بجیں پر
فنا کو اس کی پیدا کوئی رشکل رام ہوتا ہے

دسہرہ یادگارِ راستی و حق پسندی ہے
دسہرہ شاہدِ اعزاز و فخر سربلندی ہے
دسہرہ نقش باقی بن کے جنگِ رام و راون کا
دلیلِ کامرانی ہے نشانِ فتحمندی ہے

لکھنؤ - ۱۹۳۴ء

شیرِ خُدا رضؓ

یارب مرے کلام میں لطفِ زباں کہاں　　جو تجھ کو ہو قبول وہ طرزِ بیاں کہاں
دریا کی طرح اپنی طبیعت رواں کہاں　　اتنا بلند میں صفت آسماں کہاں
توصیف رازدانِ خفی و جلی کروں
یعنی بیان شانِ جنابِ علیؓ کروں

میں گمرہ مجازؔ، حقیقت شناس آپ　　میں معصیت نہاد تقدس اساس آپ
عُریاں مری نگاہ، صداقت لباس آپ　　میں دور اور خالقِ دوراں کے پاس آپ
پستی ادھر حضیض کی ناچیز خاک میں
قطب فلک کا اوج اُدھر ذات پاک میں

ہر وقت دل کو یادِ الٰہی سے کام تھا　　ہر موئے تن کو شغل درود و سلام تھا
کعبہ تمام پیکرِ عرفاں مقام تھا　　آیا جو لب پہ حرف وہ مالک کا نام تھا
شاہد ہر ایک وحی تھی شانِ نزول کی
قالب میں روح پاک تھی گویا رسولؐ کی

ایسا مُطیع اہلِ کلام اور کون تھا　　ایسا شہِ عربؐ کا غلام اور کون تھا
فرشِ زمیں پہ عرش مقام اور کون تھا　　تسبیح مصطفےٰ کا امام اور کون تھا
پیدا دلاوری سے تھی صدق و صفا کی شان
شیرِ خدا کی شان تھی شیرِ خدا کی شان

کیا عجز کو شیاں تھیں عبادت کی راہ میں　　تھا فرشِ خاک تختِ خلافت نگاہ میں
ایماں کا جوش بھر کے قلوب سپاہ میں　　جب تیغ بے نیام ہوئی رزمگاہ میں
شورِ عدو کو شیون خاموش کر دیا
ہستی کو نیستی سے ہم آغوش کر دیا

جب دشنۂ الم سے جگر ریش ہو گیا　　جب معرکہ کہیں کوئی درپیش ہو گیا
مسلک تھا جس کا فقر فنا کیش ہو گیا　　جنگی لباس جامۂ درویش ہو گیا
دے دے کے بندگانِ الٰہی کے واسطے
کھولا درِ نجات سپاہی کے واسطے

میں کیا بتاؤں حیدرِ کرار رضؓ کا مقام　　کرتے ہیں آسماں پہ فرشتے بھی احترام
وصفِ علی پاک سے ہوں خاک سیر کام　　تنگی وقت میں نہیں حاصل حظِ کلام
پھر بھی نہ اس بیان سے کیوں کامگار ہوں
ہر بندۂ خدا کا عقیدت گذار ہوں

دہلی - ۱۹۳۹ء

شواجی کی شانِ نزول

روندتا زیرِ قدم جوش میں دشت و کہسار | سہل کرتا ہوا تیزی سے منازل دشوار
نیزہ در تیغ بدست، اشہب جولاں پہ سوار | مرہٹہ دیش کا آتا ہے بہادر سردار

حوصلے رُخ سے عیاں شیرِ نیستاں کی طرح
ولولے دل میں ہیں اُمڈے ہوئے طوفاں کی طرح

تن پہ ملبوس فقیروں کی طرح سادہ ہے | ورنہ دل بولتا ہے یہ کوئی شہزادہ ہے
دستگیری کو جو مظلوم کی آمادہ ہے | خاص درگاہِ آلہیٰ کا فرستادہ ہے

دولت امن و اماں ہم کو ملے گی اِس سے
ظُلم کے راج کی بنیاد ہلے گی اِس سے

اوجِ اقبال غلامی کے لئے حاضر ہے | شانِ اجلال غلامی کے لئے حاضر ہے
دولت و مال غلامی کے لئے حاضر ہے | ہر قوی بال غلامی کے لئے حاضر ہے

ہیچ ہے اس کے لئے بالِ ہما کا سایہ
اس کی تقدیر میں ہے خاص خدا کا سایہ

جنگِ اعظم[1] میں جو موجود تھا ارجن بن کر | کوروؤں پر جسے حاصل ہوئی آخر کو ظفر
اب اسی نور کا ہے یہ تنِ اقدس مظہر | دھرم کے نام پہ مرنے کو جو ہے سینہ سپر

قرۃ العین و جگر بند شہاجی ہے یہی
دیش کا چھتر پتی دیر شواجی ہے یہی

---

[1] جنگِ اعظم یعنی مہابھارت

ہم اُسے فخرِ دلیرانِ زمن کہتے ہیں　　　باعثِ عزّت و ناموس وطن کہتے ہیں
اہلِ فن تیغ فگن قلعہ شکن کہتے ہیں　　　ہے بجا اس کو اگر شیرِ دکن کہتے ہیں

وار جس نے بھی کیا اُس کو جھپٹ کر مارا
سامنے آ کے کبھی پیچھے پلٹ کر مارا

رعب بیٹھا ہے دلیرانِ زماں پر اس کا　　　خندہ زن بخت عدو پر ہے مُقدّر اس کا
ایک طوفانِ قیامت ہے کہ لشکر اِس کا　　　آئینہ جنگ کے میداں میں ہے جوہر اِس کا

ہاتھ اُٹھتا نہیں بھولے سے بھی معصوموں پر
کبھی مرتا ہے تو مرتا ہے یہ مظلوموں پر

جس نے مُردوں کو جلایا ہے یہی ویر ہے وہ　　　جس نے بگڑوں کو بنایا ہے یہی ویر ہے وہ
جس نے گرتوں کو اُٹھایا ہے یہی ویر ہے وہ　　　جس نے سوتوں کو جگایا ہے یہی ویر ہے وہ

ہاتھ آ جائے گا کھویا ہوا پھر راج اپنا
کیوں نہ تسلیم کریں ہم اسے سرتاج اپنا

کلکِ شاعر میں جو شمشیر کا دم ہو تو لکھے　　　سُرخیٔ خوں سے اگر شوق رقم ہو تو لکھے
رامداس ایسے گُرو کا جو کرم ہو تو لکھے　　　وصف اس کے کوئی بھوشن کا قلم ہو تو لکھے

خامہ اب نذرِ عقیدت کے لئے رُکتا ہے
مرہٹہ ویر کی تعظیم کو سر جھکتا ہے

لے سمرتھ گوسائیں سری سوامی رام داس مہاراج شواجی کے گرو تھے

لے شاعر رزم مہاکوی بھوشن مہاراج شواجی کے درباری شاعر تھے

جنیندر جنم

جین دھرم کے بانیٔ اعظم تیرتھنکر مہاویر سوامی کے جنم دن پر

ہر در و دیوار سے پیدا غضب کا نور ہے ۔ مرکز عیش و مسرت آج کنڈل پور ہے
ہو گیا ہے کامرانِ حسنِ عمل سدھارتھ کا ۔ خوبیٔ قسمت کا شاہد ہے محل سدھارتھ کا
رنگ پر آیا کارنی رانی کا نکھرا اور بھی ۔ ہو گئے سامانِ لطفِ زیست پیدا اور بھی
ہو گئی تبدیل دنیا انقلاب آ ہی گیا ۔ چرخ پر برجِ حمل میں آفتاب آ ہی گیا
ہو گیا قائل زمانہ خواب کی تعبیر کا ۔ بیکسوں کی آہ نے پایا شرف تاثیر کا
رُدر کے ترشول کو امکانِ جنبش اب نہیں ۔ خنجرِ خونبار میں رازِ پرستش اب نہیں
ہو گئے گم جاودانیت میں خوں بہنے کے دن ۔ انقلابِ نو سے یہ باقی نہیں رہنے کے دن
ختم پر ہے پستی ادراکِ انسانی کا دور ۔ منقلب ہوتا ہے جانداروں کی قربانی کا دور
خوبیاں رحم و کرم کی ہو رہی ہیں آشکار ۔ ہو نہیں سکتا اب انساں کا درندوں میں شمار
خوں رُلائے گا نہ اب جذباتِ حیوانی کا رنگ ۔ اب نہ جھلکے گا زمیں پر خونِ قربانی کا رنگ
دیوتا جو خون کے پیاسے تھے غائب ہو گئے ۔ ہو گئے کافور روحانی معائب ہو گئے
دامنِ اخلاق سے گردِ کثافت دھو گئی ۔ جو لطافت روح میں پنہاں تھی پیدا ہو گئی
لب پہ اخلاص و محبت کا فسانہ آ گیا ۔ آ گیا تبدیلِ فطرت کا زمانہ آ گیا
قالبِ انساں میں ہی پھر روحِ اطہر جلوہ گر ۔ وردھمان ایسا ہوا ہے تیرتھنکر جلوہ گر
اپنے بھگتوں کی نگاہوں میں ہیں با عظمت جنیندر[۱] ۔ تھے اہنسا دھرم کی اک موہنی مورت جنیندر
وجہ تسکیں پیروی رہبرِ کامل ہوئی ۔ دل کو مردانِ صفا کے تقویت حاصل ہوئی

۱؎ جنیندر یعنی جینیوں کے سردار

ہے عروج ایسا شہنشاہوں کے بھی سرتاج ہیں
زیر قابو ہیں حواس ان کے یہ جوگی راج ہیں

خواب منزل ہوگیا جبر و تشدّد کا جنوں
امن کی تعلیم سے بخشا زمانے کو سکوں

ہو سکا ایسا نہ دُنیا میں مہاویر آج تک
آنکھ میں جن راج کی پھرتی ہو تصویر آج تک

رُباعی

اپنی تخلیق کی ضرورت سمجھو
ہاں اپنے وجود کی حقیقت سمجھو

کچھ بھی دنیا کے کام آتا ہو اگر
اپنی ہستی کو تم غنیمت سمجھو

رُباعی

تیری تقدیر کا بنانے والا
تیری تدبیر کا بنانے والا

تجھ سے بڑھ کر نہیں مُصوّر کوئی
تیری تصویر کا بنانے والا

رُباعی

مُنھ دیکھ رہا کس لئے رضواں کا ہے
جنّت اک پھول تیرے داماں کا ہے

ہر قسم کی راحت ہے اسی میں موجود
تو نقش طراز جس گلستاں کا ہے

مہرشی والمیک

ہوئی وجود سے تیرے ہی ابتدائے سخن — پڑی ترے ہی ید پاک سے بنائے سخن
تری ہی ذات مقدس تھی رہنمائے سخن — نہیں ہے اور کوئی جز ترے خدائے سخن

ہوا نصیب جسے بھی لقب سخنداں کا
وہ بامراد ہے گلچیں ترے گلستاں کا

ملا خزانۂ عالم کو یہ گہر تجھ سے — پڑے وجود ہے شرمندہ یہ ہنر تجھ سے
اس ابتدا کی ملی تھی ہمیں خبر تجھ سے — نہ تھا وجود سخنور کا پیشتر تجھ سے

تھی پہلے نظم جہاں میں نہ شعریت پیدا
ہوئی یہ اس میں تری ذات سے صفت پیدا

جو لفظ منھ سے ترے وجد میں نکلتا تھا — معاً وہ کالبد شاعری میں ڈھلتا تھا
ہر ایک رکن اشاروں پہ تیرے چلتا تھا — کہ بات بات میں لعل و گہر اگلتا تھا

خدا کی شان تھا کیا پاک صاف سینہ ترا
عبور بحر جہاں کو یہ تھا سفینہ ترا

ریاض میں تھی کرامت دماغ یک سو تھا — طلسم تیرے بیاں میں سخن میں جادو تھا
ہر ایک لفظ کو سینہ ترا ترازو تھا — کمال یہ کہ تجھے سب رسوں پہ قابو تھا

تھا گوش زہرہ[1] گردوں ترے سخن پہ مدام
کیا تھا صاد عطارد[2] نے تیرے فن پہ مدام

[1] علم نجوم کی رو سے زہرہ کے اثرات شعر گوئی کا باعث ہوتے ہیں اور [2] عطارد کے اثرات سے علم و فضل حاصل ہوتا ہے ۔

سمائی روح کے ہمراہ شعریت تن میں پہنچ گئی یہ ہوا چیونٹیوں[1] کے مسکن میں
جو پھول ہوں نہ میسّر کسی کو گلشن میں شمار ان کا نہ ممکن تھا تیرے دامن میں

سدا بہار کا عالم ترے چمن میں ہے
لطافت آہ نرالی ترے سخن میں ہے

عجیب لطف محاکات میں ترے پایا عجیب وصف خیالات میں نظر آیا
کلام ایسا بلند و بلیغ فرمایا کہ رفعتوں کو پہاڑوں کی جس نے شرمایا

وجود اہلِ جہاں میں تھا انتخاب ترا
نہ آج تک نظر آیا کہیں جواب ترا

وہی حقیقتِ عالم کی تھاہ پاتا ہے وہی حیاتِ دوامی کا حظ اُٹھاتا ہے
اسی کے ہاتھ دُرِ آبدار آتا ہے جو تیرے بحرِ معانی میں ڈوب جاتا ہے

تھا مدّ و جزر سمندر سے بھی سوا دل کا
کہ نام کو بھی نہ تھا دخل اس میں ساحل کا

غضب کی تو نے لکھی بالمیک رامائن ہے نقش صفحۂ دل پر ترا ہر ایک سخن
تھا کس قدر سبق آموز تیرا چال چلن ہوا وہ راہنمائے جہاں جو تھا رہزن

نہیں ہے ہند مگر آج بھی وہ کام ترا
کہ لوٹ لیتا ہے جاگیرِ دل کلام ترا

چرتر رام کے لکھ کر کیا ہے وہ احساں کبھی نہوں گے سبکدوش تجھ سے اہلِ جہاں
ہو خوش نصیب نہ کیوں سرزمینِ ہندوستاں یہیں ہوا تھا عیاں تو یہیں ہوا تھا نہاں

ترے کلام سے دائم میں فیض پاتا ہوں
ترے صحیفے کے آگے میں سر جھکاتا ہوں

---

[1] والمیک کے لفظی معنی مٹی کا وہ انبار ہیں جس میں چیونٹیاں گھر بنالیتی ہیں (دیکھئے سادھارن دہرم مصنفہ سوامی شوگن اچاریہ جی)

حدِ کمال تری ہے حدِّ قیاس سے دُور
پھر آئیں ذہن میں کیسے مطالبِ مستور

ترے وقار کو سمجھے بھلا کسے ہے شعور
تری ثنا و صفت میں زباں ہے معذور

فنا نہیں ہے تجھے، تو مدام باقی ہے
گذر گیا ہے زمانہ - کلام باقی ہے

رُباعی

رشتہ گو زندگی سے توڑا ہم نے
اور موت سے سلسلہ بھی جوڑا ہم نے

دُنیا والے لگائیں آنکھوں سے جسے
ایسا کچھ بھی نہ حیف چھوڑا ہم نے

رُباعی

سینہ میں گُناہ کی سیاہی نہ بڑھے
اب اس میں یہ تیرگی الٰہی نہ بڑھے

گر نُور ترا راہنما ہو جائے
پھر میرا قدم سوئے تباہی نہ بڑھے

مہرشی ویدؔ ویاس جی

دواپر سے عہدِ پاک کے کامل مہارشی
اے احترام خاص کے قابل مہارشی

اے ویاس! اے مصنّفِ دورِ بقانما
تو ناخدائے بحرِ سخن تھا خدانما

پیدا تھی تیرے دم سے ہوا کلپ[1] برکش کی
خامہ ترا تھا، شاخ تھی یا کلپ برکش کی

ترتیا[2] میں والمیک نے جو کچھ کیا تھا کام
دواپر[3] میں تیری ذات سے پایا وہ انصرام

مستی میں تو نے چھیڑ دیئے نغمہ ہائے روح
اب تک ہمیں ہے اِن سے میسّر غذائے روح

ایک ایک اُپنشد[4] کا ہوا جوہر آئینہ
باطن کا انکشاف کیا بن کر آئینہ

بہ زورِ طبع! اُف رے! یہ حُسنِ رقم ترا
جاری رہے گا روزِ ابد تک قلم ترا

تجھ سے سبک تھا بحرِ معانی کا بند بند
توڑا طلسمِ عالمِ فانی کا بند بند

تیری ہر اک کتاب ہے آئینہ دارِ حق
روشن ہے تجھ سے شمع سرِ رہگزارِ حق

میزانِ کلکِ معجزہ فرما کو تول کر
ویدوں کے راز رکھ دیئے دنیا پہ کھول کر

طرحِ جدیدِ حُسنِ بیاں کی نکال دی
اسمرتیوں[5] میں ایک نئی جان ڈال دی

تو نے حقیقتوں کو فسانوں میں بھر دیا
ویدوں کی سُرتیوں[6] کو پرانوں میں بھر دیا

ہیں رنگ رنگ کے یہ گلستاں سجے ہوئے
ان سے دماغ و دل کے ہیں ایواں سجے ہوئے

ہے لفظ لفظ دامنِ گلچینِ حُسن و عشق
ہے سطر سطر جادۂ رنگینِ حُسن و عشق

اَنغرقابِ تیری روح تھی بحرِ جمال میں
سکّہ ترا رواں تھا جہانِ خیال میں

گیتا ترے قلم کی زباں سے ادا ہوئی
تابش فزائے گوہرِ صدق و صفا ہوئی

اے حق شناس و حق نگر اے ترجمانِ کرشن
گویا ترے دہن میں تھی گویا زبانِ کرشن

دہلی ۱۹۳۰ء

---

۱ کلپ برکش یعنی نخل طوبیٰ ۲، ۳ ہندو تقسیم اوقات کے مطابق دوسرے اور تیسرے دور کا نام ۴ علم الہیات کے متعلق ہندو رشیوں کی کتب مقدسہ ۵ سمرتی کلام انسانی ۶ سرتی کلام ربانی۔

سوامی رام تیرتھ

خودمستیاں برنگِ طاؤس جھومتی ہیں
آتا ہے آج لب پر یارب یہ نام کس کا

کیا لامکانیت ہے کیا جاودانیت ہے
عرشِ بریں سے بھی ہے اعلیٰ مقام کس کا

معراج کی فضا میں کس کی ہوا بندھی ہے
جبریل سا فرشتہ بھی ہے غلام کس کا

مستیوں سے کس کی آنکھیں کھلی ہیں اپنی
ملتا ہے بےخودی سے ہم کو پیام کس کا

اُٹھتی ہیں کس کے دل سے یزدانیت کی لہریں
آبِ حیات میں ہے رنگ کلام کس کا

مستوں کی انجمن میں خمخانۂ کہن میں
رہتا ہے محوِ گردش ہر وقت جام کس کا

کس سے بہم دگر ہے عشق و فنا کو نسبت
ہم رنگ بےخودی ہے نقشِ دوام کس کا

یہ کون کھیلتا ہے آغوش ماہ نو میں
اک پرتوِ حسیں ہے ماہ تمام کس کا

آزاد کس کی رد سے ہر سرو پا بہ گل ہے
دل میں قیام کس کا وجہ قرار دل ہے

یہ کون جلوہ پیکر یہ کون روح گستر
پردے میں غیب کے بھی خلوت در انجمن ہے

کس کے وطن سے ظاہر آثار ہیں سفر کے
کس کا سفر گواہ کیفیت وطن ہے

اُف رے یہ جامہ زیبی اُف رے یہ دلفریبی
عریانیوں میں کس کی انداز پیرہن ہے

ہالہ جو چاند کا ہے حلقہ ہے کس کے رخ کا
ہر اک شعاع اس کی سورج کی جو کرن ہے

غنچوں کی موجِ بو سے مہکی ہے جیب کس کی
دامن میں کس کے آبِ صد گوہرِ عدن ہے

جن پر کنول تصدق جن پر نثار نرگس
محبوب انکھڑیوں میں مستانہ بانکپن ہے

کس کی نسیم ہے یہ کس کی شمیم ہے یہ ۔۔۔ ہے باغ باغ دنیا عقبیٰ چمن چمن ہے
اک لہر جس کی اُٹھی سیلاب گنگ بن کر ۔۔۔ اک لہر جس کی موجِ مستانۂ چمن ہے
غمّازِ رازِ وحدت فطرت کا ہر اشارا ۔۔۔ مصروفِ ترجمانی خاموشی دہن ہے

ہوتی ہیں سدّھیاں خوش جب پاؤں چومتی ہیں
دیدوں کی سُرنیاں بھی گرد اس کے گھومتی ہیں

کہنے کو نام اس کا ہے یوں تو رام تیرتھ ۔۔۔ دن یادگار اس کا اک دیپ مالکا ہے
اس کے لئے عبث ہے یہ قید اسم و صورت ۔۔۔ ہر شکل و نام سے وہ ہر لحظہ رونما ہے
پیشِ نظر ہے جو کچھ سب پر ہے مہر اس کی ۔۔۔ مستِ دوام ہو کر گم گشتۂ فنا ہے
گنگا کی گود میں ہو اب تک سمادھ اس کی ۔۔۔ اب تک مقام اس کا بام ہمالیا ہے
بیخود بنا رہی ہو لہروں کی گنگناہٹ ۔۔۔ یا نعرۂ انا الحق کانوں میں گونجتا ہے
جتنی بھی صورتیں ہیں سب اسکی مورتیں ہیں ۔۔۔ ہم اس سے کب الگ ہیں وہ ہم سے کب جُدا ہے
خود ہستیوں سے اس کی نکتہ یہ ہاتھ آیا ۔۔۔ ظاہر میں جو خودی ہو باطن میں وہ خدا ہے
الہند کا شبد ہو اک، اک ادم کی ہو بانی ۔۔۔ جو سازِ دلربا کا آہنگ دلربا ہے
آواز ہے خودی کی اعجاز ہے خدا کا ۔۔۔ کوئل کی جو نوا ہے بُلبُل کی جو صدا ہے
آزاد مشربوں کو باد صفت قید مشرب ۔۔۔ جو بات ہے جائز جو شے ہے وہ روا ہے

آؤ کریں نہ مل کر تعظیم رام تیرتھ
پھر درس بیخودی دے تعلیم رام تیرتھ

لکھنؤ اکتوبر ۱۹۳۸ء

رشی دیانند کی شان

دل روشنیٔ علم سے پُر نُور ہوگیا — جب اس میں تیرگیٔ جہالت غضب کی تھی
تکمیل ہوش نے تجھے دیوانہ کردیا — دیدوں سے تیرے دل کو محبت غضب کی تھی
پائی تھی فتحمند سپاہی کی آن بان — تجھ میں بلا کا حوصلہ ہمت غضب کی تھی
آنکھوں سے برہمچرج کی شکتی تھی آشکار — چہرے پہ تیرے شانِ ریاضت غضب کی تھی
آیا جو سامنے اُسے تسخیر کرلیا — تیرے دل و دماغ میں طاقت غضب کی تھی
دریا تھے اس کے آگے روانی میں آب آب — فیضِ ازل سے پائی طبیعت غضب کی تھی

تو اک عجیب نبض شناسِ زمانہ تھا
تیرا وجودِ عہد میں اپنے یگانہ تھا

جیسے تلاش منزلِ مقصود کے لئے — گم گشتہ کارواں کو ہو رہبر کی احتیاج
جیسے صفائیٔ خس و خاشاک کے لئے — صحرائے خشک کو ہو سمندر کی احتیاج
جس طرح بہرِ چاک گریبانِ تیرگی — ہنگامِ شب ہو ماہِ منوّر کی احتیاج
جیسے فسادِ خوں میں ہو فصّاد کی طلب — پھوڑے کے چیرنے کو ہو نشتر کی احتیاج
جس طرح مردِ مارگزیدہ کے واسطے — بہرِ معالجہ ہو فسوں گر کی احتیاج
تھی ہم کو ایک مصلحِ جانباز کی طلب — تھی ہم کو ایک مردِ دلاور کی احتیاج

تو ہم کو پستی سے بچانے کو آگیا
مُردہ جو قوم تھی اُسے زندہ بنا گیا

دہلی۔

مہارانی لکھشمی بائی کی چھتری

اے منوّر تو جو آیا ہے میانِ گوالیار — دیکھنی ہے اصل میں تجھ کو جو شانِ گوالیار

یادگارِ پاک اک خاتونِ لاثانی کی دیکھ — چل کے چھتری لکھشمی بائی مہارانی کی دیکھ

ترجمانِ فطرتِ انساں ہے یہ چھتری نہیں — آسمانِ عظمتِ نسواں ہے یہ چھتری نہیں

سُرمۂ چشمِ ملائک آہ ہے اس کا غبار — خاک جھانسی کی ہے اس سے سربلندی آشکار

شان و شوکت صنفِ نازک کی ہویدا اس سے ہے — سندھیا کی مملکت میں جان پیدا اس سے ہے

گوہرِ ناموسِ ہندوستاں کا گنجینہ ہے یہ — جذبۂ شوہر پرستی کا اک آئینہ ہے یہ

خاک سے اس کی جلا آئینۂ عصمت کو ہے — ناز اس کی آبرو پر جوہرِ عفّت کو ہے

مادرِ ہندوستان کا سینۂ تاباں ہے یہ — گوشِ مستورات کا اک گوہرِ غلطاں ہے یہ

دیکھتا چشمِ عقیدت سے ہے اک عالم اسے — کہتے ہیں پیشانیِ نسواں کی بیندی ہم اسے

اس سے روشن ہے جبینِ راجگانِ سندھیا — اس سے ملتا ہے نشانِ اوج و شانِ سندھیا

اس صحیفہ کی کتابت تھی نہ محتاجِ قلم — ہند کی تاریخ حرفِ خوں میں ہوا اس سے رقم

یہ وہ تکیہ ہے ضیائے مہر ہے جس کا غلاف — آ کے کرتی ہیں ستی ساوتری اس کا طواف

شاہدِ پامردیِ عورات یہ تعمیر ہے — اک جری خاتون کے جذبات کی تصویر ہے

آہ بھرتا ہے جو کوئی دیکھ لیتا ہے اسے — قولِ اقبال[1] سخنداں زیب دیتا ہے اسے

جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور
دار و گیرِ عالمِ اسباب کا حاصل ہے گور

[1] ڈاکٹر اقبال مرحوم و مغفور

اے منور مرتے مرتے بھی نہ جس کا سر جھکا ۔۔۔ اس کی چھتری پر ادب سے آج اپنا سر جھکا

سر قلم جس نے کئے روئیں تنوں کے جنگ میں ۔۔۔ دل کئے تسخیر جس نے دشمنوں کے جنگ میں

تھی اطاعت وجہ عار و ننگ جس کے واسطے ۔۔۔ زیور تن تھے سلاح جنگ جس کے واسطے

دل نہ خستہ جس کا ناشادی سے بربادی سے تھا ۔۔۔ رنج بیحد جس کو لیکن سلب آزادی سے تھا

مرد میداں بن کے جب محو صف آرائی ہوئی ۔۔۔ فرش سے تا عرش تھی ہیبت سی اک چھائی ہوئی

نیزہ و خنجر بکف شبدیز جولاں پر سوار ۔۔۔ شیرنی کی طرح کرتی تھی صفِ دشمن پہ وار

ضرب کے اوقات میں آئینہ تھا جوشِ دروں ۔۔۔ حرب کے آلات سے تھی حسن کی تابش فزوں

آبروئے شوہر جانباز کی سرمایہ دار ۔۔۔ مرمٹی ہندوستاں کی آن پر مردانہ وار

عرصۂ پیکار میں ہار اس سے کوسوں دور تھی ۔۔۔ خود پرستی سے یگانوں کی مگر مجبور تھی

گو ہوئی چو رنگ شمشیرِ عدو سے جنگ میں ۔۔۔ تر بتر تھی گو زمیں اس کے لہو سے جنگ میں

پھر بھی قابو اس قدر تھا تیغ تابشناک پر ۔۔۔ مرتے مرتے بھی ہزاروں کو سلایا خاک پر

ملک پر اپنی مقدس زندگی قربان کی ۔۔۔ دیش بھگتی کے ہون میں آہتی[1] دی جان کی

جس کے طالب دیوتا بھی ہیں وہ پدوی[2] مل گئی ۔۔۔ برمھ شکتی[3] میں شہادت سے یہ اپنی رل گئی

اس کی چھتری ہے اٹل[4] اور اس کی پدوی ہے امر[5]
آج اس کے گیت جاری ہیں زبانِ خلق پر

[1] آہتی یعنی قربانی [2] پدوی یعنی درجہ [3] برمھ شکتی یعنی قدرت الٰہی [4] اٹل یعنی لاجنب [5] امر یعنی لافانی۔

کلؔ بھاسکر کی یاد

۲۵ نومبر ۱۹۳۴ء

خس وخاشاک غم و رنج کو دریا بن کر ایک بیمار جہالت کا مسیحا بن کر
قوم کے درد کی تصویر سراپا بن کر جلوہ فرما ہوا غمخوار ہمارا بن کر
ہے کوئی صاحب علم و ہنر ایسا دانی
اب نہیں قوم میں کل بھاسکر ایسا دانی

پستی روح کے آثار مٹانے والا ظلمت و جہل کا آزار مٹانے والا
کلفت نکبت و ادبار مٹانے والا صورتِ گل خلش خار مٹانے والا
پاٹھ شالہ دل غمخوار کا آئینہ ہے
اس کے قربانی و ایثار کا آئینہ ہے

کس میں پیدا تھی بھلا ہمت عالی ایسی قوم کی حالتِ ناگفتہ سنبھالی ایسی
پاٹھ شالے کی بنا ملک میں ڈالی ایسی وسعتِ علم کی تدبیر نکالی ایسی
ناامیدوں کے لئے مرکزِ امید بنا
قوم پر ہو کے فنا زندۂ جاوید بنا

نقش اب تک دل عالم پر شعار اس کا ہے جوہر صدق و صفا آئینہ دار اس کا ہے
کیا بتائیں تمہیں کیا عزّو وقار اس کا ہے کہ مشاہیر زمانہ میں شمار اس کا ہے
پائی عمر ابدی قوم پر قربان ہو کر
فوق حاصل تھا فرشتوں پہ بھی انساں ہو کر

لہ فخر قوم منشی کالی پرشاد کل بھاسکر بانی کالستھ پاٹھ شالہ الہ آباد

روح جس کی ہے مشرّف سربامِ معراج — کشورِ دہر میں تھا جوشہ درویش مزاج
ہم سمجھتے ہیں جسے آج تک اپنا سرتاج — دل میں ہے یاد اسی محسنِ ممتاز کی آج
اس کی تعظیم کے ساماں یہ نظر آتے ہیں
سرِ عقیدت سے کہ دمہ کے جھکے جاتے ہیں

رُباعی

تو نطق کی قدر سے شناسا ہی نہیں — ذکرِ حق میں زباں جو گویا ہی نہیں
جس کام کے واسطے زباں پائی ہے — وہ کام کبھی تو اس سے لیتا ہی نہیں

رُباعی

چلتے میں کہیں جو کھا گیا ہے ٹھوکر — ایذا نہ بڑھا درد کی ناحق رُو کر
اے راہِ عمل میں پاؤں رکھنے والے — ہونا ہے جو بات وہ رہے گی ہو کر

رُباعی

اب زاویۂ نگاہ اپنا بدلے — بزمِ ہستی کا جس سے نقشا بدلے
مدّت سے بہت خستہ و بوسیدہ ہے — پھر قوم کو لازم ہے کہ چولا بدلے

علّامہ حضرت اقبال مرحوم سے خطاب

یہ رُباعیات بہ سلسلہ اقبال ڈے ۲۴ر جولائی ۱۹۳۸ء کو عربک کالج میں پڑھی گئی ہیں جو انجمن علم و ادب کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا تھا۔ مناظمہ کی صدارت علّامہ سیماب اکبر آبادی نے فرمائی تھی۔

باطن کی نوا ہمیں سُنانے والے — آوازِ خدا ہمیں سنانے والے
آجا محفل میں پھر ہماری آجا — اے بانگِ درا ہمیں سُنانے والے

اے بسترِ خواب سے اُٹھانے والے — اے ہوش میں اک جہاں کو لانے والے
پھر ضربِ کلیم سے جگا دے آکر — اے ضربِ کلیم سے جگانے والے

اے عظمتِ روحِ زندگی سے آگاہ — اے مقصدِ پاک شاعری سے آگاہ
پھر ہو کے رموزِ بیخودی پر حاوی — کرہم کو رموزِ بےخودی سے آگاہ

رنگ اس میں عجیب بھر دئیے تھے تونے — جوہر اپنے عیاں کئے تھے تو نے
اسرارِ خودی نہ فاش کرتا کیسے — اسرارِ خودی سمجھ لئے تھے تو نے

ایسی نہیں کچھ بخش دکم ایسی لکھ دے — تصنیف اُٹھاکر قلم ایسی لکھ دے
ہر اک شاعر کے بس کا یہ کام نہیں — اک نظم زبورِ عجم ایسی لکھ دے

قائل تھا سخن میں اک زمانہ تیرا — مقبول تھا اندازِ یگانہ تیرا
صدیوں گونجے گا ہند میں اے اقبال — کہتے ہیں جسے لوگ ترانہ تیرا

ڈوبی تھی ہر اک بات اثر میں تیری — گم عقل تھی عشق معتبر میں تیری
تھا قول ایمرسن[1] کا تجھے دل سے پسند — تقلید تھی خودکشی نظر میں تیری

تھی زینتِ گلزارِ حقیقت تجھ سے — معمور تھی جلوہ گاہ قدرت تجھ سے
مشرق کا پیامبر تھا مغرب میں تو — ٹیگور کے بازو میں تھی قوت تجھ سے

جاوید کیا وجود اپنا تو نے — دے کر ہمیں یہ جگر کا ٹکڑا تو نے
اس کا اندازہ کچھ تجھی کو ہوگا — لکھا جاوید نامہ جیسا تو نے

کیا خوب تھا طرزِ انتخاب شکوہ — تھی تیری زبان کامیاب شکوہ
دونوں کو عجیب چیز پاتا ہوں میں — شکوہ ہو خواہ وہ جوابِ شکوہ

جب شہپرِ جبرئیل تو نے تولے — جب زندگی و موت کے عقدے کھولے
اقبال تھا کیا چیز نہ سمجھا کوئی — اقبال تھا اقبال فرشتے بولے

ہر چند کہ تھا مخاطب اسلام ترا — مخصوص تھا امت کے لئے کام ترا
ہم بھی لیتے ہیں درس عبرت تجھ سے — ہم کو بھی ابھارتا ہے پیغام ترا

---

[1] امریکہ کا لازوال فلاسفر۔

ہر چند کہ خود ہی اس کو ڈھایا تو نے | اک معبد نو جو تھا بنایا تو نے
دیتی ہے تری خاک مگر بوئے وطن | پایا ہے پس فنا یہ پایا تو نے

کہہ دے اقبال ہاں خدارا کہہ دے | ہو کر دنیا میں جلوہ آرا کہہ دے
ہاں پھر ہم کو بنا لے اپنا آ کر | ہاں پھر ہندوستاں ہمارا کہہ دے

دہلی ۱۹۳۸ء

رُباعی

تحریکِ گناہ سے نہ گم ہو جانا | افعالِ سیاہ سے نہ گم ہو جانا
ممکن جو یہ کچھ نہیں تو اتنا کرنا | تو اپنی نگاہ سے نہ گم ہو جانا

رُباعی

خود اپنی ہی قدر اگر نہیں کر سکتے | عزّت سے کبھی بسر نہیں کر سکتے
ذاتی توقیر کی حفاظت کے بغیر | دُنیا میں ہم گذر نہیں کر سکتے

ارجن کی تصویر دیکھ کر

کون اُٹھا ہے لے کے دل میں عزم دارو گیر دیکھ
دیکھنے والے ! یہ کس انساں کی ہے تصویر دیکھ
کس کی رگ رگ سے ظہور ہمّت مردانہ ہے
کس میں جانبازی کا جوہر صورت پروانہ ہے
اک نگیں خورشید کس کے تاجِ سُلطانی کا ہے
آئینہ یہ کس کے اعزازِ جہانبانی کا ہے
کھینچ لایا ہے یہ کس کو گھر سے ارمان نبرد
گرم کرنے جا رہا ہے کون میدان نبرد

دہلی ۱۹۳۷ء

وصال نصیب رشی دیانند کی سیوا میں

دیتے نہ کیوں رشی کی تجھے لوگ منزلت
تیرے کمال و فضل کی کچھ انتہا نہ تھی

شکتی میں برہمچریہ کی تو لاجواب تھا
بھگتی کسی میں دید کی تجھ سے سوا نہ تھی

پست و بلند سب کو ترے دل میں تھی جگہ
تفریق سے نگاہ تری آشنا نہ تھی

کی اپنے دشمنوں کے لئے بھی دعائے خیر
ہمیشہ شل تھا مزاج طبیعت یگانہ تھی

تیری زباں کو شکر نگہباں سے کام تھا
ظالم سے شکوہ سنج سلوکِ جفا نہ تھی

کیونکر نہ ہو شمار مشاہیر میں ترا
ہستی تری زمانے میں فخرِ زمانہ تھی

تجھ پر عیاں ہر ایک زمانے کا حال تھا
ویدوں کا آئینہ تھا تری آتما نہ تھی

تھی خاص مصلحت کوئی ترے ظہور میں
تخلیق تیری دہر میں بے مدعا نہ تھی

کرتے نہ لوگ کیوں ترے پیغام پر عمل
پرماتما کا شبد تھا تیری صدا نہ تھی

دھلی

مہاتما گاندھی سے

جنّد اشان ارادی تری اے رہبر ملک
گرد ثابت قدمی ہوگئی کہساروں کی

اُف رے دیوانگی عشق ترا کیا کہنا
منزلت یہ نہیں تقدیر میں ہُشیاروں کی

عرش پیمائی تحریک مقدس سے کہیں
فرق آجائے نہ رفتار میں سیّاروں کی

آئینہ ہیں دل شفّاف پہ آئینِ وفا
آبرو تجھ سے ہے دنیا میں وفاداروں کی

یہ بھی ہے ایک تری بے گنہی کا اعجاز
ترے صدقے میں بڑھی قدر گنہگاروں کی

دل کے مندر میں ہے معبود صفت جلوہ نما
تو ہی اُمید ہے اک اپنے پرستاروں کی

تیری مانند جو ہوتے رہیں انساں پیدا
بخدا ہم کو ضرورت نہیں اوتاروں کی

تجھ کو مل جائے گا ثمرہ تری غمخواری کا
ہوں گی مقبول دعائیں ترے غمخواروں کی

گل زمیں سے نہیں کم تیرے لئے دشتِ الم
تجھے بے چین کرے کیسے خلش خاروں کی

کیا فنا تجھ کو نگاہ غضب آلود کرے
سرد ہے آنچ ترے سامنے انگاروں کی

وقت پر خوب اسے کام میں تو لے آیا
جو دوا تھی مرضِ غم کے گرفتاروں کی

اس کے دل کو نہ کہے دل کوئی پتھر سمجھے
جس کو ہستی ہو گراں تجھ سے سبکساروں کی

برت رکھ کر بھی تری جان نہ جانے پائے
بچھنے پائیں نہ صفیں تیرے عزاداروں کی

دہلی

دسویں گورو کی یاد

نظر میں زمانہ ہے دسویں گورو کا
زباں پر فسانہ ہے دسویں گورو کا

حیات آفریں ہے جو روداد ان کی
بناتی ہے زندہ ہمیں یاد اُن کی

لہو کھول اُٹھا دل دھڑکنے لگا ہے
حمیّت کا شعلہ بھڑکنے لگا ہے

بہادر وہ پنجاب کی سرزمیں کے
محافظ تھے جانباز دنیا و دیں کے

عیاں ان پہ مفہوم تھا زندگی کا
اُنھیں راز معلوم تھا زندگی کا

وہ نانک کے قالب کی روحِ رواں تھے
بہادر سپہ دار مردِ جواں تھے

بڑی شان سے آن کو منزلت دی
نہ ایمان پر جان کو فوقیت دی

فقیری گپھا، بیشۂ شیرِ نر تھی
یہ اب اِک گزرگاہ تیغ و سپر تھی

پئے رزم شمشیرِ بُرّاں اُٹھائی
حریفوں کے خرمن پہ بجلی گرائی

پریشاں کیا دھرم کے رہزنوں کو
پشیماں کیا عقل کے دشمنوں کو

وہ نازوں کے پالے جگربند اپنے
کئے دھرم کی نذر فرزند اپنے

نہ تھا راج پنجاب میں خالصہ کا
زمیں تھی خدا کی عمل تھا خدا کا

جہاں کارفرما تھا حکمِ الٰہی
میسّر تھی اُس ملک کی بادشاہی

جو اوصاف تھے نام سے آئینہ تھے
یہ دسویں گورو تھے کہ شیرِ خدا تھے

دہلی - ۱۹۳۷ء

دُنیوی فقیر

نذر کی جان بھی قربانگہ آزادی پر — تھا غمِ حلقہ بگوشی سے جگر ریش ایسا

اعتقادات کے اظہار میں بے باکی تھی — ہم نے دیکھا ہی نہیں مردِ صفا کیش ایسا

رہ کے دنیا میں رکھا روح کو دنیا سے الگ — کوئی سنیاس اگر لے تو کم و بیش ایسا

جامہ ترک پہ ہو کے سہی ہو بندوق کا وار — کس کو آیا ہے کبھی معرکہ درپیش ایسا

کردیا آتشِ ایثار میں دل خاکستر — فکرِ بیگانہ کچھ ایسی تھی غمِ خویش ایسا

جس کے ایمان میں داخل تھی پرستاری قوم — ہے کوئی مردِ خدا مصلحت اندیش ایسا

جس کی تقدیر میں ہو مرتبہ شردھانند[1]
خطۂ ہند میں اب کون ہے درویش ایسا

[1] زندہ جاوید سوامی شردھانند جی

گورو نانک

کیوں ہو نہ آج اپنا دماغ آسمان پر
ہے پاک منتر واہ گورو[1] کا زبان پر

آواز گوش زد ہے بس ایک اونکار[2] کی
ہے دل میں یاد مرشدِ عالی وقار کی

پارس بنے فرائضِ مودی[3] نے کر دیا
سر جس کے آگے خم شہِ لودی نے کر دیا

تیرہ[4] کے جب شمار میں مشغول ہو گیا
مالک کا ایک بندۂ مقبول ہو گیا

زندہ ہے جس کے فیض سے مردانہ[5] آج تک
قائم ہے جس کی یاد میں ننکانہ[6] آج تک

جس نے سبق اکال پُرش[7] کا پڑھا دیا
شبدوں میں گھول گھول کے امرت چھکا[8] دیا

نانک کے نام سے ہے جو مشہور خاص و عام
لایا جو اپنے ساتھ نرنکار[9] کا پیام

قائل ہے جس کا ایک جہاں کچھ ہمیں نہیں
جس کا نظیر جس کا مقابل کہیں نہیں

جس نے بلند کی تھی صدا سکھ دھرم کی
ڈالی تھی جس نے پاک بِنا سکھ دھرم کی

۱ سکھوں کا اسم اعظم ۲ ذاتِ باری تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ
۳ گرو نانک جی شاہان لودی کے زمانہ میں مودی خانہ کے مہتمم تھے اسی کے فرائض کی انجام دہی میں اُن کو حقیقت کا عرفانِ کامل ہوا تھا
۴ مودی خانہ میں کسی چیز کے تولنے میں جب سلسلہ وار تمام اعداد زبان سے نکلنے کے بعد تیرہ۱۳ کا عدد زبان مبارک پر آیا تو گورو نانک تیرا ہی تیرا رٹنا کئے اور اُن پر وجد کا عالم طاری ہو گیا۔
۵ مردانہ گورو نانک کا مقبول اور منظورِ نظر پیرو اور مرید تھا۔
۶ ننکانہ صوبۂ پنجاب کا مشہور مقام ہے جو گورو نانک دیوجی کی یادگار ہے۔
۷ اکال پرش سے مُراد ذاتِ احد ہے۔
۸ امرت چھکانا سکھوں کی خاص اصطلاح ہے ۹ نرنکار یعنی غیر صفاتی۔

مرشد یہ وہ تھا مرشدِ اعظم کہیں جسے
اہلِ جہاں کا ہادیِ اکرم کہیں جسے

خود کو مٹا چکا تھا یہ راہِ نیاز میں
توحید کی صدا تھی نہاں اس کے ساز میں

درویش حق شعار تھا کامل فقیر تھا
کعبہ مطیع جنبشِ چشمِ ضمیر تھا

عرفاں کا نور سینۂ صافی میں بھر دیا
دیر و حرم کے فرق کو نابود کر دیا

راہِ نجات بہرِ خلائق نکال دی
اک مسلکِ عظیم کی بنیاد ڈال دی

قرآن اور بید کو باہم ملا دیا
دونوں میں تھا جو فرق نمایاں مٹا دیا

ناقوس کی صدا کے مطالب بیاں کیے
رازِ نہاں نماز و اذاں کے عیاں کیے

باندھی گرنتھ سے جو گرہ اتحاد کی
پھر اُٹھ سکی نہ ہند میں آندھی جہاد کی

نانک کے حکمِ پاک پہ سر سب کے جھک گئے
جو ظلم کے لئے تھے بڑھے ہاتھ رُک گئے

قطعہ

کوئی باقی نہیں رہنے کا اِن میں
یہ جتنی صورتیں ہیں انس و جن کی

عزیز و اقربا سب نام کے ہیں
نہیں رکھتا ہے کچھ اُلفت میں ان کی

ہوا کرتا ہے جامۂ عُمر کا قطع
چلا کرتی ہے قینچی رات دن کی

مہاتما گوتم بُدھ

یہ کس کا پیکرِ ظلمت ربا اعجاز فرما ہے ‌ ‌ سمایا جا رہا ہے کون یہ چشمِ منوّر میں
تصوّر کس کی بند آنکھوں کو رنگِ خاص دیتا ہے ‌ ‌ نہاں ہیں جنّتیں کس کے سکونِ روح پرور میں
گلستاں دیکھ کر کس کو ہوئے جاتے ہیں شرمندہ ‌ ‌ ہویدا یہ لطافت ہو نہیں سکتی گلِ تر میں
مشامِ جاں معطّر ہے ہوائے کس کے دامن کی ‌ ‌ شگفتہ پھول ہو گویا کنول کا حوضِ کوثر میں
جزو و کل کا تعلق آئینہ ہے ذات سے کس کی ‌ ‌ یہ قطرے ہل رہے ہیں کس کی کاوش سے سمندر میں
بدل دیتا ہے فطرت آدمی کی یہ فسوں کس کا ‌ ‌ یہ کس کے سحر سے رعشہ سا ہے دستِ ستمگر میں
یہ کس کے جلوۂ بیدار سے پیدا ہے کیفیت ‌ ‌ جلالِ مہرِ تاباں ہیں جمالِ ماہِ انور میں
خدا لاکھوں کا ہے یہ دیوتا ہے گو ہزاروں کا ‌ ‌ نہ مسجد ہیں مُقیّد ہے نہ ہے محبوس مندر میں
یہ کس کی جنبشِ لب مانعِ پیکار باہم ہے ‌ ‌ یہ سنّاٹا سا کیوں چھایا ہے جانبازوں کے لشکر میں
اُڑائی ہیں یہ کس نے دھجّیاں ملبوسِ شاہی کی ‌ ‌ مِلا کس کو نشانِ خاک رہ خوں دیہیم و افسر میں
تنِ آسانی ہوئی کس کے لئے وجہ گرانجانی ‌ ‌ نظر آئے نہاں کانٹے کسے پھولوں کے بستر میں
نہ کر پایا کسے کاشی کا علم و فضل آسودہ ‌ ‌ کسے اُلجھن ہوئی ویدوں کی تفسیروں کے چکّر میں
رُلایا ایک مردِ زار نے برسوں لہو کس کو ‌ ‌ عجب تاثیر تھی بیکس کی بیماری کے منظر میں
تڑپ اُٹھا مصیبت دیکھ کر یہ کون پیری کی ‌ ‌ بھری تھی مثلِ شعلہ آگ کس کے قلبِ مضطر میں
جنازہ دیکھنا کس کے لئے اک درسِ عبرت تھا ‌ ‌ مآلِ زندگی سے درد پیدا ہو گیا سر میں

فرشتے دست بستہ کس کے گرد و پیش رہتے ہیں
یہ ہستی کیا ہے وہ سب جس کو گوتم بُدھ کہتے ہیں؟

دُعا

الہ آباد اتحادی کنفرنس کے موقع پر

آثار آشتی ہوں نمایاں خدا کرے
پیدا ہوں اتحاد کے ساماں خدا کرے

جنگ و جدل کے بعد ہو امن و اماں کا دور
صحرا سے ہو نمود گلستاں خدا کرے

جو گمرہی کو چھوڑ کے آئے ہیں راہ پر
اب اُن کو ورغلائے نہ شیطاں خدا کرے

مرکز پہ ایک جمع ہوں اجزائے منتشر
اسباب برہمی ہوں پریشاں خدا کرے

باقی رہے نہ ہندو و مسلم میں کچھ بھی فرق
ہو جائیں ایک مثل دل و جاں خدا کرے

بیگانہ خو حسد سے جلیں اپنی آگ میں
رل جائیں ان کے خاک میں ارماں خدا کرے

خمیازۂ شرارت پیہم سے ہوں ذلیل
دیکھیں ہم ان کو سر بگریباں خدا کرے

ہو اتصال گنگ و جمن پر یہ اتحاد
سر ہو الہ آباد میں میداں خدا کرے

گاندھی بھی کنفرنس کی روح رواں بنیں
ہو کالعدم اسیری زنداں خدا کرے

شوکت علی کی ہمتِ عالی کو مرحبا
پھل لائے ان کی سعی فراواں خدا کرے

اللہ رے مالوی کی جگر کاوی عظیم
ہوں کامیاب مقصد پنہاں خدا کرے

ایمان اتحاد پہ لائے ہر اک نفس
قائم ہو اتحاد کا ایماں خدا کرے

عیسائی ہوں ہنود ہوں مسلم ہوں خواہ سکھ
سب نام پر ہوں صلح کے قرباں خدا کرے

امن و اماں کی ملک میں پیدا ہوں صورتیں
آجائے راس گردشِ دوراں خدا کرے

نوٹ، یہ نظم قومی نظموں میں شامل ہونی چاہیے تھی سہواً شخصی نظموں میں شامل ہو گئی ہے

بیاباں گرد رام

جری ہونا تھا میدانِ عمل کا مرد ہونا تھا
بہ نبضِ گرم اظہارِ مزاجِ سرد ہونا تھا

مٹا دینا تھا خود کو کام آ کر اہلِ دُنیا کے
سراپا درد بن کر آشنائے درد ہونا تھا

بساطِ عنصری طے کر کے آخر داؤں اُٹھ جاتے
جما کر رنگ نام آور بہ رنگ نرد ہونا تھا

ادائے فرض کے احساس سے دل میں تڑپ ہوتی
یگانہ ہمیں، یکتا ہمیں، ہمیں فرد ہونا تھا

مُنوّر خانۂ ویرانی سے عمرِ جاوداں ملتی
تمہیں بھی رام کی صورت بیاباں گرد ہونا تھا

دیکھنا ٹھیس نہ لگ جائے اِن آئینوں کو

موت سے بڑھ کے ہی جذبات کی تحقیر مُجھے

(مُصنّف)

مُنتہائے تصوّر

ھ

مُنوّر تیرنے لگتا ہوں میں بحرِ مسرّت میں
فنا ہوتا ہوں طغیانی میں اپنے جذبِ کامل کی
سفینہ بے ٹھکانے ہو کے آتا ہے ٹھکانے پر
نظر آتا ہے امکانِ حصولِ مدّعا مجھ کو
اثر ہوتا ہے غالب عالمِ اسباب پر میرا
حقیقت حُسنِ عالمگیر کی مجھ پر بھی کھلتی ہے
مجھے رازِ بقا سرِّ فنا معلوم ہوتا ہے
بھٹک سکتا نہیں پھر منزلوں میں شوق و نفرت کی
مری بیگانگی سے آشنائی ہو نہیں سکتی
نگاہِ دو جہاں ہوتی ہے خوش میری نگہ بن کر
وجودِ مدّعا و مدّعی باقی نہیں رہتا
کوئی اندازہ کر سکتا نہیں میری بلندی کا
کوئی مسلک نہیں رہتا کوئی مشرب نہیں رہتا
اُبھرتے ہیں اُبھر کر دو جہاں کو جگمگاتے ہیں
جبیں سے تابشیں مہرِ مُنوّر کی جھلکتی ہیں
مری ہر سانس سے اک دودھ کا چشمہ اُبلتا ہے

مُنوّر ڈوبنے لگتا ہوں میں جوشِ محبّت میں
نہیں تمیز کچھ رہتی مجھے گرداب و ساحل کی
دُرِ مقصود ملتا ہے اُبھر کر ڈوب جانے پر
مُبارک باد دیتا ہے مرا بختِ رسا مجھ کو
اُدھر جاتے ہیں سب رُخ دیکھ لیتے ہیں جدھر میرا
مری جنسِ طلب فردوس کے پھولوں میں تُلتی ہے
ہر اک آئینہ جوہر آشنا معلوم ہوتا ہے
مجھے ملتی ہے فرصت کشمکش سے رنج و راحت کی
اُمید و بیم کی مجھ تک رسائی ہو نہیں سکتی
فراق و وصل ہٹ جاتے ہیں پیچھے گردِ رہ بن کر
نظر کے سامنے پردا کوئی باقی نہیں رہتا
کھنچ آیا ہے مری مستی میں عالم ہوشمندی کا
ذرا بھی کفر و ایماں سے مجھے مطلب نہیں رہتا
تنِ خاکی کے ہر ذرّے میں تارے جھلملاتے ہیں
ہزاروں چاند دامن میں لئے کرنیں چھٹکتی ہیں
مرے سائے میں اکثر پیکرِ خورشید ڈھلتا ہے

بنا دیتا ہوں گُل نارِ سقر کے ہر شرارے کو
ضیا دیتا ہوں اوجِ آسماں پر ہر ستارے کو

مجھے تحفہ میں دیتے ہیں گلستاں ہار پھولوں کے
لگا دیتے ہیں میرے سامنے انبار پھولوں کے

اُتر آتے ہیں پابوسی کو میری مہر و مہ دونوں
سر آنکھوں پر خوشی سے مجھ کو دیتے ہیں جگہ دونوں

جمالی اندر[1] میری شان پر قربان جاتا ہے
جلالی رُدر[2] میرے دبدبہ سے تھرتھراتا ہے

پون[3] مجھ پر چنور جھلنے کا خواہشمند ہوتا ہے
برن[4] دل سے مرے احکام کا پابند ہوتا ہے

کبیر[5] اپنی بقا کا راز مجھ پر کھول دیتا ہے
متاعِ دل لٹا دیتا ہے گوہر رول دیتا ہے

بنا لیتا ہے مجھ کو ذرہ ذرہ رازداں اپنا
لٹا دیتی ہے مجھ پر پرتھوی[6] گنجِ نہاں اپنا

چمک اُٹھتا ہے بخت[7] اگنی کا میری آتشِ غم سے
اثر بن کر لپٹ جاتا ہے فریادِ مجسّم سے

مرے دامن سے ہو جاتا ہے تنگ آکاش[8] کا دامن
یہ بن جاتا ہے میری خاکِ گردوں پاش کا دامن

سما جاتا ہوں اوشا[9] کی سحر پرور نگاہوں میں
سحر پرور نگاہوں میں ضیا گستر نگاہوں میں

سمادھی[10] کو مری محویّتوں میں نیند آتی ہے
کشادوبست سے پلکوں کے سندھیا[11] جھوم جاتی ہے

مری ہر رات بنتی ہے شبِ معراج جمنا کی
اُچھل پڑتی ہیں مجھ کو دیکھ کر امواج جمنا کی

لگا کر آگ سی سینے میں پھر اس کو بجھاتی ہے
مرے اشکِ رواں کی نہر میں گنگا نہاتی ہے

سماعت ڈھونڈنے لگتی ہے سامانِ ہم آغوشی
اُبل پڑتی ہے نغمہ بن کے ہر اک شے کی خاموشی

جوابِ شوق پانے کو سوال رقص اُٹھتا ہے
برنگِ شعلہ پہلو سے خیالِ رقص اُٹھتا ہے

پہنتی ہیں نظر کی شوخیاں جامہ اداؤں کا
نظر آتا ہے مجھ کو ناچ ویدوں کی رچاؤں کا

لبِ گویا سے خاموشی کا پردہ چاک ہوتا ہے
سکوں اندر سکوں ہو کر جنوں بیباک ہوتا ہے

کبھی ساون یہ بنتی ہیں کبھی یہ پھاگ بنتی ہیں
صدائیں سوز و سازِ عاشقی سے راگ بنتی ہیں

[1] اندر یعنی خدائی طاقت جو ابر و باراں کی کفیل ہے [2] رُدر۔ ذاتِ یزدانی کا جلالی پرتو [3] پون۔ ہوا کا دیوتا [4] برن پانی کا دیوتا۔
[5] کبیر۔ دولت کا دیوتا [6] پرتھوی یعنی زمین [7] یعنی آگ کا دیوتا [8] آکاش یعنی خلا [9] اوشا۔ جمالِ صبح کی دیوی [10] سمادھی استغراق۔
[11] رات اور دن کے ملنے کا وقت

سنائی دیتی ہے مُرلی[1] کی دُھن اپنی ہی تانوں میں
پڑا کرتا ہے امرت[2] شُرتیوں[3] کا میرے کانوں میں

گُنوں[4] کے چکر[5] میں پاتا ہوں منظر راس لیلا کا
مُقدر جاگ اُٹھتا ہے مری چشمِ تماشا کا

نوائے ساز میں ہوتی ہے ضم آواز گھنگرو کی
مرے کانوں میں آتی ہے صدائے ناز گھنگرو کی

تصور پاؤں رکھ دیتا ہے پیشانی کے مرکز پہ
میں آجاتا ہوں کھینچ کر حسنِ لافانی کے مرکز پہ

ہوا ساتوں سُروں[6] کے بھیس میں بھرتی ہے دم میرا
نوا پروانہ ہو کر بول اُٹھتا ہے قلم میرا

میں اپنے نند نندن کرشن کو جب یاد کرتا ہوں

مطبوعہ کرشن نمبر تیج دہلی

[1] مُرلی۔ یعنی بانسری [2] امرت یعنی آب حیات [3] شُرتی۔ یعنی کلام الٰہی یا وہ کلمات جو عالمِ اشراق میں صادر ہوتے ہیں۔ [4] گُن۔ یعنی صفات [5] چکر یعنی چرخ [6] سُر یعنی ساز کا پردہ۔

رُباعی

واجب نہیں کوئی بات ایسی کرنا
ہے یہ تحقیر خود ہی اپنی کرنا
نیکی کا جو دعوےٰ ہے منوّر تم کو
دشمن سے بھی نہ بدسلوکی کرنا

خمکدۂ گیتا

کرے بیاں کوئی گیتا کا مرتبہ کیسے؟
یہ وہ کتاب ہے جس کا کہیں جواب نہیں

دل و دماغ کے جوہر سمائے ہیں اسمیں
مری نظر میں یہ وید کا انتخاب نہیں

ہوا ہے عالمِ اشراق سے نزول اس کا
جو آسماں سے ہو اُتری یہ وہ کتاب نہیں

سرودِ حق کو ہو کیوں احتیاج سازِ مجاز؟
یہ وہ صدا ہے جو شرمندۂ رباب نہیں

یہ لفظ لفظ سے دیتی ہے روشنی ہم کو
وہ ذرہ ذرّہ نہیں ہے جو آفتاب نہیں

لگی نہ آگ ہو جس میں بھلا وہ پانی کیا؟
سکوں نہیں وہ جو ہمدوشِ اضطراب نہیں

فنا کی آگ میں کیا خاک توفتا ہوگا؟
جو تیرے دل کے تموّج میں التہاب نہیں

ہو جبر خود پہ! مگر شانِ اختیار کے ساتھ
دگر نہ جبر ترا، جبرِ کامیاب نہیں

مہک سے اس کی بسا ہے دماغِ حُسنِ عمل
گلِ حیات کا یہ عطر ہے شباب نہیں

خلاف جوہرِ دریا ہے؛ ننگِ دریا ہے
وہ موج، موج نہیں جس میں پیچ و تاب نہیں

ہو بادہ نوشِ عمل؛ خُمکدہ میں گیتا کے
جو اس شراب سے ہے مست وہ خراب نہیں

گنگا

اک یمِ پاک ہے تو، نام ہے گنگا تیرا
آبِ حیواں ہے مجھے آبِ مصفّا تیرا

صفحۂ ارض پہ ہے نقش ہویدا تیرا
نقش پنہاں ہے سرِ عالمِ بالا تیرا

تری ہستی میں نہاں جوہرِ لافانی ہے
خاک ہمسر ہو جہاں میں کوئی دریا تیرا

تر زباں ویدِ مقدّس تری توصیف میں ہیں
خوب کھینچا ہے پرانوں نے سراپا تیرا

تو بڑھاتی ہی رہی حوصلہ بھاگیرتھ[1] کا
تیرے دیدار سے شاداں ہوا جویا تیرا

سرفرازی تجھے کیلاش پتی نے بخشی
پاؤں میں وشنو کے ہے مسکنِ زیبا تیرا

نظر آئی ہمیں گڈھ میں کبھی مکتیشور کے
دیکھا کاشی میں کبھی روپِ دل آرا تیرا

لطف سنگم کا بہم خطۂ پریاگ میں ہے
جادۂ پاک ہے ہم پہلوئے جمنا تیرا

لے لیا گود میں بنگال کی کھاڑی نے تجھے
عہدِ طفلی میں تھا کیلاش ہنڈولا تیرا

آریہ ورت کے خطّہ کو بنایا بے مثل
تا ابد یوں ہی تعلق رہے اس کا تیرا

تجھ سے تاریخ سلف ہند کی وابستہ ہے
داستاں اس کی وہی ہے جو ہے قصّا تیرا

رام تیرتھ کی سمادھی سے نہ پھر آنکھ کھلی
ڈوب جاتا ہے ترے عشق میں شیدا تیرا

جوشِ مستی میں ترا جھوم کے لہریں لینا
آہ وہ ناز سے انداز بدلنا تیرا

دور تر دامنی ہو جاتی ہے تیرے جل سے
پار دنیا سے لگاتا ہے کنارا تیرا

نہ کبھی دولتِ دیدار سے محروم رہوں
حُسن دیکھا ہی کرے چشمِ تمنّا تیرا

رہے جب تک مرا ویرانۂ ہستی میں قیام
مثلِ مجنوں مرے سر میں رہے سودا تیرا

تیرے پانی سے مری گردِ جہالت دھو جائے
اور مٹ جائے مرے دل سے یہ میرا تیرا

لکھنؤ۔ ۱۹۲۷ء

[1] راجہ بھاگیرتھ۔ ہندو پرانوں کی روایات کے مطابق دنیا میں گنگا جی کے ظہور کا باعث بھاگیرتھ کی ریاضت شاقّہ تھی۔

اضطرابِ دل

شعلہ زن سینہ، جگر بیتاب آنکھیں اشکبار مقتضائے دردِ دل نے کر دیا بے اختیار
ہے کشش کس کی مُنوّر رہزن صبر و قرار آج ہے چشم تصوّر کو یہ کس کا انتظار

دوڑ کر اک موج سی ہے آ رہی دل کی طرف
خود کھنچا جاتا ہوں میں جمنا کے ساحل کی طرف

آہ کس نے کر لیا پابستۂ زنجیرِ عشق بن گیا بیٹھے بٹھائے کس کا میں نخچیرِ عشق
چھیڑ دی کس نے مرے دل سے یہ دارو گیرِ عشق نعرہ زن ہیں رہروانِ جادۂ تسخیرِ عشق

جلوہ گر امروز شد محبوب محبوبانِ ما
آمد آمد در دلِ ما شاہد ارمانِ ما

آج چشمک زن ہے مہر و ماہ سے تقدیرِ حُسن اُف کن آنکھوں سے کروں نظّارۂ تنویرِ حسن
کھنچ گئی ہے صفحۂ گیتی پہ اک تصویرِ حُسن ہو گیا عشق جنوں انگیز دامن گیرِ حُسن

آج تک ایسا مُرقّع آنکھ نے دیکھا نہیں
یک قلم احسان اس پر رنگ و روغن کا نہیں

یہ تو پیارے کرشن کی گھنشیام کی تصویر ہے آہ اس میں دیوکی کے لعل کی تنویر ہے
اے مُنوّر آج میری اوج پر تقدیر ہے آج میں سمجھا کہ میری آہ میں تاثیر ہے

اب عیاں ثمرہ کئی راتوں کی بے خوابی کا ہے
آئینہ آنکھوں پہ حاصل دل کی بے تابی کا ہے

دیکھ کر یہ جلوۂ حیرت فزا ہیں ہوش دنگ — چڑھ گیا ہے بیخودی شوق میں وحدت کا رنگ
موج بحرآرزو گویا تھی جمنا کی ترنگ — چٹکیاں لیتی تھی دل میں وصلِ جاناں کی اُمنگ

نالۂ بیکس کو ممنونِ اثر فرما گیا
کرشن جو تھا کھینچنے والا وہ کھنچ کر آگیا

قطعہ

کیوں کسی کی بات سُننے سے تمہیں پرہیز ہے — کوئی جب نام خدا کانوں کی بیماری نہیں
کس لئے چیں بر جبیں ہو اختلاف رائے پر — وہ بھی انساں ہے کوئی جس میں رواداری نہیں

قطعہ

کس لئے یارب علاج دردوغم کرتا نہیں — ہوں میں جس سامان کا طالب بہم کرتا نہیں
یوں تو جب چاہا کیا شرمندۂ رحمت مجھے — کیوں مرے کہنے سے تو مجھ پر کرم کرتا نہیں

طنزِ لطیف

غلط کہ ہند کا ماضی تھا شاندار کبھی ۔۔۔ غلط کہ فخرِ دو عالم تھا یہ دیار کبھی
غلط کہ اوج پہ اس کا کبھی ستارا تھا ۔۔۔ کبھی یہ غیرتِ خورشید عالم آرا تھا
غلط کہ اس کو میسّر کبھی فراغت تھی ۔۔۔ بہم تھے عیش کے سامان نصیب راحت تھی
غلط کہ اس کی جبیں تابناک تھی پہلے ۔۔۔ یہ سرزمیں بھی مُقدّس تھی پاک تھی پہلے
کیا تھا صبحِ مسرّت نے کسبِ نور اس سے ۔۔۔ ہوئی تھی ظلمتِ شامِ ملال دُور اس سے
غلط کہ اس میں کبھی تھا گذر فرشتوں کا ۔۔۔ بجائے باغِ جناں تھا یہ گھر فرشتوں کا
غلط کہ ملک یہ روحانیت کا مخزن تھا ۔۔۔ غلط کہ یہ کبھی عرفانیوں کا مسکن تھا
محال ہے میں کروں صاد اس فسانے پر ۔۔۔ شرف کبھی اسے حاصل تھا اک زمانے پر

بیان عظمتِ ماضی دروغ بافی ہے
گناہ ایک یہ ناقابلِ تلافی ہے

غلط کہ اپنشدوں کا ہوا ظہور یہاں ۔۔۔ غلط کہ کُفر کی ظلمت ہوئی تھی دُور یہاں
مورخوں سے بڑی ہوگئی ہے بھُول اس میں ۔۔۔ کہ وید پاک نے فرمایا تھا نزول اس میں
غلط کہ بیاس بششٹ اس میں جلوہ گر تھے کبھی ۔۔۔ یہاں کناد کپل ایسے دیدہ ور تھے کبھی
یہاں ہوا ہو پرسرام ساجری پیدا ۔۔۔ یہاں ہوا ہو شہنشاہ بھرتری پیدا
یہاں ہوا ہو بھرت اور شترہن کا ظہور ۔۔۔ یہاں ہوا ہو کبھی رام لکشمن کا ظہور
کیا ہو پاک ہنومان سے جتی نے اسے ۔۔۔ دیا شرف ہو یہ ساوتری ستی نے اسے

لیا ہو جنم یہاں بھیم سے دلاور نے دکھائی ہو رہ صدق و صفا یدھشٹر نے
ہوا ہو خاک سے اس کی وجود بھیشم کا کرن کا درون کا ارجن سے مرد اعظم کا

کوئی یقین کرے کیا یہ داستان غلط
ہے اک یہ قصہ باطل ہر اک بیان غلط

غلط کہ تھا کبھی تیرا وجود بھی اے کرشن ترا قیام بھی تھا وجہ زندگی اے کرشن
غلط کہ تو کبھی پیدا ہوا تھا متھرا میں غلط کہ تو کبھی آیا تھا بزم دنیا میں
ہوئی شکست شب تار نور سے تیرے؟ ملا سکون دوامی ظہور سے تیرے؟
کسی کو قید بلا سے رہا کیا تو نے؟ کسی کو مژدۂ عیش و طرب دیا تو نے؟
معین بیکس و مظلوم اور تو ہو! محال! بچائی تو نے کسی کی بھی آبرو ہو! محال
نجات بخش دو عالم ہو اور تو! دشوار غلط کہ قدرت کامل کا تجھ سے ہو اظہار
غلط کہ راز عمل آئینہ کیا تو نے غلط کہ شیشۂ باطن پہ کی جلا تو نے
غلط کہ قادر مطلق کی شان تجھ میں تھی غلط کہ خالق برحق کی شان تجھ میں تھی

یہ بھاگوت کی کتھائیں نہیں فسانے ہیں
دروغ و کذب کے ان میں بھی کارخانے ہیں

اگر ذرا بھی صداقت ہے ان بیانوں میں اگر کتھائیں یہ شامل نہیں فسانوں میں
غلط نگار اگر بھگت سور داس نہیں تعلیوں پہ جو مبنی بیان ویاس نہیں
اگر یہ سچ ہے خبر گیر دو جہاں تو ہے اگر یہ سچ ہے کہ بھگتوں کا پاسباں تو ہے
اگر حفاظت مظلوم کام ہے تیرا جو دین[1] بندھو دیا سندھو[2] نام ہے تیرا
نگاہ لطف اگر کی تھی خستہ جانوں پر کیا تھا سایۂ رحمت جو دھر موا لوں پر
پناہ دی تھی جو دامن میں بے پناہوں کو سنا تھا تو نے اگر بیکسوں کی آہوں کو

[1] دین بندھو یعنی بیکسوں کا حامی [2] دیا سندھو یعنی دریائے رحمت۔

جو پانڈوؤں کی غلامی کا طوق اُتارا تھا
جو اُن کی ڈوبی ہوئی ناؤ کو اُبھارا تھا

ہر ایک بات کا ہم کو ثبوت دے آکر
پھر اپنی قدرت کامل سے کام لے آکر

دکھا کہ ہند کی ماضی میں شان کیسی تھی
وقار اس کا تھا کیا آن بان کیسی تھی

نہ غیر جب کوئی آوازہ اس پہ کستا تھا
غلام کوئی نہ جس وقت اس میں بستا تھا

جب اس کے اوج کا چرچا تھا اک زمانے میں
جب اس کا دخل تھا قدرت کے کارخانے میں

نہ تھے فسردہ و ناشاد اس کے باشندے
ہر ایک غم سے تھے آزاد اس کے باشندے

خوشی نصیب تھی غم اِن سے دُور رہتا تھا
رگوں میں اِن کی حمیّت کا خون بہتا تھا

نصیب پیشروی اس کو راہِ خیر میں تھی
جب اس کی دھاک جمی ہر دیارِ غیر میں تھی

جب اس کے نام پہ جانباز سر کٹاتے تھے
خود اپنے خون سے شاداب اسے بناتے تھے

دکھا وہ عہدِ فراغت یہ جب نہ تھا مغموم
دکھا وہ نقشِ مسرّت جو آج ہے معدوم

نگاہِ لطف پھر اس طرح تو جو فرمائے
ہر ایک بات کا مجھ کو یقین آ جائے

دہلی - ۱۹۳۵ء

رُباعی

شیطاں انہیں سمجھو جو ریا والے ہیں
حیواں اُنہیں جانو جو دغا والے ہیں

ہونے کو تو لاکھوں ہیں منوّر انساں
انسان وہی ہیں جو خدا والے ہیں

دہلی - ۱۹۳۸ء

شعلۂ فریاد

ترے دیدار کی حسرت میں ہیں ہم اشکبار آجا
تری رحمت کے ہم مدت سے ہیں اُمیدوار آجا
ہوئی جاتی ہے رخصت ہم سے تابِ انتظار آجا
چِھنی جاتی ہے ہم سے دولتِ صبر و قرار آجا
بڑھا کر دستِ رحمت پھر ہماری اشک شوئی کر
ہم اپنی بیکسی پر رو رہے ہیں زار زار آجا
ہے درماں منحصر تیرے کرم پر درد و کلفت کا
ہمارے غمگسار آجا، ہمارے راز دار آجا
ہماری غفلتِ دیرینہ شاید رنگ لائی ہے
ہمیں دُنیا میں کرنے کے لئے پھر ہوشیار آجا
خزاں کا دور دورہ ختم ہونے ہی نہیں آتا
ہمارے گلشنِ ہستی میں تو بن کر بہار آجا

دلوں میں پھونک دے پھر رُوح آکر، بانسری والے
جگا دے قوم کو نغمہ سُنا کر، بانسری والے

تجھے کچھ یاد ہے گیتا میں کیا ارشاد تیرا ہے
نہ تو نے گر خبر اس حال میں لی بس سویرا ہے
ڈیرا باندھے ہوئے مایوسیاں ہر سمت پلتی ہیں
جہاں تک آنکھ اُٹھتی ہے اندھیرا ہی اندھیرا ہے
جمائے ہیں مدت سے قدم ادبار نے اپنے
فلاکت نے گھروں میں ڈال رکھا اپنا ڈیرا ہے
تھی پہلے بُلبل و طوطی سے رونق جس گلستاں کی
وہاں تقدیر سے اب بوم و کرگس کا بسیرا ہے
پڑی ہے بھوت بن کر فاقہ مستی قوم کے پیچھے
پریشاں حالیوں کا رات دن بھارت میں پھیرا ہے
نظر آتا نہیں بچنے کا اس سے ایک بھی پہلو
مصیبت نے بلا بن بن کے کچھ اس طرح گھیرا ہے

جو آفت سر پہ نازل ہے اسے اب سہہ نہیں سکتے
یہی حالت رہی قائم تو زندہ رہ نہیں سکتے

ہے اس میں بھید کیا اے کرشن آخر بات کیا ہے یہ
ہمارے ساتھ کیوں گردوں کا ظلم ناروا ہے یہ

یہ مانا ہم نے ہم کو پھل ملا ہے اپنے کرموں کا
یہ مانا ہم نے اپنی ہی خطاؤں کی سزا ہے یہ

مگر کیا اس مرض سے اب رہائی ہو نہیں سکتی
سمجھ لیں کیا ہمیشہ کے لئے اب لادوا ہے یہ

ہوئیں صدیاں ہمیں پہنے ہوئے جامہ غلامی کا
نہیں لیتی کبھی جو نام رخصت وہ بلا ہے یہ

ہمیں اب تیرے گن گانے کی بھی مہلت نہیں ملتی
بٹھایا طاق پر تجھ کو بھی ہم نے، انتہا ہے یہ

ہمیں مل جائیں ٹکڑے چار خالی پیٹ بھرنے کو
یہ ہے مقصد اب اپنی زندگی کا مدعا ہے یہ

کسی صورت سے اس حالت میں کچھ پیدا تغیر ہو
ترے دربار میں اہلِ وطن کی التجا ہے یہ

عجب دردیست اندر دل کہ گر گویم زباں سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

دہلی - ۱۹۳۳ء

رُباعی

ہیں مسلکِ تسلیم و رضا کے بندے
ہیں ہم سے کہاں مہر و وفا کے بندے

یہ صبر و سکوں کی آزمائش کب تک
انساں ہم بھی ہیں اے خدا کے بندے

دہلی - ۱۹۴۸ء

مہاویر جنم

روح پر جب حملہ آور عقلِ حیوانی ہوئی — تیرگی میں کالعدم تہذیبِ انسانی ہوئی
آدمی جو تھا درندوں کا مُرقع بن گیا — وحشتِ دل باعثِ افعالِ شیطانی ہوئی
بیکسوں کی جان لینا دھرم میں داخل ہوا — خون کے پیاسوں کی دشواری میں آسانی ہوئی
بے گناہی کو گنہگاروں نے پسپا کر دیا — مٹ گئے شبھ کرم پاپوں کی فراوانی ہوئی
دیوتاؤں کو بھی ناحق کر لیا اس میں شریک — آئے دن کا شغل ذی روحوں کی قربانی ہوئی
چپّہ چپّہ پر ہوا بازار قربانی کا گرم — جان کی قیمت میں کچھ اس درجہ ارزانی ہوئی
رفتہ رفتہ جب مرض یہ اپنی حد سے بڑھ گیا — رونما اجزائے عالم میں پریشانی ہوئی
زلزلہ سا یک بیک ارض و سما میں آ گیا — دیدۂ قدرت کو اس منظر سے حیرانی ہوئی
کرم کا شاداب گلشن نذرِ صرصر ہو گیا — دھرم پر نازل بلائے خانہ ویرانی ہوئی
خارِ غم نے تارِ دل سے نوک کی لی اس طرح — ایک دنیا شکوہ سنج چاک دامانی ہوئی
مُسکرا کر صبح کی مانند اُبھری روشنی — تیرگی کی شام پر طاری پشیمانی ہوئی
رحم کا دریا سکوں کے ساتھ لہرانے لگا — چشمِ ساحل سے سبک ہر موجِ طوفانی ہوئی
نیکیوں کا ایک حلقہ سا نمایاں ہو گیا — اور اس میں جلوہ گر اک ذاتِ نورانی ہوئی
معجزہ فرما ہوئی اس کی نگاہِ التفات — ظلم کی جو آگ تھی اک آن میں پانی ہوئی
وردھمان اس کا لقب جن راج[1] تھا اس کا خطاب — عہد میں اپنے یہ ذاتِ پاک لاثانی ہوئی
کر دیا اک بار پھر زندہ اہنسا دھرم کو — وسعت آرائے جہاں تعلیمِ روحانی ہوئی

[1] جن راج لقب شری مہاویر سوامی کا ہے۔

اک اصول نو ہوا ظاہر بقاے روح کا　　آشکارا عظمتِ اسرار پنہانی ہوئی

کیا کوئی سمجھے گا اہمیت اہنسا دہرم کی
خاک اس کوچہ کی ہے جن راج[1] کی چھانی ہوئی

[1] جن راج لقب شری مہاویر سوامی کا ہے۔

دہلی۔

رُباعی

اُردو کی مخالفت میں کیا رکھا ہے　　ہندی کی مخاصمت میں کیا رکھا ہے

دونوں شیر و شکر ہوئی جاتی ہیں　　اب ذکر مغائرت میں کیا رکھا ہے

رُباعی

احساس پہ غیریت کے غالب ہو جائیں　　آئینہ ہر ایک کے مطالب ہو جائیں

ہندی ہندی رہے نہ اُردو اُردو　　دونوں اک جان اور دو قالب ہو جائیں

نند گاؤں

متھرا کی جان خطۂ ہندوستاں کی روح
اے نند گاؤں اے چمنِ دو جہاں کی روح

دل میں جگہ دیئے ہیں سما و سمک تجھے
کہتے ہیں چشمِ دہر کی ہم مردمک تجھے

تو مثلِ خال چہرۂ گیتی ہے آئینہ
تجھ سے جمالِ چہرۂ گیتی ہے آئینہ

تو گوشِ عافیت کا دُرِ شاہوار ہے
امراوتی کا تجھ پہ تقدّس نثار ہے

پاتے ہیں جانِ قالبِ دیر و حرم تجھے
جب دیکھتے ہیں دامنِ متھرا میں ہم تجھے

تیرے شرف کا راز ہے معصومیت تری
شرمندۂ مجاز نہیں منزلت تری

جپ جوگ کا ثمر تری پاکیزگی نہیں
رشیوں کے تپ کا تجھ پہ کچھ احسان ہی نہیں

برہما کا دل کہ وشنو کا سینا کہیں تجھے
کاشی کے دیوتا کی جبیں یا کہیں تجھے

کالندری[1] کی آنکھ کا تارا تو ہی تو ہے
جمنا کی زندگی کا سہارا تو ہی تو ہے

تو اک کنول کا پھول ہے سینے میں برج کے
یا شمع گل فشاں ہے سفینے میں برج کے

ماضی میں تیرے کرشن کے بچپن کا حال ہے
تو آشنائے رازِ فراق و وصال ہے

تو آئینہ ہے نند جسودھا کے قلب کا
تجھ میں ہے عکس شاہدِ متھرا کے قلب کا

تو در ہے خاص مے کدۂ روزگار کا
ارماں ہے جنّتوں کو بھی تیری بہار کا

تیری فضا میں گم اثر گرم و سرد ہے
سارے جہاں کا ایک ترے دل میں درد ہے

[1] کالندری یعنی جمنا

رُکمنی اور کرشن کے پریم کی عظمت

"ایک محبِ صادق نے جو راقم نظم سے مختلف عقائد رکھتے ہیں، رُکمنی کرشن کے باہمی پریم پر نظم لکھنے کی فرمائش کی۔ تاکید یہ تھی کہ نظم سے صرف رُکمنی جی کی شدّتِ انتظار ظاہر اور اس کے بعد جو شرم و ندامت کی داستان ہے، اُسے نظم میں نظر انداز کر دیا جائے۔ موضوع سے قریب تر رہتے ہوئے راقم نظم نے اُس "شرم و ندامت" کا جواب مخلصانہ اس نظم میں دیا ہے۔

اے عقلِ ہرزہ کار کے بہکائے تنگ ظرف
کہتا ہے جس کو شرم و ندامت کی داستاں
ہے جس پہ اتّہام طرازی کا تجھ کو شوق
ہے کرشن و رُکمنی کی محبّت کی داستاں

اس داستاں کو دیدۂ اہلِ نظر سے دیکھ
اس داستاں کو اُٹھ کے حدودِ جہاں سے پڑھ
ہوتی ہیں جس مقام پہ نبضیں خرد کی سلب
اس داستاں کو بہرِ خدا تو وہاں سے پڑھ

یہ داستانِ عشق ہے ذکرِ ہوس نہیں
لے اس میں تو نہ بحثِ چگون و چرا سے کام
تجھ کو یقیں نہ ہو تو کسی اہلِ دل سے پوچھ
پڑتا ہے اس میں آ کے بشر کو خدا سے کام

آتا ہے تیرے ظرف کی تنگی پہ مجھ کو رحم
تو کیا ہے تیری عقل کا پیمانہ چیز، کیا
کھول اپنے دل کی آنکھ سمجھتا جو ہو تجھے
ہے کرشن و رُکمنی کا یہ افسانہ چیز، کیا

اقبال کر گیا ہے کچھ آئینہ رازِ عشق
دُنیا بھی چھوڑ دے غمِ دنیا بھی چھوڑ دے
"اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے"

کر دے گی اس کو خاک دلِ رکمنی کی آگ
شتپال سنگِ جادۂ اُلفت بنے تو کیا
یہ بات صرف کرشن کی ہستی پہ ختم تھی
کوئی ادا شناسِ محبّت بنے تو کیا

اس بات کا تمہ لئے اندازہ ہے محال
کیا رکمنی کی شان ہے کیا ہے مقامِ کرشن
لیکن اگر ہے راز سمجھنا ہی یہ تجھے
ہو صدقِ دل سے طالبِ قُربِ دوامِ کرشن

پھر کرشن رکمنی کا فسانہ سمجھ میں آئے
کچھ روز پہلے عالمِ اشراق سے گذر
دونوں جہاں سے کام نہ باقی رہے تجھے
کونین سے بلند ہو آفاق سے گذر

لگتی ہے اس سے دل پہ منوّر کے سخت چوٹ
کہتا ہے اس کو شرم وندامت کی داستاں
معنی ہیں بحر و بر کی ہے وسعت لئے ہوئے
یہ کرشن و رکمنی کی محبّت کی داستاں

رُخ اس کا سوز و ساز کے مرکز کی سمت ہے
جو شمع بن نہ جائے وہ پروانہ ہی نہیں
تاکیدِ جذب ہے یہی تنبیہِ شوق ہے
جو کرشن کی نہ ہو کے رہے رکمنی نہیں

کیا کیا میں کہہ گیا ہوں جنوں میں خطا معاف
مبنی بنائے اُنس پہ میرا خطاب ہے
یہ عالمِ وجود یہ پہنائے کائنات
اک کرشن رکمنی کے فسانے کا باب ہے

تُلسی داس کی رامائن

خود بخود دہرِ وقت پیدا لطف پنہاں جس سے ہے
دیدۂ انساں میں نورِ شمعِ عرفاں جس سے ہے

نیّرِ علم و ادب دُنیا میں تاباں جس سے ہے
پائدار اب تک بنائے دین و ایماں جس سے ہے

کالعدم تاریکیاں ہیں جس سے بیم و یاس کی
ہے مُنوّر صرف رامائن وہ تُلسی داس کی

وید کی صورت[۱] سے واقف ہی نہیں اپنی نظر
شاستروں کے حکم کی ہم کو نہیں اصلا خبر

اپنشد کے راز سے اب تک نہیں ہم بہرہ ور
دل پر اپنے کچھ نہیں ہوتا پُرانوں کا اثر

کان ہیں نا آشنا اسمرتیوں کے نام سے
ہے مُنوّر ہم کو مطلب صرف ذکرِ رام سے

شاستر[۲] بھی اپنا یہی ہے وید بھی اپنا یہی
بھاگوت کہتے ہیں اس کو ہے ہمیں گیتا یہی

دُور کر دیتی ہے گردِ کلفتِ دنیا یہی
اور دیتی ہے پیامِ راحتِ عقبیٰ یہی

اس کی مشعل سے ہے روشن کارگاہِ زندگی
ہے یہ ہر صورت[۱] سے اپنی خضرِ راہِ زندگی

حرف لائے اس کی عظمت پر کسی میں دم نہیں
ایک دنیا اس کی شیدائی ہے خالی ہم نہیں

لفظ اس کا وید کے منترو[۳] سے کوئی کم نہیں
کون ہے جو اس کے سوز و ساز سے محرم نہیں

عشق و عرفاں کا تحیّر خیز گنجینہ ہے یہ
قلب تُلسی داس کا اک پاک آئینہ ہے یہ

---

[۱] [۲] [۳] سنسکرت کی زبان کے الفاظ ہونے کے باعث۔ ان الفاظ کی صحیح صورت قایم رکھی گئی ہے اور میں اسے جائز سمجھتا ہوں (مصنف)

شاعری دیکھو تو ہر ترکیب ہے وجد آفریں　موجزن ہے صفحۂ کاغذ پہ بحرِ انگبیں
ہے نشست الفاظِ شیریں کی نہایت دلنشیں　ہم کو یہ دعویٰ ہے اس کا مثل پیدا ہی نہیں

منزلت دنیا کے لٹریچر میں ہو حاصل اسے
پھر سر آنکھوں سے لگائیں کیوں نہ اہلِ دل اسے

جب پئے تحریر اٹھایا ہاتھ سے کلک رواں　طبع موزوں کا لیا سو سو طرح سے امتحاں
واہ وا تمہید میں کیا انکساری ہے عیاں　خم ادب سے پائے تلسی داس پر ہے آسماں

عاجزی کے واسطے دل کس قدر بیتاب ہے
شرم و غیرت سے زمین خلد بھی آب آب ہے

پھر جہاں سے داستانِ خاص کا آغاز ہے　پھر جہاں سے خانۂ رنگیں سخن پرواز ہے
فکر چرخِ ہفتمیں پر مائلِ پرواز ہے　عالمِ تحریر میں کیفیتِ اعجاز ہے

کیا دکھائے ہیں تعلق اس میں شکل و نام کے
رام سے بھی کچھ سوا ہیں وصف لفظِ رام کے

سایہ افگن سر پہ تھا مرشد کا دامانِ کرم　رحمتِ معبود سے حاصل ہوئی تابِ رقم
رام کے اذکار لکھنے پر تھا آمادہ قلم　کامرانی کے ہوئے سب خود بخود ساماں بہم

صفحۂ قرطاس پر جب آشکارا ہو گیا
جذبۂ عشقِ حقیقی عالم آرا ہو گیا

بزم کا ہے واقعہ یا رزم کا ہے نظم حال　فرق آ جائے روانی میں کہیں ہے یہ محال
وسط ہے یا خاتمہ ہے ہر جگہ ظاہر کمال　اس صحیفہ پر منوّر ہیں تصدق جان و مال

لفظ لفظ اس کا ہے یعنی پردۂ اسرارِ عشق
ہے تلاطم خیز اس میں قلزم ذخّارِ عشق

وجے دسمی

سر تریتا میں اُٹھایا جو ستمگاروں نے   آسمان ظلم کے توڑے جو سیہ کاروں نے
بے گناہوں کو ستایا جو گنہگاروں نے   شور فریاد جو برپا کیا دینداروں نے

نخل دسرتھ کے تپوبل[1] کا ثمر بار رہوا
قالب رام میں بھگوان کا اوتار رہوا

راجہ دسرتھ سے کہا گادھسون[2] نے یہ سوال   غیر ہے بدعت کفّار سے دیندار کا حال
رام لچھمن گئے ہمراہ پئے دفع ملال   جا کے صحرا میں کیا اہلِ جفا کو پامال

جگیہ رکھشا سے رشی جی کو مسرّت بخشی
دور افکار کئے امن کی دولت بخشی

عہدِ طفلی میں شجاعت کی نمایاں ہوئی شان   چھتری کل کی رکھی آ کے سری رام نے آن
کھیل ہی کھیل میں سر کر لئے لاکھوں میدان   جتنی دشواریاں رشیوں کی تھیں کر دیں آسان

کیوں ظفریاب نہ ہوتے یہ دھنی تیر کے تھے
دیوتا جتنے بھی تھے قبضہ میں رگھبیر کے تھے

شو دھنش کا جو سوئمبر میں ہوا معرکہ سَر   چھتری دھرم کا ظاہر تھا وہاں بھی جوہر
آن رگھوبنس کی رگھوبیر نے رکھ لی جا کر   حرف آنے نہ دیا جذبۂ خودداری پر

جیون آدھار[3] جنک راج دلاری کے بنے
پران پت جانکی متھلیش کماری کے بنے

---

[1] تپوبل۔ یعنی ریاضت [2] گادھسون یعنی وشوامتر جی [3] جیون آدھار یعنی مدارِ حیات

جب دھنش شو کا پرسرام نے ٹوٹا دیکھا
چشمِ پُرخوں سے سوئمبر کا نظارا دیکھا
رنگ ہوتے ہوئے محفل کا جو پھیکا دیکھا
نہ پرسرام سے رگھوبیر نے نیچا دیکھا

کر سکے بات وہ ان سے نہ مُقابل ہوکر
چل دیئے قدرت و اعجاز کے قائل ہوکر

دل پہ منقوش تھا منشائے ظہورِ عالی
ظلم کفّار کی تھی مدِّ نظر پامالی
باعثِ رنج تھی دنیا کی پریشاں حالی
دور کرنے کو اسے خود پہ مصیبت ڈھالی

چھوڑ کر تختِ شہی دشت نوردی کو چلے
دھرم رکھشا کے لئے بادیہ گردی کو چلے

جانکی جان کی مانند گئیں ہمرہ رام
لکشمن جی ہوئے بھائی کے شریکِ آلام
ہر نفس رام کی خدمت سے تھا سومتر[1] کو کام
رام سیوا سے نہ غفلت ہو، یہ تھی فکر مدام

خدمتِ رام ہی میں شکلِ مسرّت دیکھی
خواب میں بھی نہ کبھی خواب کی صورت دیکھی

بن میں پامال کیا رام نے ہر دشمن کو
نہ جُدا جان سے رکھتے تھے کبھی لچھمن کو
راہیِ ملکِ عدم کر دیا کھر دوکھن کو
کھیل بچّوں کا سمجھتے تھے یہ دونوں رن کو

چھتری دھرم کا اعجاز دکھایا کیسا
رام نے معرکہ جیتا تنِ تنہا کیسا

دستِ راون سے ہوئی اور بھی برپا بیداد
قید سیتا سے نئی طرزِ ستم کی ایجاد
مول لی آکے بداندیش نے خود جنسِ فساد
پڑ گئی جنگ کی اُس روز سے گہری بنیاد

فکر تھی جانِ تمنّا کی رہائی کے لئے
رام کے تیر مچلتے تھے لڑائی کے لئے

---

[1] سومتر۔ سومترا جی کے جگر بند یعنی لکشمن جی۔

جانکی جی کے تجسس میں تھے دونوں دل تنگ
مل گئے دشت میں آخر کو کپیشور بجرنگ

مشورہ سے ہوئے سگریو کے ساماں پئے جنگ
ہر سپہدار کے دل میں تھی لڑائی کی اُمنگ

جانکی جی کا ہنومان پتہ لے آئے
جا کے لنکیش کو پیغامِ وغا دے آئے

قید سیتا پہ تھا لنکیش کو حد درجہ غرور
خود پرستی نے کیا عقل و خرد کو مستور

صلح جوئی سے تھی خود بیں کی طبیعت جو نفور
رام سے جنگ ہر اک طرح تھی اس کو منظور

خوف دُنیا کا نہ تھا فکر نہ عقبیٰ کی تھی
خانۂ دل میں سیاہی شبِ یلدا کی تھی

جا کے لنکا میں سری رام کا اُترا لشکر
عرصۂ جنگ کا ہر سُو نظر آیا منظر

میان سے نکلے سپہداروں کے تیغ و خنجر
سرفروشی کے لئے لے کے چلے تیر و تبر

شعلہ زن آتشِ پیکار جہاں سوز ہوئی
رام راون سے غرض جنگ کئی روز ہوئی

خانداں والے ہوئے جنگ میں پہلے فی النّار
خود ہوا پھر وغا پھر شہہ لنکا تیار

پھونک دیتے تھے صفیں اسلحۂ آتشبار
ہوئے چڑھ چڑھ کے کمانوں پہ ہر اک سمت سے وار

صفت مارِ سیہ چار طرف تیر چلے
خوں بہانے کے لئے خنجر و شمشیر چلے

دونوں جانب کے سپہدار جری آئے کام
کوئی میدان سے ہٹنے کا نہ لیتا تھا نام

جو بہادر تھا گرجتا تھا برنگ ضرغام
دیکھتی تیغ پلٹ کر نہ تھی پھر سوئے نیام

حوصلے ہو گئے کفار کے پست آخر کار
ہو گئی راون خود بیں کو شکست آخر کار

گو دَرَن دھرم کی رو سے تھا برہمن لنکیش — تھا دلِ اہلِ جہاں خنجرِ بیداد سے ریش
رام نے قتل میں لیکن نہ کیا کچھ پس و پیش — سر پہ تھی خلق کے بیداد بہا بیش از بیش

نادم انجام پر اپنے ہوا راون کیسا
معصیت کی جو چلے راہ برہمن کیسا

رام کو فرضِ شناسی کا مُقدّم تھا خیال — کشتِ بیداد ہوئی فضل و کرم سے پامال
نہ چلی رام کے آگے کوئی لنکیش کی چال — دھرم کے سامنے ادھرم کا ٹھہرنا ہے محال

روزِ روشن کے مقابل شبِ یلدا ٹھہرے
سامنے گیان کے اگیان بھلا کیا ٹھہرے

ہندوؤ رام کے اوتار کا منشا سمجھو — رام لیلا کو نہ کچھ کھیل تماشا سمجھو
رمز ہے رام چرتروں میں نہاں کیا سمجھو — ہے سمجھنے کا انہیں گر تمہیں دعویٰ سمجھو

رام کا راج نہ تھا۔ تھی یہ عملداری فرض
رام اوتار سے لو درس پرستاری فرض

لکھنؤ۔ ۱۹۲۴ء

ہدیۂ نیاز

نظر آئے ہمیں تو کرشن کیونکر ۔ میسّر دیدۂ عرفاں نہیں ہے
بظاہر تو نظر آتا ہے پنہاں ۔ نظر والوں سے تو پنہاں نہیں ہے
ترے جلوہ کے نظّارہ گروں میں ۔ ہے ایسا کون جو حیراں نہیں ہے
تری عظمت کا اندازہ ہو کیسے ۔ کہیں اس بحر کا پایاں نہیں ہے
ترے ملنے کی شکلیں ہیں ہزاروں ۔ مگر ملنا ترا آساں نہیں ہے
ہوا انساں کی صورت میں ہویدا ۔ حقیقت میں مگر انساں نہیں ہے
مکمّل تیری بھگتی کے علاوہ ۔ کوئی مسلک کوئی ایماں نہیں ہے
اُسے کیا لطف حاصل زندگی کا ۔ جو تیرے لطف کا خواہاں نہیں ہے
ہے جولاں گاہ تیری قدرتوں کی ۔ بساطِ عالمِ امکاں نہیں ہے
جسے راہِ عمل تو نے دکھائی ۔ اُسے اندیشۂ عصیاں نہیں ہے
تری گیتا کے اُپدیشوں کا پابند ۔ گرفتارِ غمِ دوراں نہیں ہے
کوئی لاکھ اس کو زنجیروں میں جکڑے ۔ کہیں اس کے لئے زنداں نہیں ہے
ہے ایسا کون جو روزِ ازل سے ۔ ترا وابستۂ داماں نہیں ہے
ہے اک تیرے تصوّر کا مُرقّع ۔ یہ میرا دیدۂ گریاں نہیں ہے
ہے تیری پیشکش کو ہدیۂ دل ۔ مرا اشک سرِ مژگاں نہیں ہے
ہے تیرے پریم کی اک شمع روشن ۔ دلِ سوزاں دلِ سوزاں نہیں ہے
مُنوّر بھی ہو تیری ذات میں وصل
کوئی اس کے سوا ارماں نہیں ہے

حُبِّ وطن از مُلکِ سُلیماں خوشتر
خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

وطن پرستی

یہی سرمایہ اپنا ہے یہی ہے کائنات اپنی
اسی پر منحصر دنیا میں ہے ہر ایک بات اپنی

یہ آئینہ دکھاتا ہے ہمیں اُمّید کا جلوہ
وطن کی فارغ البالی میں پنہاں ہے نجات اپنی

اسی کے نذر ہے ایک ایک لمحہ زندگانی کا
نہ کوئی دن ہے دن اپنا نہ کوئی رات رات اپنی

پسند آئے نہ کیوں ہم کو پرستارِ وطن ہونا
اسی کے دم سے وابستہ ہے موت اپنی حیات اپنی

دہلی - ۱۹۳۷ء

صدقہ

باغباں باغ کے بلبل ہی چمن کے صدقے
ہیں فدا قوم پہ اور اپنے وطن کے صدقے

چاک سینہ ہے جدائی میں وطن کی ان کا
جان و دل سے ہیں لآلی عدن کے صدقے

جن کی نکہت سے معطر ہے مشامِ عالم
ہوں میں فیاضی نسرین و سمن کے صدقے

ایک ادنیٰ سا ہے یہ معجزہ حُبِّ وطن
ہے ختن مشک کے اور مشک ختن کے صدقے

ہیں فدا اس کماری پہ ہمالہ پہ نثار
ہیں فدا ہند شمالی پہ دکن کے صدقے

آریہ ورت بنا گلشنِ شاداب ان سے
پاک سرجو پہ فدا گنگ و جمن کے صدقے

روح ہوتی ہی نہیں وقفِ تناسخ ان کی
جو اتر جاتے ہیں قوم اور وطن کے صدقے

الفتِ قوم سمائی ہوئی ہر لفظ میں ہے
اے منور ہیں ترے رنگ سخن کے صدقے

مطبوعۂ رسالہ نظارہ لاہور
۱۹۱۷ء

مُبارک آرزو

حُبِّ وطن کے راگ الاپے جو ہر نفس　　یارب زباں ملے وہ دہن وہ ملے مجھے

جس کا ہر ایک تار ہو سررشتۂ وفا　　مرنے پہ اوڑھنے کو کفن وہ ملے مجھے

جس میں نہ غیر ملک کی مٹّی کا جزو ہو　　جس میں ہو خاک ہند کی تن وہ ملے مجھے

پیراہن وطن کی ہو زینت پہ جس کو ناز　　اے ضامن لباس بدن وہ ملے مجھے

سینہ ہو جس کا چاک وطن کے فراق میں　　بحر جہاں میں دُرِّ عدن وہ ملے مجھے

بُلبل صفت ہوں جس کی محبّت میں بیقرار　　رہنے کو بوستاں وہ چمن وہ ملے مجھے

دی جائے جو محُبّ وطن کی زبان سے

میں چاہتا ہوں دادِ سخن وہ ملے مجھے

مطبوعہ رسالہ نظّارہ لاہور ۱۹۱۷ء

ہندو مسلمانوں سے

کیوں عقل کے دشمن بنتے ہو جس سے ہو بھلا وہ کام کرو
مطلب کے لئے ناحق لڑ کر مذہب کو نہ تم بدنام کرو

پھر صلح و امن کا دور آئے پھر اہلِ وطن انسان بنیں
یہ جنگ جو ملک میں جاری ہے اب اس کا بخیر انجام کرو

یہ خون روا مذہب میں نہیں تم اپنی کتابوں میں دیکھو
ابنائے وطن کی گردن پر یوں تیز نہ اب صمصام کرو

کی حاصل خاک نہ آزادی لی مول متاعِ بربادی
جو تم پہ جہاں نے رکھا ہے اب سر سے دور الزام کرو

یہ لڑنا بھڑنا بند کرو ہو لہر رواں آزادی کی
یہ دولت ہاتھ جب آجائے پھر چین کرو آرام کرو

غریب الوطنی

سنہ ۱۹۱۷ء

قفس میں عندلیبوں کو چمن کی یاد آتی ہے
وطن سے چھوٹ کر ہم کو وطن کی یاد آتی ہے

ٹپک پڑتے ہیں چند آنسو ہمیں فرطِ حسرت سے
ہمیں جب قوم کے عہدِ کہن کی یاد آتی ہے

کبھی جلوہ فگن تھے آہ اسلافِ وطن جس میں
اب اِس ویرانہ میں اُس انجمن کی یاد آتی ہے

جگر افگار ہوتے ہیں گھر اندوہ فرقت میں
عدن سے چھوٹ کر ان کو عدن کی یاد آتی ہے

مُنوّر ہچکیاں آتی نہیں وحشت غربت میں
مُجھے رہ رہ کے گلزارِ وطن کی یاد آتی ہے

"تمام عمر خدایا وطن پرست رہوں"

بساطِ دہر میں لذّت کشِ تمنّا ہوں
ازل سے آج تک اپنے وطن پہ شیدا ہوں
نہ کیوں زباں پہ ہوں نعرہ ہائے مستانہ
میں جب سے مست سخن ہوں سخن سراپا ہوں

جنونِ عشقِ وطن ہو، اسی میں مست رہوں
تمام عمر خدایا وطن پرست رہوں

وطن کے عشق کی مستی سوار رہتی ہے
وطن کی دُھن مجھے لیل و نہار رہتی ہے
سمایا قوم پرستی کا دل میں سودا ہے
فدا وطن پہ مری جان زار رہتی ہے

جنونِ عشقِ وطن ہو، اسی میں مست رہوں
تمام عمر خدایا وطن پرست رہوں

وہ مست ہوں کہ خودی کا رہا نہ ہوش مجھے
وہ مست ہوں کہ چڑھا بیخودی کا جوش مجھے
میں سوچتا ہوں کہ کیسے وطن کے کام آؤں
نہ بدگماں ہو کوئی دیکھ کر خموش مجھے

جنونِ عشقِ وطن ہو، اسی میں مست رہوں
تمام عمر خدایا وطن پرست رہوں

ہر اک نفس ہے مجھے مادرِ وطن کا خیال
حقوق اس کے نہ میرے سبب سے ہوں پامال
وطن کا عشقِ مقدّس مجھے نصیب ہوا
نہ مجھ سا دہر میں پیدا ہوا خجستہ خصال

جنونِ عشقِ وطن ہو، اسی میں مست رہوں
تمام عمر خدایا وطن پرست رہوں

وہ میرے دل کو خدا دے جو عشق سچا ہو　　رہوں میں قوم کا شیدا یہ سر میں سودا ہو
خیال دل سے فراموش ہو نہ خدمت کا　　یہی ہوس یہی خواہش یہی تمنا ہو

جُنونِ عشقِ وطن ہو، اسی میں مست رہوں
تمام عُمر خدایا وطن پرست رہوں

وطن کا عشق ہی مشرب مرا مدام رہے　　غرض ہو قوم سے مجھ کو، وطن سے کام رہے
میں گاؤں راگ ہمیشہ وطن پرستی کے　　لبوں پہ صرف یہی گیت صبح و شام رہے

جُنونِ عشق وطن ہو، اسی میں مست رہوں
تمام عُمر خدایا وطن پرست رہوں

ہوئی ہوئی وہ طباشیر ریز صبحِ اُمید　　طلوع گوشۂ مشرق سے ہوگیا خورشید
صدا یہ دیر و حرم سے ہے آرہی پیہم　　ہر ایک لب پہ یہی ہیں ترانہ ہائے سعید

جُنونِ عشقِ وطن ہو اسی میں مست رہوں
تمام عمر خدایا وطن پرست رہوں

مطبوعہ نظارہ۔ لاہور ۱۹۱۷ء

قطعہ

فنا کی تہ میں کیا اسرار ہیں رازِ بقا کیا ہے؟　　بنانے کارسازِ دو جہاں کا مدعا کیا ہے
کسے کہتے ہیں راحت کیوں ہیں ساماں رنج کے پیدا　　بہشت و نار کیا شے ہیں جزا کیا ہے سزا کیا ہے؟

مُلک کی موجُودہ حالت

اٹھا کدھر سے یہ گرد و غبار کا طوفاں
تباہیوں کے ہیں درپیش ہر طرف ساماں
شکار باد مخالف ہے نخل امن واماں
کہ آج ہند میں انساں ہیں دشمنِ انساں
بھٹک گئے ہیں یہ حیوانیت کے صحرا میں
نہا رہے ہیں یہ نفسانیت کے دریا میں

یہ کیوں بخار جہالت میں ہوگیا سرسام
دواؤں سے نہ ہے چلتا نہ کچھ دعاؤں سے کام
مرض کہیں نہ یہ لایا ہو موت کا پیغام
ہے یاس خیز نگاہوں میں صورت انجام
یہ برہمی ہے اگر قومیت کے اجزا میں
ملیگی خاک بھی اس کی کبھی نہ دنیا میں

حواس وہوش سے بیگانہ عقل و فہم سے دور
سمجھ میں ان کی کہاں سے یہ آگیا ہے فتور
دلوں سے ہوگئی تنویرِ معرفت کافور
خدا ہی جانے کہ آخر ہے کیا انہیں منظور
بہانہ گو ہے بظاہر خدا پرستی کا
مگر خیال ہے در پردہ چیرہ دستی کا

کسی کو عید کی آمد سے احتراز ہے آج
نوائے بوم کسی کو صدائے ساز ہے آج
کسی کے وعظ میں تلقین حرص و آز ہے آج
کسی کا شبد محبت سے بے نیاز ہے آج
کوئی بتائے کہ آخر یہ ردّ و کد کب تک
یہ شوق جنگ وجدل کینہ وحسد کب تک

یہ آہ رسم و رہ ارتباط بھول گئے — وہ میل جول یہ وہ اختلاط بھول گئے
وہ دَور لطف وہ عہدِ نشاط بھول گئے — فسانۂ طرب و انبساط بھول گئے

ہے فتنہ روز نیا روز واردات نئی
نکال لیتے ہیں لڑنے کو ایک بات نئی

نہ ہندوؤں کو رہا اپنے دہرم کرم سے کام — نہ حق پرست رہے ہے آج پیرو اسلام
یہ اپنے دہرم کا کچھ سوچتے نہیں انجام — وہ اپنے دین کو کرتے ہیں مفت میں بدنام

نہیں خیال کسی کو بھی نیکنامی کا
گلے سے طوق اُترتا نہیں غلامی کا

نظر کرم کی ہو ان پر اب اے خدائے کریم — یہ آئیں ہوش میں دے ان کو ابھی عقلِ سلیم
وطن سے دور ہو یہ حالت ہراس و بیم — دل و جگر ہیں فدایانِ حرّیت کے دونیم

یہ مل کے سعی کریں پھر برائے نجاتِ وطن
کہ اتفاق ہی ان کا ہے کائناتِ وطن

مطبوعہ اودھ اخبار۔ لکھنؤ

رُباعی

شعلہ کی طرح ادھر لپکتا کیوں ہے؟ — صورت سے چمن کی تو بھڑکتا کیوں ہے؟
کانٹے کی طرح تیری نظر میں گلچیں — ہر پھول گلستاں کا کھٹکتا کیوں ہے؟

وطن فروش سے خطاب

روش یہ کیا ہے تری اے وطن فروش بتا
مرے سوال پہ ہے کس لئے خموش بتا

نہ بند بہر خدا بار بار آنکھیں کر
ادہر تو دیکھ ذرا مجھ سے چار آنکھیں کر

مجھے جواب تو دے، کچھ نہ ٹال باتوں میں
ہے کس قدر تجھے حاصل کمال باتوں میں

ترے کلام کی طاقت کو مانتا ہوں میں
غضب کا تو ہے مُقرّر یہ جانتا ہوں میں

ہے لاکھ زورِ قلم کا بھی اعتراف تجھے
مگر ہے تیرے عقائد سے اختلاف مجھے

تری روش سے شکارِ ملال و رنج ہوں میں
مگر زبانِ محبت سے شکوہ سنج ہوں میں

وہ ہاتھ جن کو نظامِ جہاں بدلنا تھا
زمیں کے ساتھ رُخ آسماں بدلنا تھا

وہ ہاتھ دستِ دعا، آہ، جن کو ہونا تھا
شریکِ صدمہ جانکاہ جن کو ہونا تھا

وہ ہاتھ بندِ اسیری کے توڑنا تھے جنہیں
وہ ہاتھ خنجرِ خونبار موڑنا تھے جنہیں

ہزار حیف کہ مظلوم سے کشیدہ ہوں
کسی برادرِ معصوم سے کشیدہ ہوں

ہزار حیف کہ نامنصفوں کو تھپکی دیں
نہ یہ کہ بیکس و مظلوم کو تسلّی دیں

وطن فروش! وطن کا خیال کچھ تو ہے
نظر میں طول امل کا مآل کچھ تو ہے

غرض پرست یہ دیوانگی غرض کے لئے
خود اپنی قوم سے بیگانگی غرض کے لئے

تری زباں پہ تو رہتی ہے گفتگوئے وطن
مگر نہیں تجھے پروائے آبروئے وطن

تجھے وطن کی پرستش کا یوں تو دعویٰ ہے
وطن کے نام کی مالا مدام جپتا ہے

سرِ آستانِ وطن پر ہے گو جُھکائے ہوئے　　　اس آئینہ کو ہے سینے سے تو لگائے ہوئے

مگر ہے اور ہی کچھ راز اس پرستش کا
ہے ایک "وزد نوا" ساز اس پرستش کا

یہ اور بات ہے تو کامیاب مقصد ہے　　　ترے کفیل کا احسان تجھ پہ بے حد ہے
یہ اور بات ہے اقبال ہے غلام ترا　　　خدا کے فضل سے جاری ہے آج کام ترا
مگر شکایت اہلِ وفا یہ کیا معنی؟　　　مگر حمایت جور و جفا یہ کیا معنی؟
ستم کشوں کی فغاں سے جبیں پہ بل کیوں ہیں　　　جو ہاتھ دست حمائت تھے آج شل کیوں ہیں
بلاکشانِ وطن سے کشاں کشاں کیوں ہے　　　پسند شرکت بیدادِ آسماں کیوں ہے
فریب نقرۂ زر کا شکار تو کیوں ہے　　　وطن کو بیچ کے محروم آبرو کیوں ہے
یہ خون اہلِ وفا سے فراغ بال ہے کیوں　　　یہ خون اہلِ وفا پر زبان لال ہے کیوں
جفا و ظلم کا دنیا میں تنگ امکاں کر　　　لبوں کو جبر کی تائید میں نہ جنباں کر
خدا کے سامنے تجھ کو جواب دینا ہے　　　تمام فردِ عمل کا حساب دینا ہے

طریقِ زشت سے آبازِ سفلہ کوش نہ بن
عزیز، بہرِ خدا اب وطن فروش نہ بن

رُباعی

قیدِ غم سے نجات پائی ہم نے　　　بے موت جو ہے حیات پائی ہم نے
کھویا جو پئے خدا متوّر خود کو　　　اپنی ہی یہ کائنات پائی ہم نے

افراط و تفریط

ہوگیا درہم و برہم ادبستانِ وطن
بے خبر ہو گئے تہذیب سے یارانِ وطن
نذرِ سیلابِ فنا ہے سر و سامانِ وطن
آہ اک آن میں کافور ہوئی شانِ وطن

درس دیتے ہیں شب و روز دلآزاری کا
کہ سبق بھول گئے ہیں یہ وفاداری کا

بن گیا حرفِ غلط تربیتِ نفس کا ذوق
اف یہ تقلید بہائم کا فنا پرور شوق
اب ہے صحرا کے درندوں پہ انہیں حاصل فوق
کہ نہیں زیبِ گلو خوبیٔ اخلاق کا طوق

کھولے بیٹھے ہیں ورق جنگ کے افسانے کا
غم نہیں رسم و رہ اُنس کے مٹ جانے کا

شعلۂ رشک و حسد نے ہے دلوں کو پھونکا
رنگ رخ جس کی بلندی سے ہے فق گردوں کا
دل جو بندہ ہوا عقل و خرد و اژدوں کا
آج ایک ایک نظر آتا ہے پیاسا خوں کا

لب سے دشنام کی بوچھار رہا کرتی ہے
ہاتھ میں قتل کو تلوار رہا کرتی ہے

پھر ہمیں خون رلاتا ہے وطن کا نقشہ
کتنا جاں سوز ہے اس بزمِ کہن کا نقشہ
صفحۂ دل پہ کھنچا رنج و محن کا نقشہ
کیسا بگڑا ہے الٰہی یہ چمن کا نقشہ

روح مسرور نہیں زمزمۂ بلبل سے
آشنا کان ہوئے زاغ و زغن کے غل سے

کیسے عنقا ہوئے اخلاص و محبّت کے چلن آج ہمسایہ کا ہمسایہ ہے جانی دشمن
دل کہ پہلے تھا شگفتہ صفت باغِ عدن کرگس و بوم کا وہ آج بنا ہے مسکن

ظلم گردوں سے نہ کچھ جورِ مُقدّر سے ہوا
یہ چمن نذرِ خزاں موجۂ صرصر سے ہوا

نہیں دشوار کہ پھر مُلک کا منظر بدلے کھنچے تصویرِ اماں، نقشۂ محشر بدلے
رو خیالات کے دریا کی سراسر بدلے مادرِ ہند کی تحریرِ مُقدّر بدلے

شیشۂ دل میں جو پیدا ہے کدورت مِٹ جائے
کجروی جادۂ پامال کی صورت مِٹ جائے

تابکے اب یہ بہم دست و گریباں ہونا چھوڑ کر راہِ خدا، پیروِ شیطاں ہونا
مغفرت بخش نہیں دشمنِ ایماں ہونا نوعِ انساں سے عیاں فطرتِ حیواں ہونا

نہ اگر ہوش میں ابنائے وطن آئیں گے
کفِ افسوس ملیں گے کبھی پچھتائیں گے

مطبوعہ ماہ نیم ماہ ۳۹ ۶۱۹

کائستھ انسٹیٹیوٹ کی عمارت

مدتوں خانہ خرابی سے رہے ناشاد ہم
باغِ ہستی میں تھے مثلِ نکہت برباد ہم
ہر نفس رکھتے تھے شغلِ نالہ و فریاد ہم
اک نہ اک طرزِ فغاں کرتے رہے ایجاد ہم

ہم وہ تھے مرغِ چمن جس کا نشیمن ہی نہ تھا
کیا کہیں حاصل سکوں ہوتا کہ مسکن ہی نہ تھا

غیر کے محتاج رہنے سے ندامت تھی بہت
بے مکاں ہونے سے افسردہ طبیعت تھی بہت
روح کو خانہ بدوشی سے اذیت تھی بہت
ایک خاص اپنی عمارت کی ضرورت تھی بہت

دل میں ہر دم آگ گو اس سے سلگتی ہی رہی
تنگ دستی مانعِ تکمیلِ خواہش ہی رہی

فرض کا احساس جب ممنونِ بیداری ہوا
جذبۂ دل رونمائے گرم بازاری ہوا
رفتہ رفتہ سلسلہ تعمیر کا جاری ہوا
رحمتِ حق سے ظہورِ چار دیواری ہوا

سر پرستوں نے بڑھایا دستِ استمداد بھی
ڈال دی جسٹس بشیشور ناتھ[1] نے بنیاد بھی

وہ[2] جمود درسیانی کا زمانہ آہ آہ
اس کے ہاتھوں خونِ عنوانِ فسانہ آہ آہ
بے دلی کا بن گئے جب ہم نشانہ آہ آہ
ہو گیا پیدا تغافل کا بہانہ آہ آہ

کچھ خیال اس کا نہ لیکن جذبِ کامل نے کیا
روشناس حدِ منزل شوقِ منزل نے کیا

[1] افسوس کہ قوم کا یہ عالی دماغ بزرگ بھی دنیا سے اٹھ گیا۔ [2] اس بند میں ایک نہایت قابلِ افسوس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کے باعث انسٹیٹیوٹ بلڈنگ فنڈ کی پہلی رقم کھٹے میں پڑ گئی تھی۔

کارگر احباب کی تدبیر آخر ہو گئی
آشکارا خواب کی تعبیر آخر ہو گئی
رنگ و روغن سے عیاں تصویر آخر ہو گئی
اک عمارت اپنی خود تعمیر آخر ہو گئی

بارور حسنِ عمل سے خواہشِ دیرینہ ہے
اینٹ اینٹ اس کی خلوصِ قلب کا آئینہ ہے

انسٹیٹیوٹ اپنے ہر محسن کا ہے منت گذار
جن کے دم سے پائداری کا ملا ہے افتخار
حوصلہ افزا ہے کیسی صورت انجام کار
اور بھی بڑھ جائے گا اب قوم میں اس کا وقار

مہرباں ہو جائیں گے ہم پر، ہمیں اپنائیں گے
سرپرستی اور بھی اہلِ کرم فرمائیں گے

قطعہ

بنا ہے عقل و آگہی کا دشمن آہ کس لئے
اسیرِ دامِ گمرہی ہے قلبِ نامراد کیوں

فضول زک اُٹھائے گا نہ کچھ بھی ہاتھ آئیگا
یہ حرص کیوں ہوس یہ کیوں یہ بغض یہ عناد کیوں

عبث یہ تنگ کر رکھی ہے خود یہ اس نے زندگی
لیا ہے مول آدمی نے مفت یہ فساد کیوں

اگر ہے عیش دائمی کی اس کے دل میں آرزو
جو ذات کردگار ہے کرے نہ اس کو یاد کیوں

نالۂ بیکس

چھوڑتا ہی نہیں پیچھا فلک شعبدہ باز
کہ بدلتا ہی نہیں اس کی روش کا انداز
ہے شب و روز وہی مشغلۂ سوز و گداز
کس گھڑی دورِ تباہی کا ہوا تھا آغاز
کوئی تدبیر درستی کی نکلتی ہی نہیں
حالت اس درجہ ہے بگڑی کہ سنبھلتی ہی نہیں

فیضِ صحت سے جو محروم ہے آزارِ وطن
حالت نزع میں صدیوں سے ہے بیمارِ وطن
ایک نسخہ نہ ہوا حیف سزاوارِ وطن
زندگی بھی نظر آتی ہے گرانبارِ وطن
ضعف اتنا ہے کہ لیتا نہیں انگڑائی بھی
کام کرتا نہیں اعجاز مسیحائی بھی

روشنی ایسی ہوا چشم بصیرت سے ہوئی
روح قالب میں ہم آغوش جہالت سے ہوئی
منحرف جادۂ اخلاص و محبت سے ہوئی
منزلوں دور یہ فردوس حقیقت سے ہوئی
راہ پر آ کر مقدر نے وہ کھایا پلٹا
اور بھی گلشن تدبیر کا تختہ پلٹا

بدگمانی کے شراروں سے بدن خاک ہوا
خون ناحق کا رواں قلزم ناپاک ہوا
عرق شرم سے تر دامنِ ادراک ہوا
دشتِ وحشت سے گریبانِ وطن چاک ہوا
کاٹ کر اپنے ہی اعضائے بدن جیتے ہیں
خونِ معصوم دواؤں کی جگہ پیتے ہیں

کچھ نہ درماں کا خیال اور نہ پرہیز کا ہے
پھل پسند آج بہت خنجر خونریز کا ہے
عمل اس باغ میں اک فصل جنوں خیز کا ہے
ایک جھونکا یہ ہوائے ستم انگیز کا ہے
خس و خاشاک کا اک ڈھیر یہ گلزار بنا
جس سے پھولوں کی لطافت تھی عیاں خار بنا

گوشت سے پوست سے یہ جسم تھا یوں نہیں محروم
ہڈیوں سے بھی ہے اب جوہر ہستی معدوم
سبق آموز ہے افکار و مصائب کا ہجوم
ہو گیا اُلفت باطل کا نتیجہ معلوم
کام ظاہر سے ہو گیا صاف جو باطن ہی نہیں
وصف پتھر میں ہو آئینے کے ممکن ہی نہیں

ذات اقدس کا ابھی تک ہے سہارا ہم کو
پار اُتارے گی جہاں سے تری گیتا ہم کو
بخشتی ہی نہیں اے کرشن یہ دنیا ہم کو
خوں رُلاتا ہے غم و رنج کا نقشا ہم کو
جلوۂ پاک نگاہوں سے نہ مستور رہے
خانۂ دل تری تنویر سے معمور رہے

ہوش آجائے مئے عیش کے مستانوں کو
آگہی راز حقیقت سے ہو دیوانوں کو
شمع مقصد ہو عطا ملک کے پروانوں کو
خاک میں چرخ ملائے نہ اب ارمانوں کو
واسطہ اہل وطن کو نہ ہو دل تنگی سے
آشنا گوش رہیں ساز ہم آہنگی سے

جاودانی ہے وصیت ہمیں پیغام ترا
ہے سفینہ یم دنیا کے لئے نام ترا
ہر طرف دہر میں ہے فیض و کرم عام ترا
دل میں رہتا ہے تصور سحر و شام ترا
دھمکیاں موت کی دیتا ہے اب آزار وطن
جلد اے کرشن شفایاب ہو بیمار وطن

کچھ بھی گر جذبۂ شاعر میں ہے باقی تاثیر — راس آجائے گی اک روز وطن کی تقدیر
قلعۂ حلقہ بگوشی کبھی ہوگا تسخیر — ٹکڑے ٹکڑے نظر آئے گی فنا کی زنجیر

گلشن راحت باقی کی ہوا کھائیں گے
ہم ترے دامن رحمت میں اماں پائیں گے

قطعہ

منوّرؔ غور سے اس پہ نظر کر — ہے عبرت زا مآل خود پرستی
ہوا ہے ناخن غم سے جگر چاک — سپرد خاک ہے ظالم کی ہستی
گرزتی ہے گراں اتنی ہی آخر — ہو جتنی جنس جور و ظلم سستی
یہ اپنے حق میں خود ہی اک بلا ہے — ہے اس کے اوج کا خمیارہ پستی
ضرور اک روز شل ہو جائیں گے ہاتھ — کہاں تک ظالموں کی چیرہ دستی

نظر میں مور کی طاقت نہیں کیا
برنگ پیل آخر کیوں یہ مستی ؟

یومِ اُردو

منزلِ اوج پہ لہرائے نشانِ اُردو
ہر شرف کی ہے سزاوار زبانِ اُردو

اُن بزرگوں کے قدم اہلِ ارم لیتے ہیں
جن کے ہاتھوں ہوئی تعمیر مکانِ اُردو

زاویہ اپنی نگاہوں کا بدل دینا ہے
نظر آئے نہ کوئی دشمنِ جانِ اُردو

گردشِ دہر سے لازم ہے تحفظ اس کا
خاک و خوں میں نہ ملے جنس گرانِ اُردو

اس میں ہیں ایک زمانے کی زبانیں شامل
خوب ہے اپنی جگہ طرزِ بیانِ اُردو

کام سے اپنے جو دنیا میں اسے کام رہا
مٹ سکے گا نہ کبھی نام و نشانِ اُردو

ہوں تو ابوں میں وہ اب حُسنِ عمل سے تبدیل
جن عذابوں میں گرفتار ہے جانِ اُردو

اپنی مستانہ خرامی سے قیامت ڈھائے
موجِ طوفاں نہ بنے سیل روانِ اُردو

اس کی توسیع پہ ہے زندگی اس کی موقوف
تنگ دنیا پہ نہ ہو کاش زبانِ اُردو

سیر اس نعمتِ عظمیٰ سے منوّر ہوں میں
ہے میسّر شرف شرکت خوانِ اُردو

اچھوت اُدّھار

جمی تھی دھاک کبھی اپنی ایک عالم پر — کمال واوج میں قطب فلک کے تھے ہمسر
سمائی سر میں ہوائے غرور آہ مگر — قدم زمیں پہ بھی رکھنا ہمیں ہوا دوبھر
ہمارے زعم ورعونت کی انتہا نہ رہی
تھا ناز جس پہ وہ انسانیت ذرا نہ رہی

سفر میں رہ گئے پیچھے جو کچھ شریک سفر — سمجھ لیا انہیں زعمِ کمال سے کمتر
علیحدہ ہوئے کچھ اس طرح بدگماں ہوکر — پھر اس کی سمت نہ دیکھا کبھی اُٹھا کے نظر
تعلق ازلی تھا جو اس کو توڑ دیا
سمجھ کے قابل تحقیر ان کو چھوڑ دیا

غرور اوج کا سر پر چڑھا ہوا تھا بھوت — جو بھائی دھرم کے رشتہ سے تھے بنے وہ اچھوت
ہماری طرح جو تھے مادر وطن کے سپوت — پسند آئی یہ ان کے لئے ہمیں کرتوت
سلوک انس ومحبت پہ ہاتھ صاف کیا
جو دھرم کی تھی روش اس سے انحراف کیا

جو قومیت کے مکاں میں ہیں سنگِ بنیادی — انہیں کی مد نظر ہے مدام بربادی
نہ رسم وراہ نہ ہے شرکت غم وشادی — خدا کے سامنے ہیں اب اچھوت فریادی
سنو سنو کہ زبانوں پہ کیا دعائیں ہیں
ڈرو ڈرو کہ غریبوں کی یہ صدائیں ہیں

ہیں پھول یہ بھی ریاضِ جہاں میں خار نہیں ہیں دھرم کرم سے واقف گنہگار نہیں
بشر ہیں ان کا بہائم میں بھی شمار نہیں کسی خیال سے بھی یہ ذلیل و خوار نہیں
زیادہ ہم سے یہ مہر و وفا کے بندے ہیں
برادرِ ازلی ہیں خدا کے بندے ہیں

کبھی یہ حُسنِ عقیدت دکھا نہیں سکتے یہ اشٹ دیو کو اپنے رجھا نہیں سکتے
یہ شو کی مورتی پہ جل چڑھا نہیں سکتے یہ رام کرشن کے مندر میں جا نہیں سکتے
نگہ سے ان کی کسی کی نگہ نہیں ملتی
خدا کے گھر میں بھی ان کو جگہ نہیں ملتی

جو ہوں سلوکِ یگانہ سے اس طرح یہ تباہ بجا ہے۔ غیر کے سایہ میں لیں اگر یہ پناہ
جب اس سلوک سے تنگ آکے پھیرتے ہیں نگاہ نکال لیتے ہیں جب خود بخود نجات کی راہ
یہ مارتے ہیں بُری مار اپنی نگاہوں سے
ہیں دیکھتے ہمیں نفرت بھری نگاہوں سے

ہے گو کہ غیر کی منظور ہم کو دلداری مگر عزیز سے نفرت کی رسم ہے جاری
نہ دور قوم سے جب تک یہ ہوگی بیماری لکھّی رہے گی مُقدّر میں ذلّت و خواری
جو ہم سے دفع یہ آزار ہو نہیں سکتا
ہماری قوم کا اُدّھار ہو نہیں سکتا

ہیں بھائی بند ہمارے اچھوت جتنے ہیں ہیں رام کرشن کے پیارے اچھوت جتنے ہیں
ہیں بھگوتی کے دُلارے اچھوت جتنے ہیں ہیں شو کی آنکھوں کے تارے اچھوت جتنے ہیں
ہماری طرح پسر مادرِ وطن کے ہیں
اسی کے یہ بھی ہیں ہم پھول جس چمن کے ہیں

مناسب آپ کو اب ہے برادرانِ وطن — کہ وقت دیکھ کے اپنا بدلئے آپ چلن
اچھوت پن کی مٹا دیجئے یہ رسمِ کہن — کہ کہہ سکے نہ کوئی - ہم کو عقل کا دشمن

مٹے کلنک کا ٹیکا یہ خیر و خوبی سے
سبق جو لیجئے افریقہ جنوبی سے

ملے انہیں - جو ہیں ان کے حقوقِ انسانی — ہے ان کی سمت سے غفلت کمال نادانی
ہے ان کا حال زبوں باعثِ پشیمانی — وطن کے واسطے یہ بھی کریں گے قربانی

اک آن میں یہ بدل دیں گے کائناتِ وطن
انہیں کی ذات سے وابستہ ہے نجاتِ وطن

نیکی

بنائے عالمِ امکاں ہے نیکی — یہ وہ قالب ہے جس کی جاں ہے نیکی
کبھی یہ پھول مُرجھانے نہ پائے — گہن میں آفتاب آنے نہ پائے
نہ حالت اس گلستاں کی ردی ہو — نہ یہ پامال طوفانِ بدی ہو
خزاں اس میں گذرنے ہی نہ پائے — اسے برباد کرنے ہی نہ پائے

ذرا بھی اس میں پائے گی جو یہ بار
قیامِ دہر ہو جائے گا دشوار

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند

آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

بھگوان کرشن کی ایک تصویر دیکھ کر

سنسکرت کا ترجمہ

بنشی وبھوشت کران نونیر دھا بھات پیتامبرا مبب پھلا دروشٹات

پورنیند وسندر مکھا دربند نیترات کرشنات پرم کمپ تتو ہم نہ جانے

(فارسی) نے در دستش شیریں کامے دست چو نیلوفر نازک

پوشش زریں برتن زیبا کیف از لعل لب بارد

از سیماش چو ماہ تمامے سیلے سیلے نور چکد

نیلوفر چشمے کرشن ما بوئے رازش کے آرد

(اُردو) ہاتھ کنول سے نازک جن میں دلکش مُرلی ہے

پیتامبر ہے پوشش زریں سرخا سُرخ لب معصوم

مکھڑے سے مثل مہ کامل نور کی بارش ہوتی ہے

آنکھوں میں مستی نرگس کی، کرشن کا راز کسے معلوم

دہلی ۱۹۳۸ء

مادرِ وطن کے قدموں پر

(ترجمہ)

ماں! ترے سامنے سر جُھکاتا ہوں میں

کتنی اچھائیاں ہیں یہ جل میں ترے　　کتنے گُن ہیں یہ ایک ایک پھل میں ترے
جھونکے ٹھنڈی ہواؤں کے آتے ہیں کیا　　دھان کے کھیت یہ لہلہاتے ہیں کیا

ماں! ترے سامنے سر جھکاتا ہوں میں

اُجلی اُجلی ہے کیسی کِھلی چاندنی　　چاندنی سی سُہانی ہیں راتیں تری
کیسی پھولوں سے پھُولی ہیں پھُلواریاں　　کیسی پیڑوں کی ہیں موہنی کیاریاں

ماں! ترے سامنے سر جُھکاتا ہوں میں

مُسکراہٹ تری کتنی اچھی ہے یہ　　میٹھی میٹھی تری کیسی بولی ہے یہ
پیاری پیاری ہے تو بھُولی بھالی ہے تو　　ہم کو سُکھ چین کی دینے والی ہے تو

ماں! ترے سامنے سر جُھکاتا ہوں میں

اک دُھنی اک زبردست نعرہ کے ساتھ　　یہ کروروں ہمارے، جو ہیں پیر ہاتھ
تیری عزّت بچانے کو تیار ہیں　　تجھ پہ سب کچھ لٹانے کو تیار ہیں

ماں! ترے سامنے سر جُھکاتا ہوں میں

کون کہتا ہے نربل بھلا تجھ کو ماں　　تجھ میں شکتی کی ہے انتہا ہی کہاں
بھید ناپید اپنے پرائے میں ہے　　چین ہر ایک کو تیرے سائے میں ہے

ماں! ترے سامنے سر جُھکاتا ہوں میں

قوس قزح

دل پُر آرزو ہاتھوں اُچھل جاتا ہے پہلو میں
میں جب قوس قزح کو آسماں پہ دیکھ لیتا ہوں

مچل جاتے ہیں پھر رہتے نہیں ارماں قابو میں
نظر افروز جب میں کوئی منظر دیکھ لیتا ہوں

یہی تھی زندگی کی ابتدا میں کیفیت میری
یہی حالت ہے میری آجکل عہدِ جوانی میں

یہی حالت رہے یارب زمانِ آخرت میں میری
خزاں آجائے ورنہ بوستانِ زندگانی میں

بِنا انساں کے مُستقبل کی پڑ جاتی ہے بچپن میں
یہی انداز ہے دریائے ہستی کی روانی کا

چراغِ آرزو ہے گلفشاں کاشانۂ تن میں
کہ عشقِ پاک میں گذرے سراک زندگانی کا

(ترجمہ از ورڈزورتھ)

قیدوبند

ناز پروردہ کسی کا اور شیدائے قفس　　ایک مُرغ خوشنما تھا زینت افزائے قفس
ایک طائر اور بھی تھا دل سے آزادی پسند　　تھی جسے دشت جنوں منظر کی آبادی پسند
اتفاقاً ایک دن دونوں کی چار آنکھیں ہوئیں　　چھڑ گئی آپس میں ان کے گفتگوئے دلنشیں

طائرِ آزاد

کیوں پڑے ہو قید میں، آزاد ہو، آزاد ہو　　آؤ میرے ساتھ چل کر دشت میں آباد ہو

مُرغِ اسیر

دشت کہتے ہیں کسے۔ تم خود یہاں آکر رہو　　اس قفس میں چین سے اے مہرباں آکر رہو

طائرِ آزاد

میں رہوں اگر قفس میں۔ کیا ہے یہ وہم وخیال　　اس میں ہے اپنے پروں کو بھی تو پھیلانا مُحال

مُرغِ اسیر

اور اگر میں اپنے مسکن سے نکل بھی آؤں گا　　زیرِ گردوں بیٹھنے کی جا کہاں پھر پاؤں گا

طائرِ آزاد

چہچہا کر اک سنا دو گیت صحرائی مجھے　　نغمۂ دلکش سے کر دو مست اے بھائی مجھے

مُرغِ اسیر

آؤ میرے پاس بیٹھو، کچھ سکھاؤں گا تمہیں　　سیرِ دنیائے ترنّم کی دکھاؤں گا تمہیں

طائرِ آزاد

راگ نغمے گیت۔ یہ چیزیں سُنانے کی نہیں　　روشنی ان کی وہ شے ہے جو دکھانے کی نہیں

مرغِ اسیر

کیا کروں مجبور ہوں صحرا کا میں طائر نہیں　　آہ میں جنگل کے گیتوں سے ذرا ماہر نہیں

شاعر

کون اِن دونوں میں ہے جو وصل کا خواہاں نہیں　　ان کے ملنے کا ابھی تک کیا کوئی امکاں نہیں

پھڑپھڑا کر اپنے پَر کہتے ہیں یہ باہم غریب　　اے مرے ہم جنس آجا تو ادھر میرے قریب

طائر آزاد نے پوچھا، حبیبِ دلنواز　　کیوں قفس کی کھڑکیاں ہیں بند اس کا کیا ہے راز؟

کھڑکیاں ہیں بند، طاری مجھ پہ ہے بیم و ہراس　　یہ نہیں میرے لئے ممکن کہ آؤں تیرے پاس

طائرِ محبوس بولا، میں بھی اُف ناچار ہوں

میرے بازو کام کے لائق نہیں، بیکار ہوں

ترجمہ از ٹیگور باغبان

قطعہ

حُسن کی چوٹ سے بچ جائے جو وہ دل ہی نہیں　　لذّتِ عشق و محبت اُسے حاصل ہی نہیں

خرمنِ صبر پہ بجلی سی گرا دیتا ہے　　جب نقاب رُخِ محجوب اُٹھا دیتا ہے

ہوش والوں کے لئے ہوشربا ہوتا ہے　　حشر ایک اس کے اشارے پہ بپا ہوتا ہے

تیر جب حُسن کا سینے میں اُتر جاتا ہے

طاعت و زُہد کا شیرازہ بکھر جاتا ہے

پیارا وطن

ترجمہ سنہ ۱۹۱۷ء

لاکھ ہوتے ہوں بسر دن زندگی کے عیش میں
سیر کرنے کو مجھے مل جائے گو کاخ اثیر

خواہ کیسی ہی حقیر و پست ہو خاکِ وطن
روئے ہستی پر کہیں ملتی نہیں اس کی نظیر

دلفریبی ہے تقدّس بارِ گردوں سے جہاں
دلکش ایسا خطّہ خاکی کہیں ملتا نہیں

وہ وطن میرا وطن میرا وطن پیارا وطن
اس کا ہمتا اس کا ہمسر ایک بھی پیدا نہیں

گھر سے میں نکلا ہوا ہوں ہیچ ہے سطوت مجھے
پھر مجھے مل جائے میرا پھونس کا وہ جھونپڑا

خوشنوا چڑیاں آتی تھیں جو آواز پر
جلد ہو اب مجھ کو اطمینانِ دل یا رب عطا

سرزمیں میرے وطن کی ہے جہاں میں انتخاب
یہ وہ خطّہ ہے نہیں جس کا زمانے میں جواب

مطبوعۂ نظارہ لاہور

منظر فنا

(ایک شاہی قبرستان دیکھ کر)

انساں آنکھ کھول کے اپنا مآل دیکھ
یہ کیا ہوا ہے پیکرِ خاکی کا حال دیکھ

دیکھ اور خوب دیکھ کہ عبرت کی جا ہے یہ
ہے اک مقام خوف کا ہیبت کی جا ہے یہ

کر غور دل میں اور یہاں کے مزار گن
کتنے ہیں اس میں دفن بھلا تاجدار گن

کتنے شہ غیور مکیں مقبروں کے ہیں
انبار سے دبے ہوئے اب پتھروں کے ہیں

یہ تاجدار وہ ہیں کہ تھے فخرِ روزگار
حاصل تھا جن کو ظلّ الٰہی کا افتخار

قبضے میں جن کے سینکڑوں شہریار تھے
جو تاجدار مملکت روزگار تھے

لیکن وہ ان کی شان وہ شوکت نہیں رہی
اب ہاتھ تک ہلانے کی طاقت نہیں رہی

زیرِ مزار واعظ منبر نشیں ہیں یہ
عبرت دہ مآل ہیں بالیقیں ہیں یہ

یعنی جو حکمراں ہیں انہیں بھی بقا نہیں
یہ اوج اعتبار کے قابل ذرا نہیں

ہے ایک کشت زار، یہاں کی زمیں نہیں
روحِ حیات جس میں نمایاں کہیں نہیں

جو اس زمیں میں دفن ہیں اعلیٰ نسب ہیں وہ
کم دُرِ شاہوار سے رُتبہ میں کب ہیں وہ

جس دن سے بھی جہاں میں نزول بشر ہوا
اس کشت پائمال سے آتی ہے یہ صدا

جن کی سرشت مثلِ ملائک تھی آئینہ
ان کا ہوا ہے جامۂ انساں میں خاتمہ

عالم یہ اک مٹی ہوئی شاہنشہی کا ہے
اک خواب جس میں نام و نشاں زندگی کا ہے

قسمت نے ان کو پہلے تو مردہ بنا دیا
پھر خاک میں ملا دیا، اتنا مٹا دیا

عبرت دہ جہاں کوئی اس سے سوا نہیں
شاہوں کا مقبرہ ہے کسی اور کا نہیں

ترجمہ از انگریزی

فریبِ خیال

(ترجمہ از سروجنی نائیڈو)

ترِی چُٹکی میں تھا وحشت زدہ اک پھول صحرائی

لبوں ہیں جس کو تو نے بے نیازی سے دبا ڈالا

ادا سے نُوچ ڈالیں پتّیاں سب قرمزی جس کی

وہ میرا قلبِ مُضطر تھا وہ میرا قلبِ مُضطر تھا

~~~~~~~~

ترِی چُٹکی میں تھا اک جامِ مے اُے دستِ جانانہ

اُٹھا کر ناز سے جس کو لبوں تک جُرعہ نوشی کی

لگا کر قطرے پٹکا جسے پھر مثلِ بیگانہ

وہ میری رُوح مُضطر تھی وہ میری رُوح مُضطر تھی

لکھنؤ۔مطبوعہ "زمانہ" کانپور
~~~~~~~~

بسترِ مرگ

(ایک انگریزی نظم کا ترجمہ)

دراز بازوئے شب ہو رہے ہیں سُرعت سے
سکوت میں ہیں ستارے سپہر پر رخشاں
مچی ہے بزم میں ہلچل کسی کی رخصت سے
وفورِ سوزِ درِ دل سے ہے شمع محوِ فغاں

ہے آج منظرِ روزِ حساب پیشِ نظر
ہوائیں زور سے ہیں آ رہی قیامت کی
نسیمِ باغ میں پھرتی ہے چار سُو مضطر
ہے رخصت آج چمن میں گلوں سے نکہت کی

صبا پیام سناتی ہے آج ماتم خیز
دُہل کا شور ہے یا شورِ روزِ محشر کا
بپا چمن میں ہے اک عالمِ تعب انگیز
اُڑا ہے رنگ ہر اک دامنِ گُلِ تر کا

ہوائیں جوشِ تموّج، مہیب و برق اثر
وہ چل رہی ہے غضبناک ہو کے تندی سے
حدِ جبل سے وہ کچھ دور چرخِ چنبر پر
ادھر ہلال بڑھا آ رہا ہے تیزی سے

ہوئی ہے شام شبستاں میں اب ہے شب کا گذر
کہ فرطِ یاس سے ظُلمت مآب رہتا ہے
یہ وہ سماں ہے وہ ہنگام ہے یہ وہ منظر
ہر اہلِ ہوش بھی جب محوِ خواب رہتا ہے
اسیرِ کشمکشِ مرگ و زیست بستر پر
پڑا ہوا کوئی ناکامِ زندگانی ہے
خبر یہ دیتے ہیں انفاس و جسمِ زار مگر
قریب اس کا اب انجامِ زندگانی ہے

لبوں پر مُہرِ خامشی ہر اک کے چھائی تھی
ضیائے موجزن اس کی زمیں پہ چھٹکی تھی
چراغ طاق پہ صرف ایک جِھلِملاتا تھا
دعائے خیر نکلنے کو ہر دہن وا تھا

ہر اہل ہوش نفس گن رہا تھا ہو کے نڈھال
مگر یہ کہنے کی طاقت تھی کس کو کس کو مجال
اجل مریض کی اب کتنی دیر میں آئے
کہ تھوڑی دیر غریب اور تو ٹھہر جائے

ادھر سے نیل ڈھلا اور اُدھر سے نکلی آہ
بدن سے روح کھنچی رنگ پڑ گیا ہے سیاہ
ہزاروں پڑ گئیں چہرہ پہ جھرّیاں افسوس
چلا عدم کو یہ دو دن کا میہماں افسوس

نہ کام آئی دوا کچھ دُعا نہ کام آئی
اجل ہی لے کے فقط موت کا پیام آئی
نہ کام آئے زر و مال حشمت و اقبال
تھا ایک پُرزۂ بیکار نامۂ اعمال

عزیز روئے کسی نے مگر بچا نہ لیا
نہ ساتھ دوست کوئی، کوئی آشنا نہ لیا
نہ چارہ ساز کوئی غیر یا یگانہ ہوا
جہاں سے آیا تھا، تنہا وہیں روانہ ہوا

تھا انتظارِ دمِ واپسیں عزیزوں کو
نگاہِ یاس سے دیکھا تمام چیزوں کو
تھا الحفیظ کا کلمہ ہر اک کے وِردِ زباں
ہر ایک آنکھ سے تھی ایک سیل اشکِ رواں

اُٹھا جو آخری بھبکا بُجھا چراغِ حیات
اجل نے کر دیا ویران اس طرح ہیہات
بدن میں روح کو دیکھا کہیں پتہ نہ مِلا
نہ مُرغِ روح کا گلشن میں آشیانہ مِلا

کھُلی تھی آنکھ مگر وہ کسی نے کر دی بند — رہی جو حسرت دیدار بعد مرگ مٹی
عزیز رُوئے، ہوا شور حشر خیز دوچند — مگر نہ روح نکلتے ہوئے دکھائی دی

اجل کا ٹال سکے حُکم کس کی ہے یہ مجال — کرے رضائے خدا بھی قضا نہیں ممکن
بشر ہر اک رہے تیار بہرِ استقبال — رکھا ہے اس کے لئے بھی بس ایک وزیر دن

لکھنؤ۔ ۱۹۱۶ء مطبوعہ رسالہ ترجمان لاہور

شہ زور پر ہی اُٹھے جب اُٹھے تبر کبھی — تیغِ ستم رواں نہ ہو کمزور پر کبھی
مُردہ جو خود ہے اس کو نہ لے مار کر عذاب — یارب کرے گناہ نہ ایسا بشر کبھی

دستِ ستم نہ اُٹھے ہرگز ترا کسی پر — بے جا ہے آدمی کی بیداد آدمی پر
اخلاق کی یہی ہے تعلیم اگرچہ لیکن — ہے سرزنش ضروری سرکش کی سرکشی پر

کہیں ہے اُمید کی تجلّی تو ہے کہیں تیرگیٔ حسرت — طرح طرح کے ہوئے ہیں عنواں فسانۂ زندگی سے پیدا
وہ اپنی جانب کھنچے ہوئے ہیں ہم اپنی جانب کھنچے ہوئے ہیں — عجیب ساماں ہیں دل لگی کے کشاکش باہمی سے پیدا

تاکیدِ عشق

بیٹھے بٹھلائے صدمہ مجھ کو یہ دے نہ جانا　　مجھ سے بغیر پوچھے ہرگز چلے نہ جانا
شب بھر تو میں نے تم کو بیدار رہ کے تاکا　　غلبہ ہے نیند کا اب مجھ پر مگر بلا کا
بیٹھا رہا ہوں یونہیں واللہ رات بھر میں　　تم چل ہی دو گے اُٹھ کر سو جاؤں گا اگر میں

بیٹھے بٹھائے مجھ کو صدمہ یہ دے نہ جانا
مجھ سے بغیر پوچھے ہرگز چلے نہ جانا

وحشت سے بیٹھے بیٹھے اُف یہ مرا بہکنا　　یہ میرا چونک اُٹھنا اور شوق سے لپکنا
میں دستِ شوقِ صادق اپنا بڑھا رہا ہوں　　یہ پیکرِ طلسمی چھونے کو آ رہا ہوں
فرطِ جنوں سے اپنے دل میں یہ کہہ رہا ہوں　　یہ کیا معاملہ ہے کیا خواب دیکھتا ہوں
ہاں تیرے پائے نازک میں دوڑ کر پکڑ لوں　　ہاں ریسمانِ دل سے کس لوں انہیں جکڑ لوں
ان پر نثار ہو کر میں ان کا آسرا لوں　　یہ پاؤں پیارے پیارے سینے سے میں لگا لوں

بیٹھے بٹھائے مجھ کو صدمہ یہ دے نہ جانا
مجھ سے بغیر پوچھے ہرگز چلے نہ جانا

ترجمہ از باغبان (ٹیگور)

ملکۂ حُسن کی باغبانی

سوال

تاجدارِ دلبری سلطانۂ اقلیمِ حُسن — زیب اورنگِ جمال اے زینت دیہیمِ حُسن
فخر حاصل ہے تری خدمت گذاری کا مجھے — شوق ہے قدموں پہ تیرے جاں نثاری کا مجھے

دل میں اُمیدیں ہیں لاکھوں، پیکرِ ارماں ہوں میں
رحم کر ہاں مجھ پہ تجھ سے رحم کا خواہاں ہوں میں

جواب

اُٹھ چکی محفل مری، رخصت ہوئے سب دادخواہ — لی ہے میرے سائلوں نے اپنے اپنے گھر کی راہ
تم کہاں تھے، کھودیا موقع، ہوئی تاخیر کیوں — کر رہے ہو اب یہ آخر بے محل تقریر کیوں

سوال

دیر کیسی دیر اپنے وقت پر آیا ہوں میں — شومیٔ قسمت پہ اپنی آہ گھبرایا ہوں میں
وقت ہے میرا وہی لیکن ہو جب تجھ کو فراغ — دے کے اب خدمت کوئی مجھ کو بنا دے باغ باغ

جواب

تم نے بیشک دیر کی، اب کیا مرے کام آؤ گے — اپنے دل میں یاس و حسرت لے کے واپس جاؤ گے

سوال

حُسن عالمگیر کی تصویر اے جانِ جہاں — تو مجھے اپنے چمن کا اک بنالے باغبان

جواب

دم حماقت کا یہ آخر بھر رہے ہو کس لئے　　عقل سے خارج یہ باتیں کر رہے ہو کس لئے

سوال

ترک کی راہیں کروں گا اب جہاں میں اختیار　　اک تری خدمت سے ہوگا مجھ کو حاصل افتخار
نیزہ و شمشیر سب چیزیں سپردِ خاک ہیں　　میری نظروں میں یہ اب مثلِ خس و خاشاک ہیں
غیر ملکوں میں رہوں میں بن کے اک تیرا سفیر　　بہرِ تسخیرِ جہاں ہوں یا مشیرِ نیک رو گیر
مجھ کو یہ کچھ بھی نہیں منظور اے جانِ جہاں　　تو مجھے اپنے چمن کا اک بنا لے باغباں

جواب

کس طرح اس سے مجھے پہنچاؤ گے آرام تم　　بن کے میرے باغباں کیا کیا کروگے کام تم

سوال

جب لبِ رنگیں سے ہوگا بوسہ کش جامِ فراغ　　ہوں گے جب فی قت طواف پاک ایامِ فراغ
اس چمن کی ہر روش کو تازہ رکھوں گا مدام　　جس میں ہنگامِ سحر ہوتی ہے تو محوِ خرام
کنج میں اک سپت پرنوں[1] کے بٹھاؤں گا تجھے　　ٹہنیوں میں ڈال کر جھولا، جھلاؤں گا تجھے
دیکھتا ہوگا جہاں جلوہ مہ روشن ترا　　پتیوں کی آڑ میں پھیلے گا جب دامن ترا
شمع جو رہتی ہے روشن تیرے بستر کے قریب　　عطر نکہت بار سے اس کا جگاؤں گا نصیب
اس کا چندن[2] اور کیسر[3] سے بڑھاؤں گا وقار　　اس پہ گل بوٹے بناؤں گا میں دلکش بیشمار

جواب

اے مرے دلدادۂ خدمت مرے خواہانِ لطف　　اے مرے شیدا مرے لذت کشِ ارمانِ لطف
یہ تو کچھ منہ سے کہو کیا لوگے خدمت کا صلہ　　اس محبت اور اس حسنِ عقیدت کا صلہ

[1] سپت پرن۔ سات پتیوں والا [2] چندن یعنی صندل [3] کیسر یعنی زعفران۔

سوال

میری خدمت کا ہے یہ انعام، اے جانِ جہاں
میرے ہاتھوں میں ہوں تیری پیاری پیاری مٹھیاں
مٹھیاں کیسی۔ کنول کے جیسے غنچے خوشگوار
ساعدِ سمیں میں پہناتا ہوں میں پھولوں کے ہار
پھر ہو جب تیار روحِ ناز گلہائے اشوک[1]
نذر کروں اس سے کفِ پا میں تری بے روک ٹوک
اور رہ جائے کفِ پا میں کوئی دھبّہ اگر
دور کر دوں میں اُسے اپنے لبوں سے چُوم کر

جواب

اب نہیں ممکن زیادہ میں کروں تم کو ملول
ثبت ہوتی ہے تمہاری عرض پر مہرِ قبول
کر دیا مجھ کو تمہاری گفتگو نے بے زباں
ہو گئے تم آج سے میرے چمن کے باغباں

(ترجمہ از ٹیگور)

رُباعی

حاصل نقدِ مراد کر لے غافل
غمگیں خاطر کو شاد کر لے غافل
پھر آئے نہ آئے سانس کس کو یہ خبر
کچھ تو مالک کو یاد کر لے غافل

[1] اشوک ایک درخت کا نام ہے۔

راز و نیاز

ہوں اسیرِ جنونِ فتنہ ساز
مجھ سے کہدو تم اپنے دل کا راز
حالِ دل کس لئے چھپاتے ہو
مجھے مایوس کیوں بناتے ہو
نہ رکھو اس کو اس قدر مستُور
راز کہہ کر کرو مجھے مسرُور
آؤ تم آکے بیٹھو میرے پاس
کہ نہیں غیر کی یہاں بُو باس

ہوں اسیرِ جنونِ فتنہ ساز
اک فقط مجھ سے کہدو اپنا راز

تم جو چُپکے سے مسکراتے ہو
مجھ پہ برق ستم گراتے ہو
آہ سرگوشیوں سے لیکر کام
حالِ دل کہدو آکے مجھ سے تمام
کیفیت آج طرفہ شب کی ہے
تیرگی کس قدر غضب کی ہے
خامشی ہر طرف جہاں میں ہے
ایک سناٹا سا مکاں میں ہے
طائرانِ چمن ہیں مہر بہ لب
آشیانوں میں محوِ خواب ہیں سب
ڈُبڈباتے ہوئے جو آنسو ہوں
دل دُکھاتے ہوئے جو آنسو ہوں
جس تبسّم میں ہو جھجک شامل
دیدہ جس کی ہو وجہ وحشتِ دل
میٹھا میٹھا جو درد ہوتا ہو
رنگِ رُخ جس سے زرد ہوتا ہو
اور شرم و حیا جو دلکش ہو
اور نازو ادا جو دلکش ہو
راز کہدو ذریعہ سے ان کے
ہیں وسیلے یہ کشفِ باطن کے

ہوں اسیرِ جنونِ فتنہ ساز
مجھ سے کہدو تم اپنے دل کا راز

ترجمہ از باغبان ٹیگور

دُعائے خیر

(ترجمہ از انگریزی)

اے نونہالِ گلشنِ ہستی بامداد — تو زندہ باش و عمرِ عزیزت دراز باد

نوعِ بشر کے درد سے تو آشنا رہے — تیرا شعار خدمتِ خلقِ خدا رہے

منظور اک زمانہ کی ہو بہتری تجھے — ہر بات میں نصیب ہو نام آوری تجھے

تو اک سفینہ دار ہے بحرِ حیات میں — تجھ سے بہار ہے چمنِ کائنات میں

قدرت محیط ہے صفتِ بحر چار سُو — ایک اس کی لہر کھیلتی ہنستی ہوئی ہے تو

جس طرح تیرے واسطے ہم ہیں دُعا بلب — پڑھتے ہیں کلمۂ برکت دل سے روز و شب

دُنیا بھی تیرے حق میں دُعا گو مُدام ہو
اتنا تجھے رفاہِ خلائق سے کام ہو

دستورِ محبت

آتے جاتے ہیں اس طرف وہ مدام — آنے جانے سے بس ہے اُن کو کام
لبِ گویا اُنہوں نے وا نہ کیا — کبھی اظہارِ مدّعا نہ کیا
اے مری ہمجلیس و محرمِ راز — مری ہمدم انیسِ عشوہ ساز
پھول اک لے کے میری کاکُل کا — تار اک لے کے مجھ سے سُنبُل کا
جاؤ تحفے میں ان کو دے آؤ — مری الفت کی داد لے آؤ
بھیجنے والے کا جو پوچھیں نام — اِن سے ہونا سنبھل کے محوِ کلام
اُن کا شیوہ یہی رہا ہے مدام — آنے جانے سے بس ہے اُن کو کام
مائل نامہ و پیام نہیں — اس سے اُن کو ذرا بھی کام نہیں
آہ فرشِ زمیں پہ زیرِ شجر — بیٹھ جاتے ہیں ہو کے دُہ مضطر
اے وفا کیش و بندۂ اخلاص — اے میری ہمجلیس میری خواص
سیج اک جا کے تم بچھا دینا — عطرِ گُل سے اسے بسا دینا
اُن کی آنکھوں سے ہے خوشی معدوم — اور رہتے ہیں روز و شب مغموم
جس سے وحشت سی مجھ کو رہتی ہے — ایک کلفت سی مجھ کو رہتی ہے
نہیں کہتے کبھی وہ دل کا حال — اور رہتے ہیں فرطِ غم سے نڈھال

آتے جاتے ہیں اس طرف وہ مدام
ان کو اِس کے سوا نہیں کوئی کام

ترجمہ از ٹیگور

تماشا گاہ دُنیا

"شیکسپیئر نے دنیا کو ایک تھیٹر کا اسٹیج قرار دیکر انسانی زندگی کے سات حصّے کئے ہیں اور ہر ایک حصّہ کو ڈرامہ کا ایک سین قرار دیا ہے۔ اس نظم میں بھی یہی خیال پیش کیا جاتا ہے۔"

تیرے سینے میں نہاں گر قلبِ حق آگاہ ہے — دیکھ اے انساں کہ دُنیا اک تماشا گاہ ہے
مرد و زن جتنے تجھے دُنیا میں آتے ہیں نظر — اصل میں سب اس تماشا گاہ کے ہیں ایکٹر
اپنا اپنا پارٹ اس میں کھیلنے آتے ہیں سب — اپنا اپنا ایکٹ دکھلا کر چلے جاتے ہیں سب
ایکٹ اس کے عمرِ انسانی کے حصّے سات ہیں — سات پردوں سے یہ محوِ انکشافِ ذات ہیں
شیر خواری کا زمانہ اس کا پہلا ایکٹ ہے — دلفریبی میں یگانہ اس کا پہلا ایکٹ ہے
سایہ میں ماں باپ کے نازوں سے پلنا دیکھئے — گود میں دایہ کی وہ رونا مچلنا دیکھئے
بے خبر دنیا سے لیٹا ہے بچھونوں پر کبھی — گھٹنیوں چل کر لپکتا ہے کھلونوں پر کبھی
کھیلنا ہمراہ ہم عُمروں کے وہ مستانہ وار — ناپنا حدِّ زمیں گھر بھر کر دن میں بار بار
الغرض جب پارٹ کر چکتا ہے یوں اپنا ادا — پھر نظر کے سامنے ہوتا ہے منظر دوسرا
ایکٹ ہے اس سین میں علم و ہنر کا اکتساب — اس سمندر کے لئے اس کا سفینہ ہے کتاب
نام سُن کر مدرسے کا ڈال کر تیوری پہ بل — بادلِ ناخواستہ جاتا ہے بستہ در بغل
بھولی بھولی شکل پر قربان ہے نورِ سحر — جانبِ مکتب قدم اُٹھتا ہے رُک رُک کر مگر
صبح دم ہوتا ہے تازہ دم مگر مجہول ہی — اک قیامت کی جگہ اس کے لئے اسکول ہی
کسبِ علم و فن سے ہو جاتا ہی جب حاصل فراغ — تیسرے منظر سے ہوتی ہے طبیعت باغ باغ

نوجوانی کی امنگیں رات دن ہیں زور پر | آتشِ مجمر سے اب کچھ کم نہیں سوزِ جگر

ہے زباں پر ذکرِ دلبر قصۂ ہجر و وصال | دور ہوتا ہی نہیں محبوب کا دل سے خیال

شاہدِ مقصد کے ارمانوں سے دل بیتاب ہے | جوش میں الفت کے اک کیفیتِ سیماب ہے

ذرا اس کو ابروئے دلدار کا نشتر ہے ایک | پار ہو جاتا ہے جو سینے کے وہ خنجر ہے ایک

روپ چوتھے ایکٹ میں جرار کا بھرتا ہے پھر | معجزے خنجر گذاری کے عیاں کرتا ہے پھر

ہے گرجتا رزمگہ میں جا کے شیروں کی طرح | داد جانبازوں کی دیتا ہے دلیروں کی طرح

ہے سلاحِ جنگ سے آرائشِ تن کی ہوس | بیٹھنے گھر میں نہیں دیتی کبھی رن کی ہوس

رزم کے میدان میں ہے مائلِ پیکار و جنگ | جوشِ ہمت میں نہیں کچھ خدشۂ تیر و تفنگ

توپ کے بھی سامنے ہے خواہشِ نام آوری | فوجِ اعدا کے مقابل میں ہے محوِ صف دری

پانچویں پردہ کی بھی کیا دیدنی ہے سینری | ہو رہی ہے اب عیاں شانِ عدالت گستری

واہ کیا شانِ تمول یہ ہے کیا جاہ و حشم | فضلِ حق سے ہر طرح کی شان و شوکت ہے بہم

بیٹھتا کس رعب سے ہے مسندِ انصاف پر | اس کے توش و تن کی جانب بھی ذرا ہو اک نظر

فربہی الوانِ نعمت سے شکم پر آشکار | ہے یہ گویا ایک مرغانِ مسلّم کا مزار

فیصلوں میں خوبیِ فہم و فراست آئینہ | دیدۂ روشن سے ہے حلم و مروت آئینہ

پھر چھٹے پردہ کا ان آنکھوں سے منظر دیکھیے | وہ خمیدہ سی کمر وہ جسم لاغر دیکھیے

ناک پر عینک معینِ دیدۂ کمزور ہے | یہ سفر اس کا وہ ہے اب جس کی منزل گور ہے

اب تو ہے پسماندۂ عہدِ جوانی پر بسر | موزۂ محفوظ کی جانب ہی رہتی ہے نظر

اب کہاں وہ لہجۂ مردانگی آواز میں | پھر وہی باتیں ہیں تھیں جو عمر کے آغاز میں

کس قدر غالب نقاہت آگئی آواز پر | راگ جاری ہیں نفس کے ہڈیوں کے ساز پر

بعد ازاں جو آخری منظر ہے عبرتناک ہے | دامنِ ہستی بشر کا جس کے آگے چاک ہے

دوسرا بچپن یہی ہے عالم نسیاں یہی ختم ہو جاتی ہے جس پر داستان زندگی
دانت غائب آنکھ غائب اور بے مصرف زباں
پھر نظر آتا نہیں یہ اجتماع جسم و جاں

لکھنؤ (ترجمہ)

قطعہ

لاکھ تیری تلاش کی ہم نے نہیں ملتا مگر نہیں ملتا
جو ہے اپنی ہی طرح رہبر ہے ایک بھی راہبر نہیں ملتا
جستجو کی نہیں کوئی صورت جادۂ معتبر نہیں ملتا
جس طرف اپنے پاؤں اُٹھتے ہیں
اُس طرف خاص کر نہیں ملتا

مُحبّت

(ایک انگریزی نظم کا ترجمہ)

گذر کر آسماں رس رفعتوں پر کوہساروں کی ہواؤں کی طرح لہروں پہ چل کر رودباروں کی
اُتر کر ڈوب کر چشموں کے اندر تہ نشیں ہو کر بزیرِ تربت احبابِ رفتہ جاگزیں ہو کر
قیامت خیز طوفانوں میں حاوی سخت جانوں پہ قدم رکھتی ہوئی آہستہ آہستہ چٹانوں پر
وفورِ شوق سے کرتی ہوئی طے وادی و صحرا
محبّت ہر طرح کر لے گی اپنا راستہ پیدا

جہاں قدرت نے اتنی بھی نہیں رکھی ہو گنجایش گذر ہو جائے اِک ننّھے سے جگنو کا بآسایش
جہاں پیدا ہے تنگی سے دلِ انساں میں حیرانی نہ اِک مکھّی بھی پر پھیلا سکے جس میں بآسانی
نہ داخل ہو سکے اِک پشّہ ناچیز بھی جس میں سمائی ہو نہیں سکتی کسی ذی روح کی جس میں
محبّت آ کے اپنے واسطے کر لے گی جا پیدا
محبّت ہر طرح کر لے گی اپنا راستہ پیدا

نہ ہو اقرار شاید تم کو اس کے زور و قوّت کا اسے سمجھو مُرقع خواہ طفلانہ نزاکت کا
کرو نفرت سے عائد خواہ الزامِ فرار اس پر کہ رکھو بزدلی کا اتّہام ناگوار اس پر
اگر محبوب اس کا لاکھ پردوں میں چھپا ہوگا اگر پہرے پہ پہرا رات دن اس پر لگا ہوگا
محبّت کو نہ ڈر کچھ تیغ کا خدشہ نہ خنجر کا
محبّت ہر طرح کر لے گی اپنا راستہ پیدا

گماں اکثر کا ہے تدبیر کر سکتی ہے پست اِس کو کہ ہو جاتی ہے قید و بند سے حاصل شکست اِس کو

خیال اکثر کا ہے آنکھیں نہیں ہو تیں محبّت کی عطا قدرت ہی سے نعمت نہیں اُس کو بصارت کی
کرو جو دل میں آئے تنگ کرنے کے لئے اُس کو نہ دو رستہ ذرا بھی تم گذرنے کے لئے اُس کو
مگر بینا کہو تم خواہ اس کو خواہ نابینا
محبّت ہر طرح کر لے گی اپنا راستہ پیدا

عقابِ آسماں شاید اسیرِ دام ہو جائے تمہاری تربیت سے ہے یہ ممکن رام ہو جائے
یہ ممکن ہو کہ ققنُس پر تمہارا رعب چھا جائے یہ ممکن ہے کہ بیچارہ تمہارے بس میں آ جائے
بٹھا دو خواہ بھوکی شیرنی پر اقتدار اپنا تمہاری منّتوں سے چھوڑ دے شاید شکار اپنا
نہیں کوئی محبّت کو کبھی مغلوب کر سکتا
محبّت ہر طرح کر لے گی اپنا راستہ پیدا

ایک طرف ہے عیش و مسرّت دوسری جانب رنج و الم یہ نیرنگ تحیّر زا ہے کیسی دو رنگی دنیا ہے
پردہ میں آثارِ قیامت۔ باہر جلوہ گہ اُمید! کوئی تو ہم کو یہ بتائے۔ آخر یہ نقشہ کیا ہے

سرِ گردوں نجومِ نحس کی بنیاد ہل جائے شریروں کو شرارت کا مزا چکھنے کو مل جائے
تواضع کر لہو سے تو خود اپنے تشنہ کاموں کی جو دشمن ہو نہ وہ بھی تیرے در سے مضمحل جائے

دُنیا باقی

(ٹنی سن کی ایک انگریزی نظم کا ترجمہ)

ندی دن رات بہنے سے تھکے گی بھی کبھی آخر؟
ہوا چلتی ہی رہنے سے چھکے گی بھی کبھی آخر؟
فلک پر تا بکے بادل رہیں گے یونہی منڈلاتے
یہ دھڑکے بند کب ہوں گے دلِ سیماب فطرت کے
یہ قدرت کب فنا ہوگی

کبھی ممکن نہیں ایسا کوئی شے مٹ نہیں سکتی
فنا کا ذکر ہی کیسا! فنا ہے لفظ بے معنی
ندی ہر وقت بہتی ہے ہیں بادل مجوِ طیّاری
ہوا چلتی ہی رہتی ہے ہیں دل کی جنبشیں جاری
کوئی شے مٹ نہیں سکتی

فقط صُورت کی تبدیلی ہمیشہ رُونُما ہوگی
بقا کی قید میں ہر شے تغیّر آشنا ہوگی
خزاں کے دن ہوئے رخصت نہیں اب زور گرما کا
نظر کے سامنے نقشہ کھنچا ہے فصل سرما کا
زمیں میں آگئی خشکی

مگر اب فصلِ گُل آ کر — نئی رنگت جمائے گی
نئی رنگت جمائے گی — نیا منظر دکھائے گی
ہوائیں جوش میں آ کر — چلیں گی پھر نئے سر سے
گذر کر دشت و وادی سے — پہاڑوں سے سمندر سے
فضا فرحت فزا ہوگی — زمیں کا دل ہرا ہوگا
حیاتِ نو کے جلوہ سے — لطافت آشنا ہوگا
نمایاں تازگی ہوگی

یہ دُنیا تو حقیقت میں — بنی ہی تھی نہیں ہرگز
نشان اِس کا زمانے میں — نہ پاؤ گے کہیں ہرگز
فقط تبدیل ہوتی ہے — نہیں دُنیا فنا ہوتی
بقا ہے نام جس شے کا — نہیں اس سے جُدا ہوتی
ہوائیں یونہی چلنے دو — ہمیشہ رُخ بدلنے دو
مہ و خورشید کو یونہی — سرِ گردوں نکلنے دو
سویرا یونہی ہوتا ہے — ہے یونہی شام بھی ہونا
اسی صورت سے دُنیا کے — ہیں سارے کام بھی ہونا
یہی ہے شان قدرت کی

ہوئی پیدا نہ کوئی شے — نہ کوئی شے فنا ہوگی
نہ تھی جب ابتدا کچھ بھی — تو کیسے انتہا ہوگی
مگر لازم ہے تبدیلی

ترجمہ از ٹینی سن

فاتح اجل

اے فاتحانِ عالم ہرگز نہ اب جتانا
ہے شاندار کتنی وہ مملکت تمہاری
ہرگز نہ رزمگہ میں کُوسِ ظفر بجانا
ہے اب کہاں وہ شاہی وہ سلطنت تمہاری

اب زیبِ سر کہاں ہے اکلیلِ زرفشانی؟
اُٹھ کر دکھاؤ ہم کو پھر شانِ تاجداری
ہنگامِ رزم ابھی کیا ہے شوقِ کامرانی؟
باقی ہے دل میں کوئی ارمانِ تاجداری

مالک ہوئے جہاں میں ساتوں سمندروں کے
ساحل بہ ساحل اپنا تم نے قدم جمایا
حالانکہ مُلک چھینے دو چار خود سروں کے
جنگاہ میں ہزاروں کو خاک میں سُلایا

لیکن کہاں ہے اب وہ جاہ و جلالِ نُصرت
دیکھو نظر اُٹھا کر وہ تخت و تاج اپنا
آخر میں کیا یہی تھا ملنا مآلِ نُصرت
اُٹھو وصول کرلو سب سے خراج اپنا

تھا اپنی سلطنت پر بیجا غرور تم کو
فرعون سے نہیں کچھ تم خودسری میں کم ہو
مل جائے گا نتیجا اس کا ضرور تم کو
اب وقت آگیا ہے فرقِ نیاز خم ہو
ہوگی طلب تمہاری جب شہرِ خامشی میں
پروانۂ اجل پر سر خود جھکاؤ گے تم
تھا جس قدر اُٹھایا سر اپنی زندگی میں
ہاں ہاں ضرور اس کا پھل آج پاؤ گے تم

جنگ وجدل کی آفت قحط و وبا کے نرغے ان سب کے ہاتھ میں ہے انسان موت تیری
درپیش ہوں گے تجھ کو لاکھوں بلا کے نرغے لیکن میں کر رہی ہوں آسان موت تیری

پھرتے ہیں بھیس بدلے قاصد مرے جہاں میں توان کی صورتوں کو پہچان بھی نہ پایا
تیری قضا ہے پنہاں تیرے ہی جسم و جاں میں اسرار نیستی کے تو جان بھی نہ پایا

امراض و قحط یوں تو ہیں موت کے بہانے لیکن یہی نہیں ہیں اسباب نیستی کے
جو اختیار بخشا ہے موت کو خدا نے برباد کر رہا ہے وہ کھیل زندگی کے

اک موجۂ تبسّم تجھ کو فنا کرے گا پیشِ نگاہ ہوگا نظّارہ نیستی کا
اک بوسۂ شکر زا پیغامِ مرگ دے گا دل آ کے توڑ دے گا چپکے سے آدمی کا

ترجمہ از شلی ۱۹۱۸ء

غنچوں سے خطاب

اے چمن کے غنچہ ہائے نوبہار
اے وقار افزائے نخلِ سایہ دار

حالت ابتر ہے چمن کی کس قدر
ہے یہ مُرجھانے میں جلدی کس قدر

کوئی آفت چرخ نے ڈھائی نہ تھی
کچھ ابھی فصلِ خزاں آئی نہ تھی

کھل کے پھر جلوہ دکھاؤ تو ذرا
چپکے چپکے مُسکراؤ تو ذرا

کچھ گلستاں میں دکھاؤ تو بہار
بُلبُلوں کو بھی تو ہونے دو نثار

کیونکہ آخر تو چلے ہی جاؤ گے
دردِ فرقت سے مجھے تڑپاؤ گے

عالمِ ہستی میں تم پیدا ہوئے
کیا گھڑی بھر کی مسرّت کے لئے

دو گھڑی کی تھی یہ صحبت آہ آہ
اور اتنی جلد رخصت آہ آہ

تم کو قدرت کیا ریاضِ خلد سے
صرف لائی تھی نمایش کے لئے

اور تم کو چھوڑ کر تنہا یہاں
کر گئی خوں گشتۂ فصلِ خزاں

میرے پیارے غنچہ ہائے نوبہار
رونقِ گلزار کے سرمایہ دار

ہم کو دیتا ہے سبق یہ بوستاں
کیسے ہو جاتے ہو تم نذرِ خزاں

ہم کو ملتا ہے یہاں سے یہ پتا
کس طرح آتا ہے پیغامِ فنا

کیسے سب چیزیں دکھا کر اپنی شان
بس تمہاری ہی طرح سے ایک آن

چھوڑ کر چلے سے باغِ پُر بہار
خاک میں ملتی ہیں پھر انجام کار

نیستی کا یوں پتہ دیتی ہیں وہ
قبر اپنی جگمگا دیتی ہیں وہ

ترجمہ از آر۔ ہیرک

ماں کی عظمت

چھوٹی سی ایک لڑکی بیٹھی ہے پاس ماں کے
ہے کھیلتی زمیں پر سائے میں آسماں کے

معصوم زندگی کی راحت سے بے خبر ہے
ہے قوت نظر سے محروم، بے بصر ہے

تکلیف کور چشمی حالانکہ جھیلتی ہے
پھر بھی ہنسی خوشی سے دن رات کھیلتی ہے

علمِ طبابت اس سے شرمندہ و خجل ہے
ہستیِ میل و سرمہ معذور و منفعل ہے

دل میں یکایک اس کے کوئی خیال آیا
دامن میں اپنے لیکر رنگِ ملال آیا

فی الفور اُٹھ کے چل دی پہلو سے اپنی ماں کے
جا پہنچی صحن میں اک پُرلطف گلستاں کے

پھر اس نے ہاتھ اُٹھائے پھر اس نے سر جھکایا
خالق کو یاد کر کے کہنے لگی خدایا

تیری عطا کے صدقے تیرے کرم کے قرباں
میں بھی جہاں میں ہوں اک مجموعۂ تن و جاں

کیا مصلحت ہے اس میں لیکن، یہ بات کیا ہے
کیوں روشنی سے مجھ کو محروم کر دیا ہے

کیا کوئی مجھ سے یا رب سرزد خطا ہوئی ہے
جس کے صلے میں تو نے مجھ کو سزا یہ دی ہے

جس دن سے آنکھ کھولی، محروم ہوں بصر سے
خالی ہے یہ خزانہ سرمایۂ نظر سے

سنتی ہوں میں کہ دنیا ہے دیکھنے کے لائق
کہتے ہیں یہ تماشا ہے دیکھنے کے لائق

سنتی ہوں میرے سر پہ چرخِ بریں ہے کوئی
زیرِ قدم بھی شاید فرشِ زمیں ہے کوئی

عرشِ بریں پہ جلوہ ہے مہر و ماہ کا بھی
فرشِ زمیں پہ نقشہ ہے کوہ و کاہ کا بھی

عرشِ بریں پہ تارے ہیں شب کو جگمگاتے
فرشِ زمیں پہ دن میں ہیں پھول مسکراتے

کہتے ہیں جاں فزا ہے شام و سحر کا منظر
دلکش ہے دلربا ہے دیوار و در کا منظر

لیکن نہیں میں خواہاں دُنیا کو دیکھنے کی
میرے لئے ہے یارب تیرا کرم ہی کافی
ہے صرف عرض اتنی مجھ زار وناتواں کی
صورت مجھے دکھادے تو میری پیاری ماں کی

ترجمہ از جرمن بوسیلہ انگریزی - دہلی

قطعات

اب ٹھکانے کاش لگ جائیں تمنّائیں میری
دے رہا ہے ضعف پیغام وداعِ زندگی
چارہ سازِ دردِ دل ہو یا مسیحائے اجل
جس کو کہدو سونپ دیں اپنی متاعِ زندگی

کیوں ترکِ وفا کے لئے تلقین ہے ناصح
ہو جائے گی توہینِ وفا ترکِ وفا سے
کچھ تیری غرض میری سمجھ میں نہیں آتی
میں اور حذر شیوۂ تسلیم و رضا سے

ضد انہیں ہے کہ وہی انجمن آرا ہو جائیں
مہ وخورشید کو ہے حکم کہ عنقا ہو جائیں
ہیں اسی سعی میں اب بادِ خزاں کے جھونکے
خشک ہوں پھول کچھ اس طرح کہ کانٹا ہو جائیں

اطمینانِ قلب

آہ اطمینانِ قلب اے میہمان دلنواز
پھر جھلک اپنی دکھادے خاطرِ غمناک میں
ہے مرے زخمِ دروں کا ایک تو ہی چارہ ساز
اپنے ہاتھوں سے رفو کر دے مرے ہر چاک میں

آہ اطمینانِ قلب اے طائرِ بستانِ شوق
میرے دل میں تو بنا لے آکے اپنا آشیاں
چھُٹ نہ جائے میرے ہاتھوں سے کہیں دامانِ شوق
ہیں طرب انگیز تیرے نغمہ ہائے دلستاں

ورنہ اپنے ساتھ ہی تو مائلِ پرواز رکھ
شوق سے لٹکا رہوں گا میں تری منقار میں
کوئی تو ہمراہ اپنے ہمدم و ہمراز رکھ
میں بسیرا لوں گا تیرے ساتھ ہر گلزار میں

مجھ کو دولت کی تمنّا ہے نہ ہے زر کی تلاش
عہدِ پیشیں کی مجھے راحت نہیں درکار ہے
میں نے تیری ہی جہاں میں زندگی بھر کی تلاش
خانۂ دل میں مجھے تجھ سا مکیں درکار ہے

دل مرا بندہ نہیں مدّت سے حرص و آز کا
میں غم و شادی کے قید و بند سے آزاد ہوں
مجھ کو سودا بھی نہیں ہے عشقِ فتنہ ساز کا
میں نہ چرخِ چنبری سے شاکیِ بیداد ہوں
میں جدا دم بھر نہ تجھ سے ہوں نہ تو مجھ سے جدا
میرے دل سے بڑھ کے ہو سکتی نہیں جائے قیام
ہو سکے کس طرح تیری آرزو مجھ سے جدا
دل مرا بھی اک تیرے رہنے کے قابل ہے مقام

کیوں ہے زر داروں کی تجھ کو ہمت افزائی پسند
دولتِ فانی کی یہ کھنکھار کیوں آئی پسند
کیوں یہ تسکینِ دلِ اہلِ دول منظور ہے
کس لئے تو بے نوا کے گھر سے کوسوں دور ہے

آہ جس چشمہ پہ ہے موقوف جنگل کی بہار
ہے خس و خاشاک پر جس جھونپڑی کا انحصار
لطف کچھ اس کی روانی میں نہیں آیا تجھے
اس کے آگے قصرِ کسریٰ کس لئے بھایا تجھے

حال و مستقبل کے جھگڑوں سے نہیں مطلب مجھے
منتظر رکھنا نہیں لازم زیادہ اب مجھے
عہدِ ماضی کا نہیں آتا کبھی مجھ کو خیال
رد نہ ہونے پائے ہرگز تیرے سائل کا سوال

تجھ سے خود ہوں دست بستہ جب میں خواہانِ کرم
ہے تری موجِ تبسم شاہدِ شانِ کرم
پھر یہ سامانِ طرب ہیں اور کس کے واسطے
دل مرا رہتا ہے مضطر صرف اس کے واسطے

ترجمہ از انگریزی

نیک و بد اپنے ہی کرداروں کی تصویریں ہیں دو
اِک قلم سے جو لکھی جائیں وہ تحریریں ہیں دو

تجربہ

عمرِ انساں کی زمانے میں ہے مانندِ سراب — تجربہ کا ہے وجود اس میں برنگِ محراب

کبھی اُس پار جو محراب کے پڑتی ہے نظر — دیکھتا ہوں میں وہاں ایک جہانِ نایاب

یہ وہ دنیا ہے نہیں جس کی خبر بھی مجھ کو — اس کی وسعت کا ہے دشوار شمار و حساب

یہ وہ عالم ہے کبھی خاک نہ چھانی جس کی — آج تک جس کے سفر کا کبھی دیکھا نہیں خواب

جس قدر اس کے سفر کو مرے بڑھتے ہیں قدم — نا اُمیدی مجھے کر دیتی ہے آ کر آب آب

بیکراں ہے صفتِ بحرِ منوّر یہ جہاں — تجربہ ہے مرا اس بحر میں یک قطرۂ آب

ساری دنیا کا نہیں تجربہ اب تک مجھ کو

ایک مُدّت سے ہوں گو بہرِ سفر پا بر کاب

(ترجمہ از انگریزی ٹنی سن)

تسلیم و رضا

طالب ۔ شکوہ نہ کیا میں نے اے یار کبھی تجھ سے
لے لیتا ہوں ملتا ہے جو کچھ بخوشی تجھ سے
اب حرص طمع کا بھی آزار نہیں مجھ کو
بس اور زیادہ کچھ درکار نہیں مجھ کو

مطلوب ۔ اے سائلِ رنگیں تو اخلاق کا پتلا ہے
ہے صاف عیاں مجھ پر جو کچھ ترا منشا ہے
دامانِ طالب منعم اس طرح ترا بھر دے
جو کچھ بھی ہو سرمایہ سب تجھ کو عطا کر دے

طالب ۔ مل جائے اگر تجھ سے اک مجھ کو گلِ خنداں
اس گُل سے کروں گا میں تزئینِ دلِ پنہاں

مطلوب ۔ بخشش کا اگر میری تو اتنا ہے دلدادہ
کیا خارِ مغیلاں بھی لینے کو ہے آمادہ

طالب ۔ ہاں ان کو بھی میں اپنے سینے میں جگہ دوں گا
جو ان کی خلش ہوگی میں شوق سے سہہ لوں گا

مطلوب ۔ اے سائلِ رنگیں تو اخلاق کا پتلا ہے
ہے صاف عیاں مجھ پر جو کچھ ترا منشا ہے
دامانِ طلب منعم اس طرح ترا بھر دے
جو کچھ بھی ہو سرمایہ سب تجھ کو عطا کر دے

طالب ۔ صہبائے مسرت سے پیمانۂ دل بھر دے
صرف اپنی نظر میرے چہرے کی طرف کر دے

اُٹھ جائے مرے رخ پہ دم بھر جو نظر تیری　　مر جانے پہ بھی ہستی پُر لطف رہے میری

مطلوب پُر لطف نگاہوں سے دنیا ہو اگر خالی　　ہوں قہر بھری آنکھیں گر مائل پامالی

طالب منظور مجھے دل سی ہیں ایسی نگاہیں بھی　　ہر وقت مزا دیگی سینے میں خلش ان کی

مطلوب ہے صاف عیاں مجھ پر جو کچھ ترا ارماں ہے　　منعم سے جہاں میں تو ہر چیز کا خواہاں ہے

(ترجمہ از باغبان ٹیگور)

قطعہ

کبھی نہ روزِ ازل سے چھوڑا فلک نے انداز کجروی کا
کمینگی پر کمینگی ہے شرارتوں پر شرارتیں ہیں

دغا سے مطلب رہا ہمیشہ فریب میں زندگی گذاری
یہ کیسی بوسیدہ منزلیں ہیں یہ کیسی کہنہ عمارتیں ہیں

توبہ

تھا ارادہ یہ کہ میں چھپ کر کروں کوئی گناہ
وہ جگہ ڈھونڈھی جہاں میرے سوا کوئی نہ تھا
گوشے گوشے میں نہایت غور سے ڈالی نگاہ
جس طرف دیکھا وہاں میرے سوا کوئی نہ تھا

پھر یہ دل میں خود بخود پیدا ہوا فوراً خیال
حاضر کل ہے خدا موجود ہو شاید کہیں
لیکن اس کا دیکھنا بھی تھا مجھے امر محال
اور مجھ کو اس کی ہستی کا نہ کچھ آیا یقیں

دفعتاً ڈالی جو میں نے اپنی ہستی پر نظر
خود میں اپنے سامنے آمادۂ تقصیر تھا
چشمِ باطن کھول کر جب کی نظر پھر روح پر
مجھ پہ طاری یک بیک سکتہ کا عالم ہو گیا

میرا منشا اس جگہ سے تھا نہ کوئی ہو جہاں
غور سے دیکھا تو میں خود ہی وہاں موجود تھا
اور تھے وقفِ شہادت سقف و دیوار مکاں
تھی زمیں نیچے تو سر پر آسماں موجود تھا

اس ارادہ سے میں باز آ کر بدل تائب ہوا
التجا کی قادرِ مطلق سے بخشش کے لئے
عمر بھر لایا نہ لب پر نام پھر تقصیر کا
لکھدیئے اشعار یہ تہذیبِ دانش کے لئے

ترجمہ از انگریزی

دین و دُنیا کا مُقابلہ

یا

رمبھا شُنک سمباد[1]

(ایک مشہور و معروف سنسکرت نظم کا حرف بحرف منظوم ترجمہ)

رمبھا۔ آیا ہے بور آم میں ہے فصلِ لطف خیز ۔۔۔ ہیں کوئلیں وہ آڑ میں شاخوں کی نغمہ ریز
جب یوں ہو چشمِ ناز کسی کی حجاب بیز ۔۔۔ آمادہ کام[2] دیو نہ ہو کیوں پئے ستیز
کیا ناوک و کماں میں ہے اعجاز دیکھئے
ہاں اس نشانہ بازی کا انداز دیکھئے

شُکھدیوجی ہر سمت سادھوؤں کی وہ برپا ہے انجمن ۔۔۔ ہر انجمن میں دھوم سے جاری ہے کیرتن[3]
مشغول کیرتن میں ہیں اس درجہ مرد و زن ۔۔۔ کچھ جوشِ بیخودی میں نہیں فکرِ جان و تن
ملتی ہے اِن کو عالمِ اشراق کی خبر
اس وقت کچھ نہیں انہیں آفاق کی خبر

ہے تیرتھوں میں برہمنوں کا اک اژدہام ۔۔۔ ہے ذاتِ جاوداں کے تصوّر کا شغلِ عام
ہے غور و فکر رمزِ حقیقت پہ صبح و شام ۔۔۔ عرفان و عشق سے انہیں رہنا ہی صرف کام
ثمرے ہیں جوگ جپ کے قناعت نصیب ہے
دیدارِ ذاتِ پاک کی راحت نصیب ہے

---

[1] مکالمہ [2] جذباتِ شہوانی کا دیوتا [3] ذکرِ الٰہی

رمبھا عالم ہے شاہدانِ حسیں پر شباب کا انداز ہے خرام میں شرم و حجاب کا
پرتو ہے ایک ماہِ رخ بے نقاب کا گالوں سے جس کے رنگ ہے پیدا گلاب کا
ہے عکس حُورتِ چشم جو آبِ عذار میں
بیٹھا ہے کام دیو بھی فکرِ شکار میں

سکھدیوجی ہیں جابجا دہ پیش نظر تن ویدیاں جلوہ فروز جن میں ہیں گندھرب خوش بیاں
ہے کنّروں کے قلب سے جوشِ طرب عیاں ہر رُکنِ انجمن نظر آتا ہے شاداں
کرتے ہیں ذکر پاک یہ ہر آن رام کا
جلوہ نظر میں ان کی ہی بھگوان رام کا

رمبھا۔ ہو جس نگارِ ناز کی مستی اُبھار پر جس کا ریاضِ حُسن و ادا ہو بہار پر
چندن ملا ہو جس کے تنِ نور بار پر حاوی نہ ہو جو دیدۂ بے اختیار پر
ایسی حسین زینتِ پہلو اگر نہیں
بیکار شے ہے ایک حیاتِ بشر نہیں

سکھدیوجی جس کا وجود حدِّ تصوّر سے دور ہے پروردگارِ کل ہے جو بالذّاتِ نُور ہے
ہر ذرّہ ہر شرار میں جس کا ظہور ہے جو عینِ معرفت ہے جو عینِ سرور ہے
اُس کا خیال اُس کا تصوّر اگر نہیں
بیکار شے ہے ایک حیات بشر نہیں

رمبھا۔ وہ مخزنِ جمال وہ خجلت دہِ قمر جس کی شعاعِ نور ہو تسکینِ دہِ جگر
نازک کنول کی شاخ کا دھوکا ہو جسم پر سُرخی پہ جس کے لب کی ٹھہرتی نہ ہو نظر
اُس شوخ دلربا سے ہم آغوش اگر نہیں
بیکار شے ہے ایک حیات بشر نہیں

سکھدیوجی۔ من جس کو ستھ گندھے ہوئے مالا ہیں آبدار — پیتامبر کو ہے تنِ اقدس پہ افتخار
چکر اور گدا ہیں زیب دہ دستِ اقتدار — دنیا کا جس کی چار بھجاؤں پہ ہے مدار

اس ذاتِ بے نیاز کی جس کو خبر نہیں
بیکار شے ہے ایک حیاتِ بشر نہیں

رمبھا۔ جس کے لباسِ شوخ میں بجلی کی ہو چمک — آتی ہو جس سے لونگ کی، کافور کی مہک
گفتار میں حجاب ہو، رفتار میں جھجک — مستی کی جس کے حسن و جوانی میں ہو جھلک

ایسی نگارِ نازنہ اگر زیب بر نہیں
بیکار شے ہے ایک حیاتِ بشر نہیں

سکھدیوجی۔ آنکھیں کنول کے پھول کی مانند کانِ حسن — جوشن ہے جس کے بازوئے اقدس کی جانِ حسن
کانوں کے کنڈلوں نے دوبالا ہے شانِ حسن — جس کے لئے ہے فرشِ قدم آسمانِ حسن

وا اُس کی حمد میں لبِ گویا اگر نہیں
بیکار شے ہے ایک، حیاتِ بشر نہیں

رمبھا۔ دلکش بسانِ قند ہو شیرینیٔ سخن — چمپا کے گُل کی پیکرِ زریں میں ہو پھبن
ہوتا بہ نافِ پھولوں کا اک ہار زیبِ تن — ہو جس کے دل میں آگ جوانی کی شعلہ زن

پروانہ ایسی شمعٔ لگن کا اگر نہیں
بیکار شے ہے ایک۔ حیاتِ بشر نہیں

سکھدیوجی۔ ہے چشمِ دل ہیں جس کی بسری[ا] تس ضو فشاں — شاہیں کا جس کے پرچمِ اقدس میں ہے نشاں
جس کی کمان سے ہو خجل قوسِ آسماں — مقصودِ معرفت چمن آرائے دو جہاں

اُس ذاتِ بے نیاز کا طالب اگر نہیں
بیکار شے ہے ایک۔ حیاتِ بشر نہیں

[ا] ایک ہیرا جو بھگوان وشنو کے سرِ نگار کا ایک جزو ہے۔

رمبھا۔ جس کی کمر کے خم پہ مہ نو نثار ہو　　پازیب جس کی دشمن صبر و قرار ہو
بینی میں جس کی حسن دُرِ آبدار ہو　　جس کی نظر سے آہوئے صحرا شکار ہو

عشق ایسی دلربا کا جو سودائے سر نہیں
بیکار شے ہے ایک حیات بشر نہیں

سکھدیوجی۔ پروردگار، مالک کونین، باخبر　　مظہر ہیں جس کے جلوۂ اطہر کے بحر و بر
تنویر ذرّہ ذرّہ میں جس کی ہے جلوہ گر　　عالم میں جس کے عقل و خرد کا نہیں گذر

اس کا تصوّر اور عبادت اگر نہیں
بیکار شے ہے ایک۔ حیات بشر نہیں

رمبھا۔ پھولوں کے ہار سے ہو فزوں حُسن پُر نمک　　ہو عطر گُل کی جامۂ زرکار میں مہک
حُسن نقاسے گرد ہو مہتاب کی چمک　　جس کے لبوں میں پان کی سُرخی کی ہو جھلک

محرم پر اس کی رات کو قبضہ اگر نہیں
بیکار شے ہے ایک۔ حیاتِ بشر نہیں

سکھدیوجی۔ ارماں ہے دیوتاؤں کو جس پاک ذات کا　　جو باغبان ہے چمنِ کائنات کا
لٹتا ہے جس کے در سے خزانہ نجات کا　　جو کل ہے جس میں دخل نہیں کچھ صفات کا

اس کا جمالِ پاک جو پیشِ نظر نہیں
بیکار شے ہے ایک۔ حیاتِ بشر نہیں

رمبھا۔ چندن سے جس کے پیکر گلبار کو ہو زیب　　کافور و زعفراں سے بنا ہو جو لفریب
ملبوس عنبریں پہ ہو جس کے فدا شکیب　　جس کا فراز حسن نہیں واقف نشیب

پہلو میں اپنے اس کو بٹھایا اگر نہیں
بیکار شے ہے ایک۔ حیات بشر نہیں

سکھدیوجی خلّاقِ دہر، منبعِ انوار، کردگار — جس کی ہزار صورتیں ہیں، نام بے شمار
عینِ سرور، بانیٔ گلزارِ روزگار — موجود، گم، عیاں و نہاں غائب آشکار

محو اس کے دھیان میں دلِ یکسو اگر نہیں
بیکار شے ہے ایک، حیات بشر نہیں

رمبھا۔ انگڑائی آئے جس کے ظہورِ شباب پر — خم صورتِ ہلال رہے ناز سے کمر
ٹھہرے نہ جس کی ایک جگہ چشمِ فتنہ گر — پہونچے کبھی نگاہ اِدہر تو کبھی اُدہر

نظّارہ ایسی شوخ کا منظور اگر نہیں
بیکار شے ہے ایک، حیات بشر نہیں

سکھدیوجی۔ کچھ جس کی ابتدا نہ ہو لا انتہا جو ہو — جو سب میں ملا ہوا ہو سب سے جُدا جو ہو
مطلوب زہد، مقصد فقر و فنا جو ہو — ہر شے میں ہر مقام پہ جلوہ نما جو ہو

دل اس کے نورِ پاک کا مخزن اگر نہیں
بیکار شے ہے ایک حیات بشر نہیں

رمبھا۔ مونس، خلیق، مایۂ الفت وفا شعار — جس میں ہوں قسم قسم کے اوصاف بے شمار
چہرہ کنول کے پھول کی مانند پُر بہار — شیریں کلامیوں میں جو ہو فخرِ روزگار

نافہ پہ اس غزال کے مفتوں اگر نہیں
بیکار شے ہے ایک حیات بشر نہیں

سکھدیوجی۔ کچھ مرد و زن کا میل نہیں فعلِ دلپسند — دونوں کے اختلاط میں ہے صورتِ گزند
ہوتا ہے اس سے بابِ حیاتِ دوام بند — ملتا ہے اس سے جائے طرب رنج و غم دوچند

اس پر بھی محوِ شغلِ ریاضت اگر نہیں
بیکار شے ہے ایک، حیات بشر نہیں

رمبھا - گیسو ہوں جس کے صورت مارِ سیہ دراز ۔ مستی سے جس کی چشم حسیں ہو شبیہ ناز
مستانہ رو - حجاب کی تصویر عشوہ ساز ۔ در اپنا کام دیو نے جس پر کیا ہو باز

وصل اس کا ایک لمحہ بھی حاصل اگر نہیں
بیکار شے ہے ایک، حیاتِ بشر نہیں

سکھدیوجی - دیتی ہو جس کی بدنگہی دعوتِ گناہ ۔ مخفی ہو جس کے پھیر میں دار سقر کی راہ
دشمن ہو کار خیر کو اک جنبشِ نگاہ ۔ جس سے خزاں صفت ہو ریاض گدا تباہ

رہتا ہے دور بہ ایسی حسیں سے اگر نہیں
بیکار شے ہے ایک حیات بشر نہیں

رمبھا - آرائشوں سے جس کی ہو فزونی جمال ۔ فطرت سے دلکشی میں ہو جس کو ملا کمال
کوئل کی کوک سے ہو سوا جس کا حسنِ قال ۔ بیتابِ وصل عیش پسندی میں بیمثال

آغوش میں جو ایسی حسیں جلوہ گر نہیں
بیکار شے ہے ایک حیاتِ بشر نہیں

سکھدیوجی - آتش جو آبِ محویت جاوداں کو ہے ۔ اک سحر دلفریب جو پیر و جواں کو ہے
آزار ایک جو دلِ اہلِ جہاں کو ہے ۔ دشمن جو دھرم کرم کے نام و نشاں کو ہے

ایسی زنِ حقیر سے تائب اگر نہیں
بیکار شے ہے ایک ۔ حیاتِ بشر نہیں

رمبھا - رنگیں ادا وفا کا مرقع وہ خوش کلام ۔ ہو بادۂ شباب سے لبریز جس کا جام
روئے سپید صبح ہو زلفِ سیاہ شام ۔ خوشبو ہو جس کے عطر کی فرحت دہِ مشام

وہ مخزنِ جمال اگر زیب بر نہیں
بیکار شے ہے ایک، حیاتِ بشر نہیں

سکھدیوجی کانِ عیوب ۔ منبعِ آلامِ روزگار — عفتی کہ جس کے ہاتھ سے پامال ہے وقار
زلفِ دراز جس کی ہے اک ریسمانِ وار — جو کھیلتی ہے وادیٔ جذبات میں شکار

ایسی نگاہِ ناز کا بسمل اگر ہوا
بیکار اس جہاں میں وجودِ بشر ہوا

رمبھا۔ جو لطف کا خزانہ ہے راحت کی کان ہے — کنگن سے جس کے ساعدِ سیمیں کی شان ہے
جس کے خرامِ ناز کی پازیب جان ہے — گھنگرو ادائے خاص کا اک ترجمان ہے

شیریں لبوں کا اس کے جو حاصل مزہ نہیں
انسان کے وجود سے کچھ فائدہ نہیں

سکھدیوجی جس کا لقب فریبِ مجسم جہاں میں ہے — اک دشمنِ شکیب جو کون و مکاں میں ہے
حد سے سوا جو گندگی جسم و جاں میں ہے — جو ننگِ روزگار زمین و زماں میں ہے

سودا جو سر میں ایسی زنِ فتنہ گر کا ہے
بیکار ایک لمحہ بھی جینا بشر کا ہے

رمبھا۔ طالب ہو جس سے ماہِ فلک آب و تاب کا — نکھرا ہے رنگ جس کے رخِ بے نقاب کا
شاہد ہو جس کا سینہ ظہورِ شباب کا — پردہ پڑا ہو جس کی نظر پر حجاب کا

ایسی زنِ حسین سے ہم آغوش اگر نہیں
لطف آشنائے گلشنِ ہستی بشر نہیں

سکھدیوجی۔ غارت گرِ شکیب ہے جس کی نگاہِ مست — رکھے قدم کبھی نہ زمیں پر جو خود پرست
وابستہ مکر و فن سے ہیں سب جن کے بند و بست — ہاتھوں سے جس کے ساغرِ تقویٰ ہوا شکست

دل اس نگارِ شوخ پہ مائل اگر ہوا
بے فائدہ ظہورِ حیاتِ بشر ہوا

رمبھا۔ گل خار کھائے رہتے ہوں جس کے عذار سے — جس کی کمر میں لوچ ہو سینہ کے بار سے
دل کے چمن کھلائے جو اپنی بہار سے — راحت وہ بشر ہو جو حُسن شعار سے

ایسی زن حسیں سے جو آباد گھر نہیں
حاصل ذرا بھی لطفِ حیاتِ بشر نہیں

سکھدیوجی۔ گرد شباب سے ہو اگر کوئی زن کثیف — جس کا غبار نفس سے ہو پیرہن کثیف
ہر طرح سے ہو جس کا ہر اک عضوِ تن کثیف — جس کی روش ذلیل ہو جس کا چلن کثیف

اس شوخ نازنیں سے محبّت اگر ہوئی
ذلّت سے آدمی کی جہاں میں بسر ہوئی

رمبھا۔ پتلی کمر پہ جس کی ہو دھوکا کہ ہے ہلال — قدرت نے جس کو ہنس کی ماننددی ہو چال
ہر دم ہو مستِ ناز جو سرمایہ جمال — بارغ جہاں میں جس کی ادا کا بچھا ہو جال

لذّت سے اس کے وصل کی واقف اگر نہیں
آگاہ زندگی کے مزے سے بشر نہیں

سکھدیوجی۔ ہوتا ہے جس سے مائلِ دنیائے دوں بشر — بھگتی کے نخلِ تر کو جو ہے صورتِ تبر
بیدرد، راہزن، ستم ایجاد، فتنہ گر — ایسی حسین پر جو کبھی اُٹھ گئی نظر

زاہد کے دل میں خوف کچھ انجام کا نہیں
انسان وہ دو جہاں میں کسی کام کا نہیں

رمبھا۔ گلہائے عطر بار بچھے ہوں پلنگ پر — ہو شاہدِ حسیں کی طبیعت اُمنگ پر
موسم بسنت کا ہو اِدھر اپنے رنگ پر — دریا اُدھر ہو نورِ سحر کا ترنگ پر

سب ہیچ ہیں بشر میں جو شانِ بشر نہیں
قدرِ گہر خاک ہو جو آبِ گہر نہیں

سکھدیو جی

غرقاب حسن قالب خاکی ہوا تو کیا　　عورت جوان ہو جو کوئی دلرُبا تو کیا
انبار مال و زر کا اگر ہو لگا تو کیا　　گلریز ہو اگر کوئی شیریں نوا تو کیا
ہے مرگ نامُراد حیات بشر نہیں
دل مائل تصوّرِ خالق اگر نہیں

رُباعی

اُڑتے ہیں فضاؤں میں شرارے میرے　　ہیں داغ جگر یہ چاند تارے میرے
ہر کام کنایات سے لیتا ہوں میں　　تفسیر خود اپنی ہیں اشارے میرے

رُباعی

پلکیں زہر آب سے بھگو لیتا ہوں　　مُنھ خون کے آنسوؤں سے دھو لیتا ہوں
بھڑکا کرتی ہے آتشِ غم دل میں　　یہ آگ بجھانے کو میں رو لیتا ہوں

آج

پھر ہویدا ہیں صبح کے آثار	پھر نمایاں ہوا ہے روزِ کبود
اے دلِ زار کچھ تو سوچ آخر	کیا گذر جائے گا یہ دن بے سود

وقت کے دائمی تسلسل سے	ہے نمایاں یہ روز لطف آثار
اور اسی دائمی تسلسل میں	پھر یہ مل جائے گا دم شب تار

آج کا دن یہ کس نے دیکھا تھا	نہیں جب تک ہوا تھا اس کا ظہور
اور اک جنبش مژہ میں پھر	ہم سے ہو جائے گا یہ کوسوں دور

پھر نمایاں ہوا ہے روزِ کبود	ہیں نمودار صبح کے آثار
دل بصد غور دے مجھے یہ جواب	کیا گزارے گا پھر یہ دن بیکار

ترجمہ از تامس کارلائل ۱۹۱۷ء

اشکِ خوں

ملکُ الشعرا منشی دوارکا پرشاد اُفق خُلد آشیانی

پیدائش سنہ ۱۸۶۴ء وفات سنہ ۱۹۱۳ء

ماتمِ پدر

ستمبر ۱۹۱۳ء

(یعنی نازشِ خانداں و فخرِ ہندوستان ملک الشعراء منشی دوار کا پرشاد افق کا نوحہ)

چرخِ ظالم نے کیا ستم ڈھایا　　آہ کیسا یہ روزِ بد آیا
اِک اندھیرا نظر میں ہے چھایا　　اُٹھ گیا سر سے باپ کا سایا

ہم بھی داخل ہوئے یتیموں میں
آج شامل ہوئے یتیموں میں

مرگِ والد سے ہے وہ رنج والم　　بھائی[1] کا ہوگیا ہے تازہ غم
ملک میں آج ہے بپا ماتم　　اُٹھ گئے حضرتِ افق کے قدم

ہے یہی ذکر سب کے وردِ زباں
رام[1] شنکر کے غم نے لی جاں

چاک تھا فرطِ رنج سے سینا　　تھا محال ایک پل بھی اب جینا
ہوئے بے نور دیدۂ بینا　　حالتِ دل تھی سب پہ آئینا

پھٹ پڑا آسماں مصیبت کا
خاتمہ ہوگیا بصارت[2] کا

[1] یعنی منشی رام شنکر پرشاد مرحوم جو احقر منوّر کے برادرِ مکرم تھے اور دنیائے اخبار نویسی میں جن کی شہرت قابلِ رشک تھی جوانی کے عالم میں بعمر ۲۷ سال مارچ ۱۹۱۳ء میں دنیا سے ہمیشہ کے لئے کوچ کر گئے۔
[2] بھائی صاحب کے انتقال کے بعد ہی والد مرحوم کی قوتِ بینائی قریب قریب جواب دے گئی تھی۔

دیدۂ ہر عزیز ہے خونبار — ملک میں آج سب ہیں ماتم دار
غمِ فرزند میں ہوئے بیمار — جان کردی نثار آخر کار

شور ہر سو یہ کیوں نہ برپا ہو
باپ دُنیا میں ہو تو ایسا ہو

کیا تمنّاؔ کے رنج کا ہو بیاں — ہیں برادر کے غم میں اشک فشاں
ہو کے بے ہوش کہتے ہیں نیساںؔ[2] — آہ بھائی افقؔ ہو آج کہاں

چل دیا دل سے چاہنے والا
نیم جان مجھ کو آہ کر ڈالا

میری ماں کی نہ پوچھئے حالت — بن گئی ہیں مرقعِ حسرت
پہلے نورِ نظر نے کی رحلت — دیا شوہر نے پھر غمِ فرقت

کون گھر بھر کو دیکھے بھالے گا
کون بچوں کو اب سنبھالے گا

تھا وجودِ افقؔ پہ ملک کو ناز — شاعری میں دکھا دیا اعجاز
ناظم ایسا نہیں کوئی ممتاز — جس کو شاہوں سے بھی ملا اعزاز

شہسوار اشہبِ قلم کے تھے
آپ خورشید بن کے چمکے تھے

معرکہ کون تھا کیا جو نہ سر — قائل اعجاز کے تھے اہلِ ہنر
تھا کچھ ایسا ہر اک سخن میں اثر — سُن کے لگتی تھی چوٹ سی دل پر

تھا ہر اک شعر دفترِ معنی
آشکارا تھے جوہرِ معنی

---

[1] افسوس کہ جو. بر ۱۹۳۱ء میں جناب تمنّا صاحب کا سایہ ہمارے سروں سے اُٹھ گیا۔ آپ کا نام منشی رام سہائے تھا۔ نظم و نثر میں قادر الکلام تھے۔ [2] حضرت نیساںؔ تمنّا صاحب سے چھوٹے اور والد صاحب سے بڑے بھائی تھے۔ رنگین مزاج، شوقِ طبع اور نہایت خوش گو گت ع تھے۔ آپ کا انتقال جولائی ۱۹۳۷ء میں ہو گیا۔

اُٹھ گیا فخرِ شاعرانِ زمن — غل ہے کشمیر سے یہ تا بہ دکن
آج سونی پڑی ہے بزمِ سخن — لائیں ایسا کہاں سے ماہرِ فن

مٹ گیا نازِ خانداں افسوس
آئی اس باغ میں خزاں افسوس

بذلہ سنجی میں طاق، زندہ دل — شوخیٔ طبع کے تھے سب قائل
دل نہ چھوڑا کبھی دمِ مشکل — ذات یہ پوجنے کے تھی قابل

تن پہ ملبوس تھا فقیرانہ
قدرتاً تھا مزاج شاہانہ

زینت تن کی تھی نہ کچھ پروا — آہ کیسی تھی شانِ استغنا
گو تھے شیدائے ساغر و صہبا — لیکن اس کا نہ تھا کسی کو پتا

رند آزاد۔ مردِ عامل تھے
واقعی اک ولیٔ کامل تھے

تھا جو مقبولِ خاص و عام کلام — خوب حاصل کیا تھا ملک میں نام
قدرداں سخن ہوئے جو نظامؔ — بڑھ گئی اور عزت و اکرام

معترف خوبیٔ سخن نے کیا
پایہ افزوں شہِ دکن نے کیا

بادۂ شاعری سے تھے سرشار — حق نے بخشی تھی طبع دریا بار
کیا نکالا تھا آہ "نظم" اخبار — دُرِ مضموں پہ تھا عدن بھی نثار

بات تھی کب بھلا یہ شاہوں میں
عظمت فقر تھی نگاہوں میں

نظام - یعنی خسرو دکن خلد آشیانی میر محبوب علی خاں بہادر متخلص بہ آصف نظام دکن

معدنِ جوہر فصاحت تھے　　مخزنِ گوہر بلاغت تھے
مصدرِ خوبی و لیاقت تھے　　منبع جوئے علم و حکمت تھے

خاص طرزِ سخن کے بانی تھے
شاعر اک آپ خاندانی تھے

لاف گو تھے نہ کچھ سری سرکار[1]　　جن کا تھا اولیائے دین میں شمار
ایک دن تھا لگا ہوا دربار　　وا کیا آپ نے لبِ گفتار

کم سمجھنا نہ کائنات افق
داخل اولیا ہے ذاتِ افق

اس قدر تھی وسیع معلومات　　نہ تھی مخفی کوئی بھی آپ سے بات
کام شعر و سخن سے تھا دن رات　　وردِ لب تھے تمام اس کے نکات

واقفیت کی نہر جاری تھی
حفظ تاریخ ہند ساری تھی

کون مضمون تھا جو کیا نہ رقم　　گلفشاں ہر نفس تھی شانِ قلم
عرصۂ علم و فن تھا زیرِ قدم　　غلغلہ ہند سے تھا تا بہ عجم

افق علم کے ہیں مہرِ افق
شان و رفعت میں ہیں سپہرِ افق

ہو مسدس کہ مثنوی کہ غزل　　ہو ڈراما، فسانہ یا ناول
طبعِ موزوں کا جب اٹھا بادل　　فیضِ باراں سے کر دیا جل تھل

دو نہیں دس نہیں ہزار نہیں
کچھ تصانیف کا شمار نہیں

[1] یعنی وصال نصیب سری بابا تپست داس ملقب بہ سرکار سوامی جو لکھنؤ کے ایک نہایت خدا رسیدہ کامل فقیر تھے۔

ہمتیں اب مری بڑھائیگا کون　　رُخِ لطف و کرم دکھائے گا کون
رازِ شعر و سخن بتائے گا کون　　گر پڑا ہوں مجھے اُٹھائے گا کون

ناز و نعمت سے پالنے والا
کون ہے اب سنبھالنے والا

ہو منوّر کو اب عطا ہمّت　　صبر کرنے کی دے خدا طاقت
ہونے پائے نہ فرض سے غفلت　　رہے قائم جو گھر کی ہے عزّت

اور افزوں ہو احترام افق
رہے روشن ہمیشہ نام افق

ابتدائی لکھنؤ

قطعہ

اس انتشار کے دفتر کو منتشر کردے
اِدھر سے پھیر کے رُخ روح کا اُدھر کردے
ہزار سال سے بہتر وہ ایک لمحہ ہے
جو تیری یاد میں دنیا سے بے خبر کردے

ماتمِ نظر

(یعنی استاذی مکرّم نبّاضِ سخن عالی جناب منشی نوبت رائے نظر کا مرثیۂ وفات)

ہوا گُل چراغِ حیاتِ نظر — غضب کا ہے صدمہ وفاتِ نظر
سخُندانِ بے مثل، مرحُوم تھے — نہایت غنیمت تھی ذاتِ نظر
جو مقبولِ عالم ہوا ہے کلام — وہی تھی فقط کائناتِ نظر
کیا مجھ کو رازِ آشنائے سخن — ہیں منقوش دل پر نکاتِ نظر
صفی[1]، شوق[2]، چکبست[3]، محشر[4]، عزیز[5] — بیاں کر رہے ہیں صفاتِ نظر
نگم[6]، کول[7]، شرغہ[8]، شرر[9]، پریم چند[10] — یہ تھے قائلِ التفاتِ نظر
عزیز و اقارب پہ طاری ہے رنج — دعا گو ہیں بہرِ نجاتِ نظر

کیا نوش جامِ شرابِ اجل
نظر بھی سوئے محوِ خوابِ اجل

بقیہ دوسرے صفحہ پر

۱؎ صفی یعنی لسان القوم حضرت صفی لکھنوی ۳؎ چکبست ہندوستان کے واحد قومی شاعر پنڈت برج نراین چکبست مرحوم ۲؎ شوق یعنی منشی محمد علی شوق قدوائی مرحوم ۴؎ منشی کاظم حسین محشر لکھنوی ۵؎ لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی ۶؎ نگم منشی دیانراین نگم بی اے ایڈیٹر "زمانہ" کانپور ۷؎ کول یعنی پنڈت کشن پرشاد کول سابق ایڈیٹر ایڈوکیٹ ہندوستانی لکھنؤ ۸؎ شرغہ یعنی پنڈت برج ناتھ شرغہ ایم اے، ایل ایل بی وکیل لکھنؤ جن کے زیر اہتمام کسی زمانہ میں اخبار "خادم ہند" نکلتا تھا، منشی نوبت رائے مرحوم اس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے ۹؎ شرر یعنی منشی کندن لال شرر سہارنپوری ۱۰؎ پریم چند مشہور افسانہ نگار و ادیب

بنایا علالت نے تصویرِ یاس — رہی تھی کسی کو نہ جینے کی آس
ہوا سال کا سال بستر پہ ختم — مگر گردشِ بخت آئی نہ راس
نظر کی اُٹھی پھر نہ ہم پر نظر — دمِ نزع رخصت ہوئے جب حواس
سُنی جس نے مرگِ نظر کی خبر — ہوا فرطِ رنج و الم سے اُداس
مریضِ سخن کے وہ نبّاض تھے — فنِ شاعری کے تھے جوہر شناس
جہاں تیغ تنقیدلی ہاتھ میں — کیا معرکہ سر ہر اک بے ہراس
بندھی دھاک وہ حُسنِ خدمات کی — لیا ملکِ اُردو سے باج سپاس

رہے عمر بھر جاں نثارِ ادب
تھے بے مثل خدمت گزارِ ادب

جو بزمِ ادب میں ہوئے جلوہ گر — اُٹھے بہرِ تعظیم ٭ اہلِ ہُنر
نشانہ کی خوبی کی دی سب نے داد — جو چُٹکی سے نکلا خدنگ نظر[۵۱]
کبھی نظم میں اور کبھی نثر میں — قلم سے لٹائے ہزاروں گُہر
زمانہ[۵۲] تھا مدّاح خدمات کا — نظر نے چڑھایا اُسے اوج پر
زمانہ تھا رنگِ سخن پہ فدا — کلام دل افروز میں تھا اثر
کیا نام دنیائے اخبار میں — اسی میں ہوئی عمر ساری بسر
نظر آج لیکن جہاں میں نہیں — تھا درپیش ملکِ عدم کا سفر

نہیں آج ملتا جوابِ نظر
مُنوّر بھی تھا فیضیابِ نظر

---

۵۱ رسالہ "خدنگ نظر" مرحوم کی ادارت میں کئی سال تک نہایت اہتمام کے ساتھ شائع ہوتا تھا

۵۲ زمانہ یعنی رسالہ "زمانہ" کانپور

ماتمِ چکبست

بزمِ جہاں سے اُٹھے چکبست کے قدم بھی　　ڈھایا ستم خزاں نے اُردو کے بوستاں پر

ہاں وہ انیسِ دوراں پنہاں ہوا نظر سے　　ماہر جو تھا ادب کا حاوی جو تھا زباں پر

اُٹھتے تھے جس کے دل سے حبِّ وطن کے شعلے　　پانی قضا نے ڈالا اس آتشِ زباں پر

وہ اس کا حُسنِ بندش وہ خوبیٔ مضامیں　　تھا صادِ ابرِ نیساں کلکِ گہر فشاں پر

وہ اس کا قلبِ صافی وہ اس کی طبعِ عالی　　اوصافِ باطنی تھے آئینہ اک جہاں پر

اُردو کے بوستاں سے رخصت ہوئی ہے رونق　　پتھر پڑیں الٰہی بے مہری خزاں پر

باقی نہیں جہاں میں اب قوم کا سخنور　　اک داستانِ غم ہے ہر لب پہ ہر زباں پر

پرخاش اس چمن سے بادِ سموم کو تھی　　برقِ الم گرائی گردوں نے خانداں پر

جس کے نصیب میں تھی پوشاک بیوگی کی　　ہے بے ہُشی کا عالم اس زار و ناتواں پر

یہ عالمِ ضعیفی فرزند کا یہ صدمہ　　ٹوٹا سپہرِ غم ہے کیسا غریب ماں پر

چکبست سے تھی قائم توقیر ہندوؤں کی　　ڈالا ہے آسماں نے یہ بار اب رواںؔ[1] پر

اے خامۂ منوّر نوحہ گری یہ کب تک　　مائل نہ ہو زیادہ اب طولِ داستاں پر

اظہارِ غم کو ہے یہ تاریخِ سال کافی
ہے اشک ریز عالم اس مرگِ ناگہاں پر
١٣۴۴ھ

[1] رواں یعنی مسٹر جگت موہن لال رواںؔ ایم، اے، ایل، ایل، بی مُصنّف روحِ رواں جو اس وقت حیات تھے۔ کیا معلوم تھا کہ چند ہی سال کے بعد ملک کا یہ عدیم المثال سخنور بھی رہگرائے عالمِ جاودانی ہو جائے گا۔

حضرتِ برقؔ مرحوم

افتخار الشعراء منشی مہاراج بہادر برقؔ کی وفات پر

رخصت ہوئی ہے قالبِ دلّی سے روحِ شعر
جانکاہ سانحہ ہے فراقِ دوامِ برق

اب ان کی طبع شوخ کی جولانیاں کہاں
تھا آسمانِ اوجِ سخن پر قیامِ برق

اب گلشنِ ادب میں یہ کس کو دماغ ہے
تھا نکہتِ سخن سے معطّر مشامِ برق

پائیں گے بزمِ شعر میں اب اہلِ دل کہاں
وہ سحر آفرینی و لطفِ کلامِ برق

ہو خاک کیف پاشی صہبائے حسن و عشق
اب محفلِ سخن میں نہیں دورِ جامِ برق

اے سرزمینِ حالیِ مرحوم[1] آہ آہ
تو لے سپردِ خاک کیا کیوں نظامِ برق

دیکھو تو آج حلقۂ ماتم کی وسعتیں
کتنا نگاہِ خلق میں ہے احترامِ برق

تھی جادۂ سلوک کی خاموش پیروی
ہے ہر زباں پہ تذکرہ فیضِ عامِ برق

حُسنِ کلام ہے جو منوّر دلوں پہ نقش
صدیوں رہے گا عالمِ امکاں میں نامِ برق

دہلی ۔ ۱۹۳۶ء

[1] یعنی پانی پت، جہاں جناب برقؔ کے لئے دفعتاً پیغامِ اجل آ پہنچا

درگیش نندنی

بنی ہوئی جو مری بات تھی بنی نہ رہی
جہاں میں چرخ کو کب مجھ سے دشمنی نہ رہی

جو میری آنکھ کی پتلی تھی ہو گئی غائب
تھی جس کے نور سے گھر بھر میں روشنی نہ رہی

اُٹھائے گھر سے قدم لکشمی نے پھیری آنکھ
جو ہونے والی تھی دنیا میں پدمنی نہ رہی

بنا میں دلکش جہاں میں کسی ستی کے لئے
وقار میں کبھی ہوتی جو انجمنی نہ رہی

کلی حدیقۂ اُمید کی ہوئی پامال
جو عندلیب تھی محو نوازنی نہ رہی

غضب کا مجھ پہ منوّر ہی کوپ ایشور کا
کہ میری لاڈلی درگیش نندنی نہ رہی

درگیش نندنی برادر معظم منشی رام شنکر پرشاد صاحب مرحوم کی ایک لڑکی تھی، جو مجھے جان و دل سے عزیز تھی۔ عزیزہ کا انتقال یک بیک بعارضہ طاعون ۹ سال کی عمر میں بمقام اناؤ ہو گیا تھا جہاں وہ میری ہمشیرہ مرحوم کے بلانے پر گئی تھی۔

نہ کھلا غنچۂ خاطر کبھی اپنا اے صدرؔ   قابل سیر کسی دن یہ گلستاں نہ ہوا

تاریخ پیدائش ۱۸۶۸   منشی لچھمن پرشاد صدرؔ لکھنوی   تاریخ وفات ۱۹۳۲

ارتحالِ صدر

(مصنف کے خسر محترم علامہ منشی لچھمن پرشاد صدر مرحوم کی یاد میں)

کس طرح جذبۂ پنہاں ہو منوّر ظاہر

ٹیس سی دل میں اک ایذائے غمِ صدر سے ہے

فکر کیا اور کریں جب نہ ٹھکانے دل ہو

سالِ تاریخ عیاں وائے غمِ صدر سے ہے

۱۳۵۱ ہجری

ہنگامۂ کانپور

سنہ ۱۹۳۱ء

پڑا تھا سابقہ کیسے شقی ستمگر سے
کیا ہلاک بصد کید و مکر خنجر سے
یہ راہرو کا سلوک اور اپنے رہبر سے
لیا قصاص یہ کب کا گنیش شنکر سے

ہوا شہید یہ مرد جری وطن کے لئے
تھا جاں نثار وطن جان دی وطن کے لئے

پھرا ہے کس لئے سر ہندو و مسلماں کا
لگا ہے خون یہ انساں کا منھ کو انساں کا
ہوا سرشت میں اس کی جو دخل شیطاں کا
بشر کی ذات سے ظاہر ہو فعل حیواں کا

جنونِ قتل کے قبضہ میں زندگی آجائے
ہزار حیف کہ غالب درندگی آجائے

یہ کانپور کے غنڈوں کو کیا سمائی آہ
فضول بات پہ کیوں مول لی لڑائی آہ
ذرا بھی فعل پہ اپنے نہ شرم آئی آہ
پھر آج دست و گریباں ہیں بھائی بھائی آہ

کسی کو آگ سے خاک و سیاہ کر ڈالا
کسی کا خون بہا کر تباہ کر ڈالا

ذرا خیال نہیں امن و آشتی کا نہیں
کہ احترام ہی کچھ دل میں زندگی کا نہیں
کیا جو کام انہوں نے وہ آدمی کا نہیں
وہ بے لگام ہیں یہ جن پہ بس کسی کا نہیں

ادھر نظامِ حکومت تباہ کرتے ہیں
ادھر وطن پہ ستم بے پناہ کرتے ہیں

ہوئے ہیں اس لئے شاید یہ درپئے بیداد ہوا استوار تباہی کی اور بھی بنیاد
کیا فساد نہ جب بھی کوئی بنائے فساد اسی میں ان کو ہے راحت کہ ملک ہو برباد

خزاں کا ساتھ یہ دیں گے چمن رہے نہ رہے
بلا سے ان کی وقارِ وطن رہے نہ رہے

بجھائی خون سے بچّوں کے پیاس اُف رے ستم دیئے وہ زخم کہ بیکار جن میں ہیں مرہم
کسی کے پاؤں بریدہ کسی کا سر ہے قلم کسی کے قطع ہیں بازو کسی کا چاک شکم

ردائے حرمتِ نسواں کی دھجیاں کر دیں
تہیں زمین کی چھاتی کے خون سے بھر دیں

یہ لوٹ آہ کہ ڈاکو بھی جس سے لرزاں ہیں یہ ظلم ہوش ہلاکو کے جس سے پراں ہیں
جو گھر میں چین سے بیٹھے ہوئے تھے حیراں ہیں حزیں ہیں، زار ہیں، مغموم ہیں، پریشاں ہیں

کسی عزیز کی رحلت پہ رو رہا ہے کوئی
فراقِ دوست میں جان اپنی کھو رہا ہے کوئی

کسی کا مال کا اڑایا کسی کو لوٹ لیا گلا کسی کا دبایا، کسی کا خون پیا
زمیں کھود کے زندہ کسی کو دفن کیا کسی کو دوزخِ آتش فشاں میں جھونک دیا

سپرد کر دیا لاشہ کسی کا دریا کو
کیا گناہ میں شامل غریب گنگا کو

ہے یوں تو سب کی تباہی سے رنج بے پایاں مگر ہے موت سے ودیارتھی کی دل لرزاں
بُری طرح سے ہوا قتل یہ عزیز جواں ادا یہ خوب کیا اس کا ملک نے احساں

بچایا موت سے جس کو اسی نے مار دیا
بچانے والے کو خنجر کے گھاٹ اتار دیا

یہ خبط، یہ خفقان، یہ کمینہ پن، یہ جنون — نئے سرے سے چھڑا پھر فساد کا مضمون
فنا نہ ہوں گے کبھی کیا عناصر ملعون — دیارِ متّحدہ میں یہ اتحاد کا خون

یہ مدعائے نہانی ہے چیرہ دستوں کا
ہو خاتمہ کسی عنوان وطن پرستوں کا

ہے اس قدر غم ودیارتھی کا دل پہ اثر — کسی نے زخم میں گویا چبھو دیا نشتر
پیامِ حضرتِ گاندھی سے کچھ سکوں ہے مگر — ہے ناز قوم کو مرحوم کی شہادت پر

یہ خون زخم دل غمزدہ کو بھر دیگا
یہ خون ہندو و مسلم کو ایک کر دیگا

دہلی۔

"(نوٹ) کانپور میں اس بلوہ کے بعد جس میں فخر وطن پنڈت گنیش شنکر ودیارتھی فنا فی القوم ہوئے ۱۹۳۹ء میں ایک مرتبہ پھر بربریت اور درندگی کا مظاہرہ ہوا، آئے دن کے خون خرابہ نے اب مصنّف کی نظر میں ان واقعات کی اہمیت بھی کم کر دی ہے۔ یہ روز کا رونا ہوگیا۔ کہاں تک رویا جائے اس پر بھی ہندو مسلمانوں کی آنکھیں نہیں کھلتیں اور دونوں پہلے کے مقابلہ میں اب اور زیادہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے ہیں۔ خدا ہمیں عقل سلیم عطا کرے اور ہم نیک و بد میں امتیاز کر سکیں۔

ماتمِ رونق

(ممتاز الشعراء منشی پیارے لال صاحب رونق دہلوی کی وفات پر)

آگیا فرق، بہارِ سخن دلّی میں پھول مرجھائے ہوئے ہیں چمنِ دلّی میں
ذکر ہے مجمع اربابِ فن دلّی میں خاکِ رونق نہیں اب انجمنِ دلّی میں

ہو گیا لطفِ بقا خواب و خیال آخر کار
اُٹھ گیا رنگ دہِ نقش کمال* آخر کار

شررؔ[۱] افسردہ، طپاں برقؔ[۲] منور غمگیں غوثؔ[۳] رنجیدہ مدنؔ[۴] و فضلؔ[۵] زار حزیں
چشم نم ساحرؔ[۶] و معجزؔ[۷] سے بھی ہیں اہلِ یقیں گفتنی حال دل کیفیؔ[۸] و شیداؔ[۹] کا نہیں

کیوں عزادار نہوں بیخودؔ[۱۰] و سائلؔ[۱۱] دونوں
دل سے تھے رونق مرحوم کے قائل دونوں

پاس تھا نقد سخن، طبع رسا پائی تھی فیض استاد سے جاگیر یہ ہاتھ آئی تھی
باعث راحت دل زمزمہ پیرائی تھی مدتوں گلشنِ راسخؔ[۱۲] کی ہوا کھائی تھی

داد دی اہلِ کمالات کی مرتے مرتے
کیوں نہ پھر لوگ مشاہیر میں شامل کرتے

[۱] مسٹر راج بہادر شرر دہلوی [۲] منشی مہراج بہادر برق مرحوم [۳] نواب غوث محمد صاحب غوث دہلوی شاعر بھرتپور [۴] حکیم مدن لال صاحب مدن دہلوی [۵] فخر دہلی علامہ پنڈت امرناتھ ساحر مدن دہلوی [۶] پنڈت دینا ناتھ صاحب معجز بی اے مرحوم جن کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوگیا آپ مخدومی حضرت ساحر کے چھوٹے بھائی تھے اور کئی قابل قدر کتابوں کے مصنف تھے [۷] منشی چندر بھان صاحب کیفی دہلوی [۸] منشی چندی پرشاد شیدا دہلوی [۹] وحید العصر جناب حید الدین صاحب بیخود دہلوی جانشین حضرت داغ مرحوم [۱۱] جناب راسخ حضرت رونق کے استاد مکرم تھے

* کمال سے اشارہ رسالہ کمال کی طرف ہے جو کسی زمانہ میں مرحوم کے زیر ادارت دہلی سے شائع ہوتا تھا۔

[۱۰] ابو المعظم نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی

چوٹ کھایا ہوا[1] دل سختی اُفتاد سے تھا شعلہ افروز جگر گرمیٔ فریاد سے تھا
شکوۂ جورِ سپہر ستم ایجاد سے تھا سینہ صد چاک غمِ فرقتِ داماد سے تھا

دل پروانہ کو تھی کلفت خاموشیٔ شمع
لے گیا سوئے عدم شوق ہم آغوشیٔ شمع

وجہ تسکین دروں پھر بھی تھی صہبائے سخن دل بدستور رہا انجمن آرائے سخن
تھا ضیا بخشِ نظر جلوۂ رعنائے سخن دم رونق سے رہی رونق دنیائے سخن

ضبط سے کام لیا خوئے تحمّل نہ گئی
کسی عنواں روش صبر و توکّل نہ گئی

اس مسافر نے بڑھائی تھی وطن کی رونق دُرفشانی سے تھی دلّی میں عدن کی رونق
کلکِ گُل ریز سے پیدا تھی چمن کی رونق آہ رونق نہیں اب بزمِ سخن کی رونق

وجہ خاطر شکنی روز کی بیماری تھی
کوچ کرنے کی کئی ماہ سے تیاّری تھی

آہ وہ مرد جری کے سخن یاس انگیز آخری عمر میں وہ زندگیِ حسرت خیز
ہو گیا نشّہ صہبائے اجل اتنا تیز کام آیا نہ ذرا ساغرِ وحدت سے پرہیز

چل دیئے سوئے عدم چھوڑ کے ناشاد ہمیں
آئے گی حضرتِ رونق کی بہت یاد ہمیں

[1] حضرت رونق کی وفات سے پہلے ان کے داماد کا انتقال ہو چکا تھا۔

مولٰنا محمد علیؒ کا ماتم

شاہ و گدا کسی کی بھی اس سے چلی نہیں جب آگئی یہ سر پہ بلا پھر ٹلی نہیں
آگے اجل کے دال کسی کی گلی نہیں دارِ فنا میں آج محمد علیؒ نہیں

دھوکا حیات وادیٔ غربت میں دے گئی
خاکِ وطن سے دُور قضا کھینچ لے گئی

تھی کس کو آگہی یہ بھلا تھی کسے خبر تھا آخری مُسافرِ ہستی کا یہ سفر
مرحوم کے فراق میں عالم ہے نوحہ گر گویا پہاڑ ٹوٹ پڑا اہلِ ہند پر

غفلت سے قوم جاگ اُٹھی جب وہ سو گیا
خاموش آہ ضیغمِ اسلام ہو گیا

پہلو میں اپنے قلبِ مصفّا لئے ہوئے سر میں عروجِ قوم کا سودا لیے ہوئے
آزادیٔ وطن کی تمنّا لئے ہوئے پیغامِ اتّحاد کا پرچا لئے ہوئے

دنیا سے اپنے ہاتھ اُٹھائے چلا گیا
سوئے عدم قدم کو بڑھائے چلا گیا

دل کو خوشی سے خوگرِ رنج و محن کیا یعنی کبھی نہ شکوۂ چرخِ کہن کیا
سرمایۂ شباب سپردِ وطن کیا شاداب اپنے خون سے اپنا چمن کیا

سختی سہی نہیں کہ اُٹھائی کڑی نہیں
وہ کون تھی جو اس پہ مصیبت پڑی نہیں

(چکبست)

برسوں اسیر پنجۂ جور و ستم رہا — ہنگامِ امتحاں نہ کسی سے بھی کم رہا
جب تک بدن میں جان رہی دم میں دم رہا — اہلِ وطن کی حلقہ بگوشی کا غم رہا

تقریر گول میز کی الہام ہو گئی
مردِ جری کو موت کا پیغام ہو گئی

کرنا پڑی اخیر میں قربانیِ اصول — انگلینڈ کے سفر کی طوالت ہوئی فضول
بربادیٔ وطن سے تھا دل اس قدر ملول — راہِ وفا میں شوق سے مرنا کیا قبول

دھڑکن ہوئی جو بند بدن سرد پڑ گیا
بیٹھے بٹھائے گلشنِ ہستی اُجڑ گیا

اک حشر سا ہے عالمِ اسلام میں بپا — از غرب تا بہ شرق بچھی ہے صفِ عزا
اپنے تو اپنے غیر بھی ہیں مائلِ بُکا — گم ہو گیا ہے قافلہ سالارِ قوم کا

اب تک تھا جس میں جوشِ جوانی نہیں رہا
"ہمدرد" و "کامریڈ" کا بانی نہیں رہا

لرزاں تھی جس کے نام سے دنیا وہ چل بسا — احرار میں شمار تھا جس کا وہ چل بسا
ارفع تھا جس کا ملک میں پایا وہ چل بسا — جو صدر کانگرس کا کبھی تھا وہ چل بسا

کیا جانے کیوں وہ قوم کا اب ہمنوا نہ تھا
گو ہم سے ہو گیا وہ جدا پر جدا نہ تھا

سینہ میں اس کے عشق کا سوز و گداز تھا — کعبہ کی سمت خم سرِ عجز و نیاز تھا
مردِ خدا تھا شاعرِ جدت طراز تھا — شوکت[1] علی کو قوتِ بازو پہ ناز تھا

دستِ قضا نے آ کے جگر چاک کر دیا
بھائی کے غم کی آگ نے دل خاک کر دیا

[1] مشہور خادم اسلام مولانا شوکت علی۔ افسوس کہ مولانائے محترم بھی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔

بھائی بھی کون، عشق تھا اسلام سے جسے　　اک قدرتی لگاؤ تھا اس نام سے جسے
مطلب صلہ سے تھا نہ کچھ انعام سے جسے　　رہتی تھی آس کوششِ ناکام سے جسے

دنیا میں تھا محبّ وطن خاص شان کا
فرزندِ بے نظیر تھا ہندوستان کا

خدمت سے ملک و قوم کی رغبت رہی جسے　　اس پھیر میں مدام مصیبت رہی جسے
آزادیٔ وطن سے محبّت رہی جسے　　محکومیت کے نام سے نفرت رہی جسے

پیچھے کبھی نہ بڑھ کے ہٹا نام کر گیا
دل پر رہے گا نقش جو وہ کام کر گیا

تاباں جہاں میں نام محمدؐ علی کا ہے　　ہر دل میں احترام محمدؐ علی کا ہے
مقبولِ خلق کام محمدؐ علی کا ہے　　فردوس میں مقام محمدؐ علی کا ہے

اب دامنِ رسولؐ کا سایا نصیب ہو
مرحوم کو نجات خدایا نصیب ہو

بعد فنا مزارِ ہمایوں جہاں بنے　　رفعت میں رشک کرسیِ ہفت آسماں بنے
گم گشتۂ وطن کو وطن کا نشاں بنے　　سنگِ لحد پہ نقشۂ ہندوستاں بنے

ہے شانِ یادگارِ محمدؐ علی یہی
حُبّ وطن کی دے گا ہمیں روشنی یہی

دہلی

آہ موتی لال نہرو

اُٹھ گیا ہندوستاں کا مردِ میداں آہ آہ
اب کہاں اس شان کا پیدا ہے انساں آہ آہ

مادرِ ہندوستاں کی کیسے چھاتی پھٹ نہ جائے
چھن گیا آغوش سے فرزندِ ذی شاں آہ آہ

آج موتی لال نہرو بزمِ عالم میں نہیں
ہو گیا شیرازۂ ہستی پریشاں آہ آہ

رخ سے تھا جس کے عیاں بھیشم پتامہ کا جلال
ہو گیا وہ قوم کی آنکھوں سے پنہاں آہ آہ

خاک اُڑتی ہے زمیں پر چرخ ہے محوِ سکوت
ہو رہے ہیں چار سُو ماتم کے ساماں آہ آہ

جب ضرورت ملک کو تھی سخت اسکی چل بسا
بچّہ بچّہ ہند کا ہے آج گریاں آہ آہ

اس کے ماتم میں ہمیشہ جان اپنی کھوئیں گے
آج کیا روتے ہیں اس کو عمر بھر ہم روئیں گے

دہلی - ۶؍۲؍۱۹۳۱ء

مرگِ تمنّا

(عمِّ گرامی نادر الشعرا منشی رام سہائے صاحب تمنّاؔ کی وفات حسرت آیات پر)

زندگی دے گئی دھوکا آخر ہے تماشا یہ تماشا آخر
جان دی ہم نے بہت دُنیا پر کیا مِلا اس کا نتیجا آخر
خواہ کتنا بھی ہو پانی اِس میں سُوکھ جاتا ہے یہ دریا آخر
نامور عمِّ گرامی پایہ چل دیئے چھوڑ کے دُنیا آخر
کرشن بھگتی میں تھے یکتا اوّل کرشن بھگتی میں تھے یکتا آخر
پریم تھا رام سے تھے رام سہائے بن گئی آپ کی عقبےٰ آخر
خانداں میں نہیں اب کوئی بزرگ کیوں نہ غمگیں ہوں اعزّا آخر
جان لیوا ہوا فالج کا مرض ہوئے خامش لب گویا آخر
نہ ہوا ان سے نہ انگیز ہوا رحلتِ خویشؔ کا صدما آخر
اب کہاں شعر وسخن کے چرچے ہوگیا خاتمہ اس کا آخر
کیوں رقم میں نہ کروں سالِ وفات یہ بھی اک فرض ہے میرا آخر
فکر کی جب توسنِ بکرم سے سالِ غم ہوگیا پیدا آخر

مادۂ سن کے ہے فق روئے اجل
ہوگیا خونِ تمنّا آخر
۱۹۸۹ بکرم

لہ یعنی منشی مہاراج نراین مرحوم

آہ حضرتِ قیصر

(منوّرؔ غمزدہ کے شفیق ماموں مسٹر جگدمبا پرشاد قیصرؔ لکھنوی کا سفرِ آخری)

مری زباں سے اس کا بیاں نہیں ممکن
مری نظر میں جو تھا احترام قیصر کا

ادب گزار ہیں ان کا تھا ایک دنیا سا
زباں پہ لاؤں میں کس طرح نام قیصر کا

قضا نے بادۂ ہستی سے کر دیا محروم
شکست ہو گیا آخر کو جام قیصر کا

سلوک ان کے نگاہوں میں آج پھرتے ہیں
خیال آئے نہ کیوں صبح و شام قیصر کا

ہوئی ہے روح، ریاضِ وجود سے رخصت
ہے آج باغِ عدم میں قیام قیصر کا

جہاں سے نقش کبھی ان کا مٹ نہیں سکتا
کہ یادگار ہے ایک ایک کام قیصر کا

جو آگ اس سے لگی ہے وہ بجھ نہیں سکتی
رہے گا داغ دلوں میں مدام قیصر کا

رکھیں گے یاد انہیں سب عزیز دوست بزرگ
تھا مثلِ بحرِ رواں فیضِ عام قیصر کا

ہر ایک بات سے زندہ دلی کا تھا اظہار
شگفتگی میں چمن تھا کلام قیصر کا

مرے بزرگ مرے دل کے بادشاہ تھے وہ
رہا میں دل سے ہمیشہ غلام قیصر کا

سرِ الم سے منوّرؔ رقم ہے سالِ وفات
کہ غم فزا ہے فراقِ دوام قیصر کا

سمت ۱۹۹۳ مطابق سنہ ۱۹۳۷ء

دہلی سنہ ۱۹۳۷ء

جناب منور لکھنوی کی تصنیف یعنی

بھگوت گیتا منظوم موسوم بہ نسیم عرفان

اکابران ملک کی رائیں

نسیم عرفاں ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث جناب منور لکھنوی کا یہ کارنامہ عظیم کارساز مطلق کی رحمت بے پایاں سے تمام ہندوستان کے طول و عرض میں مقبول ہوا ہے اسکی پسندیدگی کا یہ حال ہے کہ اب اسکی بہت تھوڑی جلدیں باقی رہ گئی ہیں مگر

صوبہ جات متحدہ۔ صوبہ مدراس اور ریاست میسور کی

ٹکسٹ بک کمیٹیوں نے نسیم عرفاں کو خاص طور پر پسند فرمایا اور صوبہ متحدہ کی لائبریریوں کے لئے تو اسکی کئی سو کاپیاں بہم پہنچائی گئی ہیں۔

دیکھئے دوسرے اس کے متعلق کیا کہتے ہیں اور پھر آپ بھی اسے اپنے مطالعہ کا مستحق قرار دیجئے

قیمت ═══ دو روپیہ (عـ)

علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

رگھوبیر پرشاد سکسینہ ببلی خانہ دہلی

دفتر زمانہ کانپور، میسرز سنت سنگھ اینڈ سنز لاہور، نولکشور پریس لکھنؤ

آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو فرماتے ہیں۔

نسیم عرفاں یعنی بھگوت گیتا منظوم مترجمہ منشی بشیشور پرشاد صاحب منور لکھنوی ایک قابل قدر کتاب ہے اس مقدس کتاب کے ترجمہ کیواسطے نہ صرف زباندانی کی ضرورت ہے بلکہ ادراک اور عمیق نظر کی زیادہ ضرورت ہے منشی بشیشور پرشاد صاحب نے صرف اپنی زباندانی ہی کا ثبوت نہیں دیا ہے بلکہ اپنی قوت ادراک کا بھی بہت کافی ثبوت دیا ہے میں امید کرتا ہوں کہ اس ترجمہ کی کافی قدر دنیائے ادب میں ہوگی اور قوم ان کی خدمت تسلیم کرے گی۔

آنریبل ڈاکٹر سر سلیمان جج فیڈرل کورٹ کا ارشاد ہے۔

آپ نے مجھے بھگوت گیتا کے ترجمہ کی ایک جلد ارسال فرمائی ہے۔ اسکے لئے بہت بہت شکریہ۔ آپنے اصل مفہوم کو نہایت اعلیٰ پایہ کی شاعری کے سانچہ میں ڈھالا ہے اور اسے اردو داں پبلک کیلئے سہل الحصول بنادیا ہے۔ میں آپ کی اس تصنیف کی کامیابی کیلئے دعاگو ہوں۔ (ترجمہ)

سر صاحب جی مہاراج آنجہانی دیال باغ۔ آگرہ۔

مجھے یہ معلوم کرکے خوشی حاصل ہوتی ہے کہ آپنے ان تراجم کی تعداد میں ایک اور قابل قدر اضافہ کیا ہے کم سے کم جو کچھ میں آپکے ترجمہ کے متعلق کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ ترجمہ سلیس ہے واضح ہے اور بالعموم اصل کے مطابق ہے۔ اس مقدس صحیفہ کے سلسلے میں آپنے اپنے اس ترجمہ کے ذریعہ جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اسپر میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے آپکی اس یادآوری کے لئے ممنون ہوں۔ (ترجمہ)

علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی بی اے دہلوی۔

نسیم عرفاں کو ایک سرا ایک کوہ نور پاتا ہوں۔ منور صاحب یہی نہیں کہ ایک بڑے باپ کے بیٹے اور بڑے استاد کے شاگرد ہیں بلکہ وہ آج بڑے شاعروں کی ذیل میں جگہ رکھتے ہیں اس پایہ کا شاعر ہو اور موضوع ہو بھگوت گیتا پھر کیوں اس کی ہر جنبش قلم نسیم عرفاں کے جھونکے آج کل کی مادی دنیا میں نہ پہونچائے

میں نے پیش نظر ترجمہ کو جستہ جستہ دیکھا نفس معنی یہ اصل سے مطابق اور خوبی بیان میں حسن ادا کی جان پایا

بیان کی سلاست بندش کی چستی اسلوب کی تازگی وزن آویزی اور مشکل پسندی سے اجتناب میں یہ کتاب ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

شہرہ آفاق فلاسفر اور ادیب ڈاکٹر بھگوان داس صاحب۔ بنارس

بھگوت گیتا کے بیسیوں زبانوں میں صدہا ترجمے ہوتے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں یہ کتاب الٰہی ایسی ہی پاک پرمعنی پراثر ہر موقع پر دماغ کو مدد دینے والی۔ ہر مصیبت میں دل کو مضبوط اور ہر روحانی سوال کو حل کرنے والی ہر ملک زمانہ اور طبیعت کے لئے موزوں اور مفید ہے کہ اس پر جتنی بھی محنت کی جائے مناسب ہے۔ چنانچہ منشی بشیشور پرشاد صاحب منور نے بھی اس کا ایک ترجمہ اردو اشعار میں کیا ہے۔ آپ نے تشریح گیتا ترجمہ کیا ہے یعنی اصل کے ایک شلوک کا اوسطاً چار اشعار میں مطلب کو خوبی سے ادا کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی شاعری کا لطف بھی عمدہ طور پر اس میں شامل کیا ہے۔ چیز قابل تعریف تیار ہوئی ہے امید ہے کہ اسکی قدر اردو دانوں میں بہت اور دور دور تک ہوگی۔

رائے بہادر سیتارام بی اے مرحوم ڈپٹی کلکٹر الہ آباد

ترجمہ نہایت اعلیٰ معلوم ہوتا ہے۔

کرنل سر کیلاش نرائن ہاکسر

میں خادم صرف اس شاعر کا ہو سکتا ہوں جس کی زبان کیف میں یہ تاثیر ہو کہ رمز ازلی پر شعاع پڑے اور جادوگری کائنات کا عقدہ حل ہو سکے۔ علیٰ ہذا میری چشم عیب جو میں قابل عظمت وہی مترجم قلوب قرار پا سکتا ہے جسکو قادر مطلق نے جذبات پنہاں کی ترجمانی کی قوت عطا فرمائی ہو۔

نسیم عرفاں اول تو اس وجہ سے کہ کلام متبرک کا ترجمہ ہے اور اصل سے نزدیک ہے یونہی مقبول و دلآویز ہے مگر جب دو پہلوؤں سے اس پر نظر ڈالتا ہوں تو نوراً علیٰ نور از حد قابل توقیر پاتا ہوں۔

اول۔ تعبیر فلسفہ سے۔ عیاں راچہ بیاں۔

دوئم رنگینیٔ کلام۔ زبردست الفاظ۔ نزاکت قوافی۔ علیٰ ہذا عیاں راچہ بیاں۔

جس بحر کو آپ نے ترجیح دی وہ زمانہ ہوا مقبول عام ہو چکی ہے اب یہ قدرت حاصلہ کا کرشمہ ہے کہ اسی بحر میں آپ

ایسے مضامین و مطالب نظم کر گئے جن کا برجستہ نثر میں بھی ادا کرنا دشوار ہے۔ گو مجھے یہ کہنے کا منصب نہیں ہے مگر میرا خیال ہے کہ آپنے نسیم عرفاں اردو دانوں کے پیش نظر کر کے ان کو اپنا مرہون منت بنایا ہے۔

پروفیسر امرناتھ جھا (حال وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی) نے ارقام فرمایا ہے۔

آپ نے نسیم عرفاں کی ایک جلد بھیجکر مجھپر جو عنایت کی ہے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں آپکی اس عظیم الشان جگر کاوی اور آپکی قابل تعریف زباندانی کا مداح ہوں۔ آپنے اردو زبان کے مطالعہ کرنیوالوں کے حق میں ایک قرار واقعی خدمت انجام دی ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپکا ترجمہ غیر ہندو اصحاب بھی مطالعہ فرمائیں گے۔ گیتا کا شمار دنیا کے عظیم الشان مذہبی صحائف میں ہے۔ (ترجمہ)

مسٹر سچدانند سنہا بیرسٹرایٹ لا وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ۔

مجھے آپکے والد محترم کی خدمتمیں ذاتی طور پر نیاز مند ہونے کا اس زمانہ میں شرف حاصل تھا جب وہ لاہور میں قیام فرماتے۔ اسی لئے میں قدرتاً یہ دیکھکر خوش ہوں کہ آپنے خود کو ایک لائق باپ کا لائق بیٹا ثابت کیا ہے۔ آپنے مجھے اپنی کتاب کی ایک جلد بھیجی اس کے لئے مشکور ہوں۔ میں نے اسے نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھا (ترجمہ)

مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب فرماتے ہیں۔

خط پہنچا بے شک مجھے ندامت ہے کہ آپکی بے مثل کتاب پر ابتک ریویو نہ لکھ سکا اب بہت جلد منادی میں لکھوں گا۔

سر گوکل چند نارنگ ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹرایٹ لا۔ سابق وزیر تعلیم پنجاب لاہور۔

مجھے یہ کہتے سے خوشی حاصل ہوتی ہے کہ ترجمہ حرف بحرف مطابق با اصل ہے اور اعلیٰ سلیس نظم کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے اور وہ بھی اس بحر میں جو اردو شاعری کے پڑھنے والوں میں مقبول ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپکی یہ کوشش بھگوت گیتا کے ان تمام دلدادگان میں مقبول و مستحسن قرار دی جائے گی جو اصل نسخہ سے مستفید نہیں ہو سکتے ہیں۔ (ترجمہ)

مسٹر آصف علی بیرسٹرایٹ لا۔ ایم ایل اے سنٹرل دہلی۔

کسی زمانہ میں جب وقت اور فرصت دونوں میسر تھے میں نے گیتا کو بڑے شوق اور غور سے پڑھا۔ رامانج کی تفسیر بھی دیکھی اور گیتا رہسیہ بھی دیکھی اور فیضی کا فارسی ترجمہ بھی نظر سے گذرا۔ اور میں ہمیشہ سے یہ محسوس کرتا تھا کہ سلیس اردو میں اس کا ترجمہ ہونا چاہئے۔ آپنے اس کمی کو پورا کردیا جس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ نظم کی رعایت سے جو کاوش کرنی پڑی ہوگی اس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جسے یہ مشکل پیش آئی ہو آپ کی محنت اور جانکاہی ٹھکانے لگی مجھے امید ہے کہ نسیم عرفاں کو مقبولیت حاصل ہوگی۔

پروفیسر کے۔ سی رائے سکسینہ عثمانیہ یونیورسٹی۔ ایڈیٹر کالستھ ہیرالڈ دکن کے محبت نامہ کا خلاصہ یہ ہے

اس سے پرانے تعلقات کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ آپکے والد محترم ایک کامل فن شاعر تھے اور یہ حیرت انگیز فن آپکو ترکہ میں حاصل ہوا ہے۔ لائق باپ کے لائق بیٹے بہت کم ہوا کرتے ہیں۔ جو تصنیف آپنے پیش کی ہے وہ یقیناً قابل ستائش ہے۔ ترجمہ

مسٹر کدارناتھ خورشید جرنلسٹ لاہور

نسیم کی بحر میں یہ لاجواب تصنیف ہے اور سچ تو یہ ہے کہ مثنوی گلزار نسیم سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ ایک ایک شعر جواہرات سے تولنے کے قابل ہے۔ کہاں گیتا جیسی دقیق پیچیدہ اور ٹھوس کتاب تقریباً سب شلوکوں کا ترجمہ اس خوبی سے ہوا ہے کہ نفس مطلب میں فرق آنے نہیں پایا۔ یہاں پر جس نے بھی دیکھی اس نے تعریف کی۔ سید امتیاز علی تاج تو دیکھکر اس درجہ فریفتہ ہوئے کہ انہوں نے اسی وقت آرڈر دیدیا۔

رہنمائے تعلیم از قلم حضرت جوش ملسیانی۔

مقام مسرت ہے کہ جناب منور لکھنوی نے مشہور عالم کتاب بھگوت کا ایک اور منظوم ترجمہ اردو زبان میں تصنیف فرماکر دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا ہے۔ نسیم عرفاں اسی منظوم ترجمہ کا نام ہے اسکی کتابت وطباعت میں اہتمام بلیغ سے کام لیا گیا ہے اس کا ہر ایک صفحہ حسن ظاہر کی خوبیوں کے لحاظ سے نہایت روشن اور دیدہ زیب ہے۔ منور صاحب نے اپنے والد مرحوم کی خوش بیانی اور ترزبانی میراث میں حاصل کی ہے ان کے شستہ مذاق۔ ان کے ذوق سلیم ان کے وجدان صحیح اور ان کی سلجھی ہوئی طبیعت سے ایسی ہی خوش گوئی کی توقع ہوسکتی تھی جیسی کہ نسیم عرفاں کے صفحات میں نظر آتی ہے اصل مفہوم کو نہایت واضح صورت میں بیان کردینے کیلئے مصنف کی جگر کا دی اور

قوت بیانیہ کس قدر کامیاب مدعا واقع ہوئی ہے۔

اخبار لیڈر الہ آباد۔ لکھنؤ کے منشی بشیشور پرشاد منور اس شہر کے مشہور و معروف شاعر منشی دوارکا پرشاد افق کے فرزند اور منشی نوبت رائے نظر کے شاگرد ہیں آپنے اردو میں بھگوت گیتا کا ترجمہ فرمایا ہے اور نہایت موزوں طور پر اس کا نام نسیم عرفان رکھا ہے۔ پیش لفظ میں ہمیں ڈاکٹر بھگوانداس اور پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کے نوٹ نظر آتے ہیں اور یہ مسٹر منور کی تصنیف کی عمدگی کی دلیل ہے کہ اسکی تعریف و ستائش ایسے دو ممتاز عالموں اور تنقید نگاروں نے فرمائی ہے۔ ڈاکٹر بھگوانداس کے بمقابلہ اور کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جس نے مشرقی فلسفہ کو سمجھا ہے اور اسکی تشریح کی ہے اور پنڈت کیفی کا شمار پنجاب کے ممتاز اردو ادیبوں میں ہے ان حضرات نے منور صاحب کے ترجمہ گیتا پر مہر قبول ثبت کی ہے اور یہ ایک ایسا امر ہے جسپر مترجم کو بجا طور پر فخر ہو سکتا ہے۔ نظم کا موضوع پیچیدہ اور دشوار ہے لیکن عام طور پر مسٹر منور کا اسلوب آسان اور سلیس ہے۔ ہم ایک بند ذیل میں درج کرتے ہیں جس میں آواگون (تناسخ) کا اہم اصول بیان کیا گیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ مسٹر منور کی اس کوشش کا اعتراف تمام دلدادگان اردو۔ ہندو اور غیر ہندو کریں گے کیونکہ گیتا کی تعلیم لافانی حقائق پر مشتمل ہے جن کا کسی خاص مسلک اور فرقہ سے تعلق نہیں ہے۔ (ترجمہ)

ماڈرن ریویو کلکتہ۔ یہ اردو نظم میں شری بھگوت گیتا کا ترجمہ ہے۔ ہر سنسکرت اشلوک کا ۴ یا پانچ اشعار میں ترجمہ کیا گیا ہے مصنف نے پنڈت دیا شنکر نسیم کی لافانی مثنوی گلزار نسیم کا انداز اختیار کیا ہے منور صاحب نے ان اشلوکوں کے مطالب کو اردو میں کامیابی اور روانی کے ساتھ بیان کیا ہے اور ہمیں وہ کامیاب ہوئے ہیں جس کیلئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کتاب میں ایک مقدمہ ڈاکٹر بھگوانداس نے تحریر فرمایا ہے اور ایک تبصرہ علامہ کیفی کا شامل ہے۔

اخبار کرم ویر لاہور۔ اردو زبان کے مشہور شاعر منور لکھنوی نے .... زبان اردو کی شہرۂ آفاق مثنوی گلزار نسیم کی بحر میں بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ .. کیا ہے .... حقیقت یہ ہے کہ ترجمہ .. خوب کیا ہے .... زبان کی روانی اور نظم کے جملہ اوصاف کے علاوہ نفس مضمون کو جس خوبی سے نباہا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

منشی شام موہن لال صاحب جگر بریلوی فرماتے ہیں۔

واقعی جو کارنمایاں اردو ادب میں آپنے انجام دیا ہے اسکی داد نہیں دیجا سکتی۔ پروردگار سے دعا ہے کہ یہ سعی مشکور ہو اور یہ صحیفہ مقبول۔

منشی پریم چند مرحوم - نسیم عرفاں کی تنقید مئی کے رسالہ ہستی میں کر دی گئی ہے رسالہ کی ایک جلد بھیج رہا ہوں۔

مسٹر گور سرن لال ادیب ایم اے لکھنوی - گیتا چند روز قبل موصول ہوئی تھی جس قدر مطالب لطیف ہیں اسی قدر زبان پاکیزہ ہے اور طباعت بھی اس قدر دیدہ زیب ہے دعائے حقیقی ہے کہ اسکی اشاعت حوصلہ افزا ہو تاکہ دامن ادب میں ایسے ہی کسی اور گوہر نایاب کا اضافہ ہو۔

مسٹر گنگا دھر ناتھ فرحت بی اے ایل ایل بی وکیل کانپور بلاخوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ یوں تو گیتا کے متعدد ترجمے ہوئے ہیں لیکن آپ کا ترجمہ بہترین ہے۔

جناب نواب جعفر علیخاں اثر ڈپٹی کلکٹر یوپی لکھنؤ - ذرا اطمینان ہو تو نسیم عرفاں کو بالاستیعاب پڑھوں۔ بعدازاں تبصرہ لکھنے کی کوشش کروں۔

اخبار ریاست دہلی.... بھگوت گیتا کے تراجم اور بھی ہو چکے ہیں لیکن اس ترجمہ کی قابل تعریف خصوصیت یہ ہے کہ شاعر نے غیر ضروری اختصار سے کام لینے کے بجائے وضاحت معانی کا زیادہ خیال رکھا ہے۔ کلام بحیثیت مجموعی اغلاط فن سے پاک ہے اور اسمیں جوش بھی ہے اور اثر بھی۔ ترجمہ کے کامیاب ہونے میں شبہ نہیں۔

وحدت دہلی - اس ترجمہ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انداز بیان کی سلاست اور اسلوب کی دلاویزی کے ساتھ ہی گیتا کے اصل مفہوم کو بھی قائم رکھا گیا ہے زبان نہایت صاف اور طرز ادا دلچسپ ہے۔ منور صاحب نے یہ سلیس ترجمہ شائع فرماکر یقیناً ایک قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔

اخبار خبردار دہلی - ایسے دقیق اور پرمعنی سنسکرت کے اشلوکوں کو یوں تو بیسیوں نے لکھا بلکہ درجنوں علما نے اپنے اپنے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے عیاں اور بیاں کیا ہے اور تفسیر بھی شائع کی ہیں لیکن جس سادگی اور عام فہم زبان میں نسیم عرفاں منظوم کیگئی ہے۔ ہمارا خیال ہے اتنی کم ضخامت میں دوسرا نسخہ موجود نہیں ہے۔

وطن دہلی - جس ترجمہ پر اس وقت تبصرہ مقصود ہے وہ منور صاحب لکھنوی کی شب بیداریوں اور دلاویزیوں

کا نتیجہ ہے ترجمہ کے لئے حیرت و مسرت ہے کہ منور صاحب نے نسیم عرفاں جیسا نازک اور جامع المعانی نام تجویز کر کے اپنی نظری ادب نوازی لطافت سنجی اور نکتہ رسی کا ثبوت دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ منور کے اس شاہکار میں منور کی قابلیت اور صلاحیت فکر ہی کو تنہا دخل نہیں بلکہ

مری طلب بھی انہیں کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

کرشن جی سے منور کی محبت و عقیدت کو بھی بڑا دخل ہے۔ علم دوست حضرات ہی نہیں بلکہ وہ تمام صاحبان جو ادبی ذوق کے علاوہ کرشن اعظم کی روحانیات کا چھلکتا جام منہ سے لگانا چاہتے ہوں۔ نسیم عرفاں کا مطالعہ کریں۔

اخبار تیج دہلی جو لوگ اردو شاعری سے مس رکھتے ہیں انمیں سے بیشتر مصنف نسیم عرفاں سے واقف ہیں۔ منور صاحب ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد صاحب افق کے صاحبزادے اور منشی نوبت رائے نظر کے شاگرد رشید ہیں اس لئے ان کی زبان میں سلاست اور روانی بندشوں میں چستی اور ادائے مطالب میں بے تکلفی ایک متوقع چیز ہے لیکن حسن بندش ترجمہ کی صورت میں اور زیادہ دشوار امر ہے۔ اول تو ایک زبان کے محاورے دوسری زبان سے مختلف ہوتے ہیں دوسری سنسکرت جیسی زبان سے اردو ترجمہ کرنا اور بھی مشکل ہے کیونکہ اردو ابھی تک فلسفیانہ اصلاحات کی اچھی طرح متحمل نہیں ہو سکتی۔ مصنف نے اس دشواری پر بھی عبور پایا ہے ہر جگہ زبان میں روانی کے ساتھ ساتھ اصل اسپرٹ موجود ہے اتنی چھوٹی بحر میں دقیق سے دقیق خیالات کا ادا کرنا کارے دارد تاہم میدان سخن میں مصنف کی یہ خود اعتمادی تھی کہ اس نے اس بحر کو گیتا کے ترجمے کے لئے منتخب کیا اور بالآخر اس میں کامیاب ہوا۔

یہ کتاب ادب اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہے جو لوگ ہندو مذہب سے تعلق نہ بھی رکھتے ہوں ان کے لئے بھی اس کا مطالعہ بحیثیت ایک ادبی کارنامہ کے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

شاہکار لاہور - بھگوت گیتا کا اس سے بہتر منظوم ترجمہ غالباً [illegible] قابل ہے کہ اس کی قدر کی جائے۔